دینی موضوعات پر نشری تقاریر

جلد دوم

مولانا محمد متین ہاشمی

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

طبع اول ۱۹۹۱ء

ناشر ناظمِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۔کلب روڈ، لاہور

مطبع کمبائن پرنٹرز، لاہور

قیمت ۱۰۰/- روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

The lest look 19-3-98

مقدّمہ

راقم الحروف کی ریڈیو پاکستان سے نشر ہونے والی تقریروں کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں اس سے قبل شائع ہو چکا ہے۔ "روشنی" کے نام سے اس مجموعے کی یہ دوسری جلد پیش خدمت ہے۔ ناظرین نے پہلی جلد کو بہت پسند کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک اس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تیسرا شائع ہو رہا ہے۔ میں ریڈیو پاکستان کا انتہائی شکرگزار ہوں کہ اس نے تقریروں کے اس مجموعے کی اشاعت کی اجازت دے کر عوام کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اس مجموعے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ سب مستند حوالوں سے اخذ کیے گئے ہیں اور انہیں انتہائی کوشش سے سبق آموز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گا کہ اسلام کی تاریخ کیسے کارناموں سے مرصّع و مزیّن ہے اور ہمارے اسلاف و اکابر نے کتنا پاکیزہ نمونۂ عمل اخلاف کے لیے چھوڑا ہے۔ کاش ہم غیروں کی تقلید سے منہ موڑ کر اپنے قومی اور ملّی اثاثوں کا جائزہ لیتے اور ان کے چراغوں سے اپنے ظلمت کدوں کو روشن کرتے۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں حافظ محمد سعد اللہ کا جنہوں نے اس مجموعے کی ترتیب و تبویب میں میری مدد کی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کا جس نے اس کی اشاعت کا انتظام کیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس خدمت کو قبول فرمائے، اسے میرے لیے توشۂ آخرت بنائے اور معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

سید محمد متین ہاشمی
ڈائریکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
لاہور۔

۲۰-اپریل ۱۹۹۱ء

فہرست مضامین

1659

باب ۱

توحید باری تعالیٰ

توحیدِ خالص

مصر کے گورنر ایک دن بازار سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے ایک بہت بڑا جلوس دیکھا۔ جلوس ایک خوبصورت بچی کو بیش قیمت زیورات پہنائے ہوئے، نعرے لگاتا گزر رہا تھا گورنر نے پوچھا یہ کیسا جلوس ہے۔ لوگوں نے بتایا یہ مصر کے غیر مسلم کسانوں کا جلوس ہے۔ یہ لوگ ہر سال ایک خوبصورت اور آراستہ بچی کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھاتے ہیں، تب اس میں پانی آتا ہے جس سے یہ اپنے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ اگر دریا میں بچی کو نہ ڈبویا جائے تو پانی نہیں آتا اور کھیت سیراب نہیں ہوتے۔ گورنر عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ تو ظلم ہے اور ایک معصوم جان کو ہلاک کرنا ہے، لہٰذا ان لوگوں کو روک دیا جائے۔ غیر مسلم کسان فریاد کرنے لگے کہ امیر! قحط پڑ جائے گا اور ہم لوگ تباہ ہو جائیں گے نیل کی دیوی جب تک بھینٹ نہیں لیتی اس کے پانی میں طغیانی نہیں آتی۔ گورنر نے کہا کہ تم لوگ انتظار کرو اور اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ فوراً حضرت علم ابن ساریہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ روانہ کیا اور تمام حالات لکھ کر خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت ایک خط دریائے نیل کے نام لکھا کہ تیری پیدائش اس قسم کی ہے کہ کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا اگر تو اپنے اختیار و مرضی سے جاری ہوتا ہے تو ہمیں تیرے جاری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، بند پڑا رہ۔ اور اگر تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے تو جس طرح جاری ہوا کرتا ہے اسی طرح جاری ہو جا۔ والسلام! خلیفہ نے یہ خط حضرت علم ابن ساریہؓ کو دے کر روانہ کیا اور حکم دیا کہ میرا یہ خط دریائے نیل میں ڈال دیا جائے۔ اس وقت تک دریائے نیل جاری نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے جاری ہونے کی مدت بھی ختم ہو چکی تھی کسان قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔

ہر کس و ناکس کی نظریں بیتابانہ دریا کی طرف اٹھتی تھیں اور مایوس لوٹ آتی تھیں اتنے میں جناب علم ابن ساریہؓ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا نامۂ مبارک لے کر مصر پہنچ گئے۔ گورنر حضرت عمرؓ ابن العاصؓ خلیفہ کا خط لے کر نیل کے کنارے پہنچے اور وہ خط دریا میں ڈال دیا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ علم ابن ساریہؓ کا بیان ہے کہ خدا کی قسم! ابھی پوری طرح صبح بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نیل ایک بحر ذخار کی صورت موجیں مارتا ہوا دکھائی دینے لگا، اور اس حد سے بھی زیادہ آگے بڑھ گیا جہاں تک ہمیشہ چڑھتا تھا۔ کھیت سیراب ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے میں شادابی چھا گئی۔ اس کے بعد پھر کبھی نیل کا پانی کم نہ ہوا، نہ قحط کی شکل پیدا ہوئی۔ بھلا نیل کی کیا مجال کہ اللہ کے فرماں برداروں کی حکم عدولی کرے! جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔

جلوۂ ایمانِ مستحکم اگر ہو بے نقاب
تیرے دروازے پہ جھک جائے جبینِ آفتاب

توکّل علی اللہ

شیخ الاسلام بابا فرید الدین گنج شکرؒ راوی ہیں کہ ایک شہر میں اللہ کے ولی رہتے تھے۔ ایک دن صبح کے وقت ایک مرید ان سے ملنے آیا۔ کچھ عرض معروض کے بعد اس نے کہا کہ حضرت میں فلاں شہر جا رہا ہوں، آپ سے الوداعی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ بزرگ نے دریافت کیا تم اپنا شہر چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو۔ یہاں تمہارا اپنا گھر ہے، والدین ہیں، بال بچے ہیں پھر اس مسافرت کی وجہ کیا ہے! اس نے کہا حضرت تلاشِ معاش میں جا رہا ہوں۔ بزرگ نے فرمایا اچھا تو پھر میرا بھی ایک کام کر دینا۔ پوچھا کیا کام؟ فرمایا اُس شہر کے خدا کو میرا سلام کہنا۔ مرید حیران ہو گیا۔ حضرت! آپ کیا فرما رہے ہیں، کیا ہر شہر کا خدا دوسرا ہوتا ہے؟ بزرگ نے فرمایا کہ

بے وقوف جب تو اتنا جانتا ہے کہ جو خدا اس شہر میں ہے وہی اس شہر میں بھی ہے۔
روزی دینے والا حیات وموت اور مرض وشفا کا مالک ہے۔ جو روزی تیرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے وہ مل کر رہے گی اور جتنی مقدر میں نہیں، وہ کسی طور پر بھی تجھے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور ہاتھی سے لے کر شتر مرغ تک کو روزی بہم پہنچاتا ہے۔ چڑیاں صبح کو بھوکے پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتی ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس اپنے گھونسلوں میں آتی ہیں۔ رزاقِ مطلق یہ گوارا نہیں کرتا کہ طلبِ معاش کرنے والے کو ناامید و نامراد کرے۔ وہ ربِّ ذوالجلال والاکرام جو دو پتھروں کے بیچ میں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے کیڑے کی بھی ضروریات سے غافل نہیں ہے اور اس کو بھی اس کے ٹھکانے میں روزی پہنچاتا ہے، کیا اپنے محبوب کریم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی کو فراموش کر دے گا! ہوس نہ کرو، دِل جمعی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی فکر میں مشغول ہو۔ روزی طلب کرنا تمہارا کام ہے طلب کرتے وقت محنت مشقّت سے جی نہ چُراؤ۔ اللہ تعالیٰ کسی محنت کرنے والے کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ البتہ اگر کوئی یہ چاہے کہ بغیر محنت کے وہ اللہ کی نعمتیں حاصل کر لے گا تو وہ نادان ہے۔ راست بازی، صدق شعاری، خوفِ خدا یہ وہ چیزیں ہیں جن سے روزی بڑھتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ جو بندہ تقویٰ اختیار کرے گا ہر مشکل میں پھنسنے کے بعد اس مشکل سے نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور بالضرور پیدا کر دے گا اور ایسے ذرائع سے اسے روزی پہنچائے گا کہ اس کے تصوّر میں بھی نہیں ہوگا۔ میرے بیٹے! یاد رکھ کہ ساری دنیا وعدہ خلافی کرے تو کرے اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ اصل میں تیرا ایمان کمزور ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اتنے کچھ ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کے بعد بھی تو ابھی تک اس مقام پر فائز نہیں ہو سکا ہے جس پر فائز ہونے کے بعد انسان کی نگاہ میں ہیرا اور پتھر، مٹی کا ڈھیلا اور سونے کا ٹکڑا ایک جیسا لگنے لگتا ہے۔
اے دنیا کے جال میں پھنسے رہنے والے! تو نے ابھی تک حسنِ ازل کا مشاہدہ

نہیں کیا ہے اس لیے تیری آنکھیں بے نور ہیں، قلب بے سکون ہے اور تو خواہشات کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ بیش و کم کی فکر سے نجات حاصل کر اور لا کی تیغِ آبدار سے ماسوا کی نفی کر دے تب تو حقیقت کا چہرہ دیکھنے لگے گا۔

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

بزرگ کی یہ باتیں سن کر ایسا لگا جیسے مرید کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ یقین کی عظیم دولت سینے میں سمیٹے گھر واپس چلا آیا۔

اللہ کا بندے سے پیار

جنگ کے خاتمے کے بعد کے واقعات سناتے ہوئے صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عجیب دل گداز واقعہ سنایا۔

عرض کیا۔ حضور! جب جنگ ختم ہو گئی تو ہم لوگوں نے بہت سارے کفار کو قیدی بنا لیا۔ بے حرمتی کے خیال سے ہم نے ایک خیمے میں عورتوں کو ٹھہرایا اور مرد قیدیوں کو کھلے میدان میں رکھا۔ رواج کے مطابق ہم نے قیدیوں کے ہاتھ باندھ دیے۔ دھوپ شدید تھی اور صحرا تپ رہا تھا۔ خیمے میں ایک عورت تھی۔ اس کا بیٹا بھی قیدیوں میں تھا۔ خیمے سے عورت کی نگاہ جب اپنے بیٹے پر پڑی تو وہ بے اختیار، دیوانہ وار اپنے بیٹے کی طرف دوڑی۔ لڑکے کے پاس پہنچ کر اس نے اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا اور چلچلاتی دھوپ سے اپنے لختِ جگر کو محفوظ کرنے کے لیے اس نے اپنا سایہ اپنے بچے پر یوں ڈالا کہ بچے کے لیے سائبان بن گئی۔ اب ساری دھوپ ماں کی پشت پر پڑ رہی تھی اور اس کے سائے میں بچہ بیٹھا تھا۔

عورت نے لوگوں کو دیکھ کر کہا لوگو! یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں بیشک دھوپ میں جلوں، مجھے منظور ہے مگر میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ میرا بیٹا دھوپ میں رہے۔ ماں کی مامتا اور اس کی بے پناہ محبت کو دیکھ کر ہم لوگ اس قدر متاثر اور حیران ہوئے کہ بے اختیارانہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ نے جب یہ واقعہ سرکارِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سنایا تو صحابہؓ کے متاثر ہونے پر آپ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا، لوگو! کیا تمہیں اس ماں کی مامتا پر حیرت ہوئی؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں! یا رسول اللہ صلّی اللہ علیک!

آپ نے ارشاد فرمایا، لوگو! وہ عورت جس قدر اپنے بیٹے پر رحیم ہے اور اسے پیار کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ تمہارا رب تم پر رحیم ہے اور تم سے پیار کرتا ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد گرامی سن کر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے درمیان مسرت و شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ روایت میں ہے کہ صحابہ کرامؓ کو ایسی خوشی اس سے قبل کبھی بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اور خوشی کیوں نہ ہوتی، آج بندے اور مولا کا باہمی رشتہ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔

توکّل علی اللہ کی حقیقت

وکیل کے معنی سرپرست کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا وکیل اور سرپرست ہے بشرطیکہ مسلمان آنکھ بند کر کے اسے اپنا وکیل بنا لے۔ صرف اسی پر اعتماد کرے۔ زندگی کے تاریک سے تاریک لمحات میں بھی اگر اس کی نگاہ اٹھے تو صرف اپنے مولا کی طرف مدد کے لیے پکارے تو صرف اسی کو پکارے۔ دستِ دعا دراز کرے تو صرف اس کی بارگاہ سے کرے۔ سر جھکائے تو صرف اسی کے آگے جھکائے۔ پھر یہ یقین رکھے کہ وہ میرا خالق و مالک ہے میرے لیے وہ جو کچھ کرے گا میری بہتری ہی کے لیئے کرے گا۔ لہٰذا وہ جس حال میں رکھے،

بندہ مومن اس پر راضی رہتا ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ترمذی شریف میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اگر اللہ تعالیٰ پر ٹھیک سے توکل کرو تو وہ تمہیں ضرور روزی دے گا جیسے کہ وہ ان چڑیوں کو روزی دیتا ہے جو بھوکے پیٹ صبح کو روزی کی تلاش میں اپنے گھونسلوں سے روانہ ہوتی ہیں اور جب شام کو واپس ہوتی ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ اس کے لئے فیصلہ کرے اُس سے راضی رہے اور اسی پر قناعت کرے۔ اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی نہ مانگے اور اس کے فیصلے اور حکم پر ناراض رہے۔ ایک آدمی نے سوال کیا:

یا رسول اللہ صلی اللہ علیک یہ تو بتائیں کہ میں اپنی اونٹنی کو باندھوں اور اللہ پر توکل کروں یا اسے چھوڑ دوں اور اللہ پر توکل کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پہلے اسے باندھو پھر توکل کرو!

یعنی کسی چیز کو حاصل کرنے کی جو ضروری تدبیر ہے وہ اختیار کرو اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔

بعض لوگ غلطی سے توکل کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ اسباب کو ترک کر دیا جائے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کے چپکے بیٹھے رہا جائے۔ توکل کا یہ مفہوم ہرگز اسلامی نہیں ہے۔ اسلام تو حرکت اور عمل کا دین ہے یعنی اسباب سارے اختیار کیے جائیں، تمام تدابیر بروئے کار لائی جائیں پھر نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہو اور جو نتیجہ سامنے آئے اسے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ سمجھ کر انسان اس پر راضی ہو جائے۔ اسی میں کامیابی اور دل کے اطمینان کا راز مضمر ہے۔

کوئی انسان چاہے کتنا ہی طاقت ور ہو تقدیر الٰہی سے نہیں لڑ سکتا۔ لہٰذا تقدیر الٰہی پر راضی ہو جانا ہی سب سے بڑا سامانِ سکون ہے۔

عظمتِ کعبہ

جب یمن کا حکمران ابرہتہ الاشرم ہاتھیوں کا لشکر لے کر خلیل اللہ علیہ السلام کی تعمیرِ کعبہ کو ڈھانے کی نیت سے مکہ معظمہ کے قریب پہنچنے لگا تو اہلِ مکہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ابرہتہ الاشرم نے جب یہ دیکھا کہ یمن سے ہزاروں لوگ کعبہ کا حج کرنے جاتے ہیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں تو اس بیوقوف نے یہ سوچا کہ کیوں نہ ایک کعبہ میں خود یمن میں تیار کر دوں۔ کعبہ تو معمولی پتھروں سے بنا ہے میں سنگِ مرمر اور سونے چاندی کے کام سے ایک کعبہ تیار کروں اور اہلِ یمن سے کہوں کہ اب کعبہ جانے کی ضرورت نہیں ہے، کعبہ تو تمہارے شہر میں خود ہی بن گیا ہے! اس کا طواف کیا کرو۔ تو ایک حجازی عرب نے اس کے بنائے کعبہ میں رات کو قیام کیا اور اسے پلید کر کے صبح کو فرار ہو گیا۔ اس غصے میں انتقاماً اس نے فیصلہ کیا کہ ہاتھیوں کا ایک لشکرِ جرّار تیار کرے اور العیاذ باللہ! کعبہ کو ڈھا دے۔ اس بے وقوف نے یہ نہ سوچا کہ کعبہ پتھروں کی وجہ سے محترم نہیں بلکہ ان ہاتھوں کی وجہ سے محترم ہے جنہوں نے حکم خداوندی کے تحت اسے تعمیر کیا تھا اور اسے شعائر اللہ اور قبلہ بنایا تھا۔ ابرہتہ الاشرم اتنے بڑے لشکر کے ساتھ جب مکہ کے نواحی علاقوں میں پہنچ گیا تو اہلِ مکہ نے پریشانی کے عالم میں سردارِ مکہ حضرت عبدالمطلب کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ سب اہلِ مکہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے جائیں اور فیصلۂ خداوندی کا انتظار کریں۔ وادی میں حضرت عبدالمطلب کے اونٹ چر رہے تھے۔ ابرہتہ کے لشکریوں نے ان اونٹوں کو پکڑ لیا۔ عبدالمطلب کو معلوم ہوا تو ابرہہ کے پاس آئے ابرہہ نے خیال کیا کہ شاید وادی کے سردار مجھے حملے سے روکنے اور معافی مانگنے آئے ہیں۔ متکبرانہ انداز میں اس نے تخت پر جلوس کیا اور حضرت عبدالمطلب کو خیمے کے اندر بلایا۔ پوچھا آپ کیسے تشریف لائے کیا

کہنا چاہتے ہیں۔ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کہ تیرے لشکری میرے اونٹ پکڑ لائے ہیں، انہیں واپس لینے آیا ہوں، ابرہہ حیران ہوا۔ اس نے کہا: آپ تو مکے کے سردار ہیں، میں امید کرتا تھا کہ آپ مجھ سے کعبہ پر حملہ نہ کرنے کی درخواست کریں گے۔ آپ نے امید کے خلاف مجھ سے صرف اپنے اونٹوں کا مطالبہ کیا۔ بڑی افسوس ناک بات ہے۔ عبدالمطلب نے نہایت لاپروائی سے جواب دیا، بادشاہ! اونٹ میرے تھے میں انہیں لینے چلا آیا، کعبہ خدا کا ہے۔ خدا اپنے گھر کی حفاظت کرنا جانتا ہے۔ خدا نے اپنے گھر کی کس طرح حفاظت کی، اس کا تذکرہ قرآن کی سورہ فیل میں موجود ہے کہ کمزور ابابیلوں کے ذریعے اس نے لشکرِ جرّار کو نیست و نابود کر ڈالا۔ مسلمان اگر کعبہ کے پاسبان ہیں تو کعبہ بھی ان کا پاسبان ہے۔

باب ۲

سیرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

شانِ رحمۃ للعالمین

ذات الرقاع سے اسلامی لشکر واپس آرہا تھا کہ دھوپ سخت ہوگئی اور ریگستان گرم ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ نے پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کیا اور مختلف درختوں کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ غورث بن حارث ادھر سے گزرا۔ کفر و عناد کا لاوا اس کے سینے میں دہک رہا تھا۔ اس نے ماحول پر نگاہ ڈالی اور محسوس کیا صحابہ کرامؓ کے پڑاؤ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ موقع غنیمت جانا اور تلوار سونت کر آپ کے قریب پہنچ گیا۔ قاتل اپنے مکروہ ارادوں کے ساتھ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا توں توں اللہ تعالیٰ کی حفاظت نبیؐ کو متنبہ کر رہی تھی۔ آپ بیدار ہو گئے۔ غورث نے للکارا "بتاؤ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آج تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔" انسان کتنا بڑا جاہل اور کم ظرف ہے۔ غورث کے ہاتھ میں صرف لوہے کا ایک دھار دار ٹکڑا آگیا تھا اور وہ طاقت کے نشے میں چُور ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ وہ کس کو للکار رہا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ دوسری طرف مکمل اطمینان تھا کیونکہ حفاظتِ الٰہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن میں سمیٹ چکی تھی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا "اللہ!" اس لفظ میں نہ جانے کونسی ایسی برقِ تپاں چھپی ہوئی تھی کہ غورث کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھا لی اور فرمایا اب تو بتا کہ تجھے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا ہے۔ غورث کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ اس نے بہت سے معرکے سر کیے تھے مختلف قبائلی لڑائیوں میں حصہ لیا تھا مگر آج تک اس کا سابقہ کسی ایسے شخص سے نہیں پڑا تھا جس کی زبانِ مبارک سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اسے اس طرح خوف زدہ کر دے۔ اب بچنے کا

کوئی راستہ نہ تھا۔ صرف ایک وار اس کے چراغِ حیات کو گُل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ جس سے مخاطب ہے، وہ عفو و درگزر کا پیکر، علم و حلم کا مجسمہ اور رحم و کرم کا نمونۂ کمال ہے۔ اس نے جھٹ کہا آپ بہت بڑے معاف کرنے والے ہیں اتنا سننا تھا کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت رحمۃ للعالمینی جوش میں آگئی تلوار پھینک دی اور فرمایا جا! میں نے تجھے معاف کیا۔ لیکن اب بیچارہ غورث جاتا تو کہاں جاتا شکار کرنے آیا تھا خود ہی شکار ہو گیا اور ایک نظر میں دل و جگر، فکر و نظر سب کچھ ہار بیٹھا۔ اب وہ غورث نہ تھا جو تلوار لے کر قتل کرنے آیا تھا اب غورث کا سینہ ایمان کے انوار سے منوّر تھا اور زبان پر کلمۂ توحید جاری۔ قبیلے میں پہنچا تو لوگوں سے کہا لوگو! میں اس وقت تمہارے پاس سب سے بہتر انسان کے یہاں سے آ رہا ہوں۔

حضورؐ کا انقلابی پیغام

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل ساری دنیا پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چادرِ شرافت پارہ پارہ اور قبائے انسانیت تار تار تھی۔ کمزور اقوام اور طبقات کا کوئی بھی والی و وارث اور حامی و ناصر نہ تھا۔ مظلوم صدیوں سے مظلوم تھے اور جابر و ظالم عرصۂ دراز سے پسے ہوئے طبقات کو پیس رہے تھے۔ انسانیت رنگ و نسل، ذات پات اور اونچ نیچ کے خانوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ انسان اس لیے معزز نہیں تھا کہ اس کا عمل شریفانہ اور کردار ہمدردانہ تھا، بلکہ اس لیے معزز تھا کہ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا اور اونچی نسل سے تعلق رکھنے والا تھا اسے یہ حق حاصل تھا کہ کمزور کی آبرو لوٹ لے، اس کی محنت سے تیار کی ہوئی فصل کو کھیت سے کٹوا لے۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کھڑا تکتا رہتا یا کبھی نمناک آنکھوں سے آسمان کو گھورتا۔ سب سے بُرا حال غلاموں اور عورتوں کا تھا، نہ ان کی جان کی

کوئی قیمت تھی نہ آبرو کی ۔ بالکل ڈھور ڈنگروں کی طرح ان کی خرید فروخت ہوتی اور ان کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا۔ اونچی ذات کے لوگوں کو ہر قسم کی آزادی اور ہر بات کی اجازت تھی۔ انسانی پیشانی جو شرف و عزت کی پیشانی ہے پتھروں، دریاؤں اور درختوں کے سامنے سجدہ ریز تھی ۔ اس عالمِ آب و گل میں سوائے خدا کے سب کی پرستش ہو رہی تھی۔ کائنات پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا کہیں داد فریاد نہ تھی۔ نہ مظلوموں کو آہ و فغاں کرنے کی اجازت تھی کہ فاران کی چوٹی سے ایک آواز بلند ہوئی یہ آواز نہیں تھی یہ بجلی کا کڑکا تھا یا پیغامِ انقلاب جو پیغمبرِ انقلاب کی زبانِ مبارک سے بلند ہو رہا تھا۔ لوگو! کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس دنیا کی بستی میں سوائے اللہ کے کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بُتانِ آزری

اور جب خدا ایک ہے اور اس کا رسول ایک ہے تو ساری انسانیت ایک ہے۔ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا کوئی گورا ہے نہ کالا کوئی عربی ہے نہ عجمی۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ تمہارے درمیان اگر کسی کو فضیلت اور برتری ہے تو اس لئے نہیں کہ تم کسی خاص خاندان سے رنگ و نسل سے یا علاقے سے تعلق رکھتے ہو۔ انسان کی برتری تقویٰ کی بنیاد پر ہے جو زیادہ متقی ہے وہ اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا ہے ۔ اس پیغام نے انسانیت کی پیشانی کو خدائے برتر کی بارگاہ میں جھکا دیا اور تمام بتوں کی معبودیت سے انکار کا سبق پڑھایا ۔ رنگ و نسل علاقہ اور ملک کی تمام تفریقوں کو مٹا کر ساری انسانیت کو جسدِ واحد بنا دیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری اعلان فرمایا: مسلمان کی جان مسلمان کے لئے مسلمان کا مال مسلمان کے لئے آبرو مسلمان کے لئے اتنی ہی عزت والی ہے جتنا حرمِ مکہ یومِ

عرفہ اور شہر حرام ۔ میرے بعد کافر مت ہو جانا کہ مسلمان ہو کہ اپنے مسلمان بھائی کا گلا کاٹنے لگو!

حضورؐ اور ایک یتیم

بشیر ابن عقربہ جہنیؓ کا بیان ہے کہ میں غزوۂ احد کی وہ شام فراموش نہیں کر سکتا جو بیک وقت میری بدنصیبی اور خوش نصیبی کی شام تھی۔ احد کے دامن میں سارے میدان پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شہیدوں کی نمازِ جنازہ ادا کی جا چکی تھی۔ اکثر شہداء دفن کئے جا چکے تھے اور بعض شہداء کی لاشیں ان کے وارث مدینہ لے جا رہے تھے۔ کوئی بین نہیں ہو رہا تھا نہ چیخ پکار تھی صرف دبی دبی سسکیاں اور رندھی ہوئی آہیں تھیں۔

سید الکونین خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹان پر تشریف فرما تھے۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا یہی کوئی دس بارہ سال کا۔ میں سپاہیوں کے چہرے غور سے دیکھتا کہ کہیں ان میں کوئی میرا باپ تو نہیں ہے۔ مگر میری نگاہیں مایوس ہو کر لوٹ آتیں میرے باپ گھر سے چلے تھے جہاد کے لئے مگر اس ساری بھیڑ میں وہ کہیں نظر نہ آئے۔ پھرتا پھراتا میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گیا۔

سلام عرض کیا حضور صلی اللہ وسلم نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے عرض کیا حضور آپ پر صلوٰۃ وسلام ہو میرے باپ کا کیا حال ہے یعنی عقربہ جہنی کا؟ آپؐ کی نگاہیں جھک گئیں فرمایا بیٹے! وہ تو شہید ہو گئے۔ ان پر خدا کی رحمت ہو۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا کیا میں یتیم ہو گیا؟

کیا میرا مستقبل تاریک ہو گیا؟ میرا باپ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا؟ اب پہاڑ جیسی میری زندگی کیسے گزرے گی؟ کون میرے سر پہ ہاتھ رکھے گا؟ کون

مجھے سہارا دے گا؟ یہ خیال آنا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا اور میں زار و قطار رونے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حالت دیکھی تو اٹھ کھڑے ہوئے میرے قریب تشریف لائے اور مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میرے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر مجھے پکڑ کر اپنے ساتھ سواری پر بٹھایا اور فرمایا! بشیر! کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے کہ آج سے میں تیرا باپ ہو جاؤں اور عائشہ تری ماں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں یکدم اندھیرے سے اجالے میں آ گیا۔ میرا تاریک مستقبل روشن نظر آنے لگا۔ میں نے باپ کھو دیا مگر اللہ نے مجھے ایسا باپ عطا فرما دیا جس کی نظیر اوّلین و آخرین میں نہیں مل سکتی۔ لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ اس اعتبار سے کہ احد کی شام باپ کھو کر میں بد نصیب تھا تو غلط نہ ہوگا، اور اسی شام کو اتنا بڑا باپ پا کر میں خوش نصیب بہترین انسان بن گیا تو بھی غلط نہ ہوگا، نور و ظلمت اور خزاں و بہار کا یہ عجیب اجتماع تھا جو غزوۂ احد کی شام کو دیکھنے میں آیا۔

حُرمتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم

اس نے گستاخی ہی ایسی کی تھی کہ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اس پر برہم ہونا بالکل بجا تھا۔ خلیفۂ وقت کے سامنے بد زبانی اور الزام تراشی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بہتان لگانا تو اسلام میں عظیم ترین گناہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال نامے تولے جائیں گے تو اگر بہتان کو ترازو کے ایک پلڑے میں اور ساتوں آسمانوں کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو بہتان والا پلڑا سات آسمانوں سے بھی زیادہ بھاری ہوگا۔ بہتان کہتے ہیں کسی پر جھوٹ موٹ، بے جانے بوجھے الزام لگانے کو۔ ایک تو جھوٹا الزام اور اس پر غضب یہ کہ انبیاء علیہم السلام

کے بعد سب سے افضل انسان حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر الزام تراشی!
حضرت صدیق اکبرؓ برہم تھے، اور اس بہتان لگانے والے کو تنبیہ فرما رہے تھے
کہ ایک صحابی سے برداشت نہ ہو سکا، خلیفہ سے کہا:
حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں اس گستاخ کا سر قلم کر دوں۔
جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر کے بعد فرمایا نہیں،
جو ضروری تنبیہ تھی، وہ میں نے کر دی ہے۔ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بہتان لگانے والے سے فرمایا کہ
اب تم جاؤ اور آئندہ اس حرکت سے پرہیز کرنا۔ جب وہ شخص چلا گیا
تو آپؓ نے اس صحابی سے دریافت فرمایا "یہ تو بتاؤ کہ اگر واقعی میں تم کو حکم دے
دیتا تو کیا تم سچ مچ اس شخص کا سر قلم کر دیتے؟" صحابی نے کہا "ضرور۔ اس نے
آپ کی شان میں گستاخی کی تھی۔ آپ صدیق اکبر۔ آپ سب سے پہلے اسلام
قبول کرنے والے۔ آپ خلیفۃ الرسول۔ بھلا ایسے شخص کی شان میں کوئی گستاخی کرنے
کے بعد کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟" جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"نہیں۔ اچھی طرح جان لو کہ یہ درجہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
حاصل ہے کہ ان کی شان میں گستاخی کرنے والے کو قتل کر دینا چاہیے۔ آپ
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں۔ آپ خطا اور گناہ سے
معصوم تھے۔ آپ کی حرمت و وقار کی حفاظت کرنا اُمتِ مُسلمہ کا فرض ہے۔
خود اللہ تعالیٰ آپ کی حرمت کا محافظ ہے۔

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلّٰی

لوگ جناب صالح کو صاحب المصلّٰی کہا کرتے تھے۔ ایک دن کسی شخص نے
جناب صالح سے پوچھا یہ تو بتائیں کہ آپ کو صاحب المصلّٰی کیوں کہتے ہیں۔

صالح مسکرانے لگے۔ کہا تم نے یہ سوال کر کے مجھے ماضی کی ایک بھولی بسری داستان یاد دلا دی۔ اللہ جس کو چاہے نواز دے۔ قصّہ اصل میں یہ ہے کہ ایک دن منصور نے عبداللہ ابن علی کی شکست کے بعد ان کے خزانے پر قبضہ کر لیا اور اس نے مجھے اور میرے بہت سے ساتھیوں کو، جن میں خرس اور شبیب جیسے سردار تھے طلب کیا اور کہا کہ چونکہ تم لوگوں نے امیر عبداللہ ابن علی سے لڑائی میں میرے ساتھ مکمل تعاون کیا ہے، اس لئے میں یہ سارے کا سارا خزانہ تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ اپنی اپنی پسند کے مطابق اس میں سے جو چاہو، لے لو۔ خزانے میں بہت کچھ تھا۔ سونا، چاندی، قیمتی تلواریں، زرہ بکتر، قیمتی برتن کیا کچھ نہ تھا۔ اس میں ایک مصر کا بنا ہوا چٹائی کا مصلّٰی بھی تھا۔ میں یہ بات جانتا تھا کہ یہ مصلّٰی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو بنو امیہ کے خزانے میں نسلاً بعد نسل محفوظ چلا آرہا ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے کسی نے اشرفیاں اٹھالیں، کسی کو تلوار پسند آئی۔ کسی نے درہموں پر قبضہ کیا، کسی نے خوبصورت اور نادر برتنوں کا انتخاب کیا، کسی نے زرہ بکتر اٹھائی۔ میں نے چٹائی کا وہ مصلّٰی لے لیا کیونکہ میں اس مصلّٰی کو دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے زیادہ قیمتی تصور کرتا تھا۔ جب تقسیم مکمل ہوگئی تو ایک جاننے والے نے خلیفہ منصور عباسی سے کہا کہ خلیفہ صالح سب سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا ہے، اس لئے کہ اس نے وہ دولت اختیار کر لی ہے جس کی برکتوں سے یہ تو کیا اس کی نسلیں بھی مالا مال ہوتی رہیں گی۔ منصور نے کہا وہ کیسے؟ اس نے بتایا کہ جس مصلّٰی کو اس نے اپنے لیے پسند کیا ہے یہ وہی مصلّٰی ہے جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرماتے تھے۔ یہ سن کر منصور چونک اٹھا۔ اس نے کہا یہ تو وہ چیز ہے جسے شاہی خزانے میں رہنا چاہیے۔ میں نے کہا خلیفہ اب تو تو دے چکا ہے، اور دی ہوئی چیز بادشاہ واپس نہیں لیتے۔ منصور قول ہار چکا تھا اس لیے اسے چپ ہونا پڑا۔ تاہم اس نے یہ کہا کہ میں یہ مصلّٰی تجھے اس شرط پر دیتا ہوں کہ عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو اسے لے کر

آیا کرے تاکہ میں اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھا دیا کروں میں نے منصور کی اس شرط کو منظور کر لیا۔ اس کے بعد سے منصور کا یہ معمول تھا کہ جب وہ عیدین اور جمعہ کے لیے محل سے نکلنے لگتا تو مجھے اطلاع دے دیتا اور میں مصلّیٰ لے کر مسجد میں چلا جاتا۔ نماز کے بعد اسے پھر اپنے گھر میں لے آتا۔ اس وجہ سے میرا اصل نام تو لوگ بھول گئے اور مجھے صاحب المصلّیٰ کے لقب سے یاد کرنے لگے کیونکہ میرے گھر میں ایک ایسا خزانہ تھا جس کی برکتیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ جناب صالح کی وفات کے بعد یہ رسم جاری رہی اور ان کے خاندان میں یہ دولت باقی رہی۔ معتصم باللہ کے زمانے میں معتصم باللہ نے صالح کے خاندان سے وہ مصلّیٰ لے کر خزانے میں جمع کر دیا اور کہا کہ یہ تبرک ہے اسے قومی ملکیت میں رہنا چاہیے۔

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس دن تو بالکل عید کا سا سماں تھا۔ اکثر و بیشتر صحابہ کرامؓ کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے اس دن سے زیادہ کسی دن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اتنا خوش و خرم اور مطمئن نہیں دیکھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر آج کونسا ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آگیا ہے کہ لوگوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی تب جا کر راز کھلا کہ آج ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ سرکار صلی اللہ علیک! قیامت کب آئے گی۔ آپ نے پوچھا "قیامت کے بارے میں تو پوچھ رہے ہو، یہ تو بتاؤ کہ قیامت کے لئے تم نے تیاری کیا کر رکھی ہے کہ اتنا انتظار کر رہے ہو؟ صحابی نے عرض کیا" حضور! میں نے بہت سی نمازیں، نفلی روزے اور صدقات تو تیار نہیں کیے ہیں! البتہ ایک

بات میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے دل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ضرور موجود ہے۔ سرکار! میرا تو یہی سرمایہ ہے۔ صحابی نے یہ بات کچھ اس سادگی اور خلوص سے کہی کہ حاضرین اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بات سے متاثر ہوئے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لو سنو کہ قیامت کے دن تم اسی کے ساتھ ہو گے جس سے محبت رکھتے ہو۔ یہ سن کر تمام صحابہ کرامؓ خوشی سے جھوم جھوم اٹھے کیونکہ ہر ایک نے اپنے دل کی طرف توجہ کی اور محسوس کر لیا کہ اس کا دل اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار ہے۔ یہ دولت انہیں اس طرح حاصل تھی کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت، عزت و مرتبہ ان کے سامنے ہیچ تھا۔ دن رات ایک ہی دھن اور ایک ہی لگن تھی کہ کسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی ہو جائیں۔ لہٰذا سب نے سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ انشاء اللہ العزیز کل قیامت کے دن حشر کے میدان میں وہ ہوں گے اور دامانِ پاکِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ۔ پھر نہ کوئی خوف ہو گا نہ حزن۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!۔

مُردوں کی مسیحائی

سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد فیصلہ ہوا کہ مکہ سے ان کی کمسن یتیم بچی کو جیسے بھی ہو مدینہ لایا جائے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور مکہ گئے۔ آخر کار وہ بچی کو مکہ سے مدینہ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر زید کی اونٹنی ابھی شہر مدینہ میں داخل ہی ہو رہی تھی کہ اونٹنی کے ساتھ دو جلیل القدر صحابہ کرام سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ دوڑنے لگے۔ اونٹنی ٹھہرا دی گئی۔ اور بحث شروع ہو گئی حضرت جعفرؓ کا کہنا تھا

کہ اس بچی کی میں پرورش کروں گا کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور میرے نکاح میں اس کی خالہ ہے جو ماں کے برابر ہوتی ہے۔ جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ فرما رہے تھے کہ "یہ میرے بھی چچا کی بچی ہے اور میرے نکاح میں خود سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہرا خاتون جنت رضی اللہ عنہا ہیں جو سب سے زیادہ اس بات کی مستحق ہیں کہ اس بچی کی پرورش کریں یہ دیکھ کر جناب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی مدعی ہو گئے انہوں نے فرمایا کہ حضرت! میں اس کی پرورش کا مستحق ہوں اس لئے کہ اسے لانے کے لئے میں نے اتنا طویل سفر کیا اور بہ ہزار دقت و پریشانی اسے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔

آخر کار مقدمہ بارگاہ رسالتؐ میں پیش ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمے کی سماعت فرمانے کے بعد فیصلہ صادر فرمایا کہ چونکہ خالہ ماں کی عدم موجودگی میں ماں کے برابر ہوتی ہے اور وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حرم میں ہے اس لئے لڑکی حضرت جعفرؓ کو دیدی جائے۔ جب امیر حمزہؓ کی لڑکی کی پرورش کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے یہ صحابہ کرام جھگڑ رہے تھے تو تاریخ انتہائی تعجب سے یہ منظر دیکھ کر اسے اپنے دفتر میں محفوظ کر رہی تھی کہ یہی تو وہ عرب ہیں جو اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے اور صرف چند سالوں میں آج یہ کیفیت ہے کہ لڑکی کی پرورش کے لئے جھگڑ رہے ہیں ؎

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

حضورؐ اور عجز و انکسار

مدینہ منورہ سے لشکر روانہ ہو چکا ہے۔ منزل میدان بدر ہے۔ غریبوں، تہی دستوں، فاقہ مستوں اور ایمانیوں کا لشکر۔ تین سو تیرہ کی اس جماعت کو اس کا اہم ترین فیصلہ

کرنا ہے عزم یہ ہے کہ

یا ہم نہیں یا گردش افلاک نہیں ہے پہلی اور آخری بازی

آج اگر یہ جماعت شکست کھا جائے تو زمین پر قیامت تک اللہ کا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا کیونکہ نبیؐ بھی آخری ہے اور دین بھی آخری۔ بے سروسامانی کا عالم یہ ہے کہ سواریاں تک میسر نہیں فاصلہ بھی کچھ ایسا کم نہیں کوئی چار منزل ہے تو سے میل سے بھی زیادہ تین سواروں کے حصے میں ایک ایک اونٹ اور وہ بھی بمشکل۔ لازماً دو پیدل چلیں گے اور ایک سوار ہوگا۔ اللہ اللہ یہ بے سروسامانی اور اس کے ساتھ یہ عزم جاودانی۔ کون ہے جو اس سیلاب کو روکے؟ ہتھیار کا ہتھیار سے مقابلہ ہو سکتا ہے طاقت طاقت کے ساتھ کھڑی ہو سکتی ہے مگر کس میں تاب ہے کہ ایمان کے سامنے کھڑا ہو یا ایمانیوں کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکے بدر کے میدان میں کفر بڑی شان و شوکت سے آرہا تھا فوج بھی تھی ہتھیار بھی تھے سامان رسد بھی تھا تجربہ کاری اور فن سپہ گری بھی تھا لیکن آج ایمان بھی اپنا سارا سرمایہ سمیٹے منزل بدر کی طرف رواں دواں تھا سید الاولین والآخرین امام المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایمانیوں کے سالار لشکر ہیں، عمر کوئی ترپن چون سال، نورِ نبوت چہرے سے آشکار، رمضان کا مبارک مہینہ، دو جوان اور ذاتِ اقدس ایک اونٹ میں شریک ہیں جوانوں نے عرض کی سرکار صلی اللہ علیہ وسلم آپ سواری پر تشریف رکھیں، ہم جوان ہیں پیدل چل لیں گے ہم آپ کے غلام ہیں، آپ کے خادم ہیں، آپ کی جنبش نظر اور چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں ہم گوارہ نہیں کر سکتے کہ ہم اونٹنی پر سوار ہوں اور براق کا سوار پیدل چلے۔ چار منزلوں کا فاصلہ کوئی فاصلہ نہیں خدا کے لئے ہمیں شرمندہ نہ کیجیے جانثاروں نے عرضداشت پیش کر دی مگر سنیئے کہ آقا کی طرف سے کیا جواب ملا "تم دونوں مجھ سے زیادہ طاقتور تو نہیں ہو رہا سوال اجر کا جو پیدل چل کر مجاہد فی سبیل اللہ کو ملتا ہے اور جس کے تم طلب گار ہو اس کا تمہاری طرح میں بھی طلب گار ہوں۔ آپ نے مٹی کے بنے ہوئے بادشاہوں، گورنروں اور شہنشاہوں کے بہت سارے

جلوس دیکھے ہوں گے کیسا کروفر ہوتا ہے راستے بند کر دئے جاتے ہیں، سواریاں روک دی جاتی ہیں۔ دائیں بائیں آگے پیچھے محافظوں کے دستے تزک احتشام اور شان وشوکت ایسی کہ الامان والحفیظ۔

آیئے ذرا شہنشاہ لولاک کی سواری کا منظر بھی دیکھ لیجئے کہ غلام اور جانثار اونٹ پر سوار ہیں اور آقا پیدل چل رہا ہے۔ کونین کی دولتیں اپنے قدموں میں سمیٹے کتنا بڑا سبق دے رہا ہے۔ شرافت کا، مساوات کا، انکسار کا اور اپنی بےمثال عبدیت کا۔ کہاں ہے تاریخ کیا اس کے دامن میں ایسا کوئی گوہر نایاب ہے ؟

رحمۃ للعالمین

ابو داؤد شریف میں حضرت عبدالرحمٰن ابن عبداللہؓ اپنے والد سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضورؐ کے ساتھ سفر پر تھے کہ ایک جگہ ہم نے پڑاؤ کیا۔ حضورؐ کسی ضرورت کے تحت تھوڑی دور چلے گئے۔ اس اثناء میں ہم نے ایک چھوٹی سی چڑیا دیکھی جس کے ساتھ دو بچے تھے۔ ہم نے چڑیا کے دونوں بچوں کو پکڑ لیا۔ چڑیا کے بچوں کو پکڑنا تھا کہ وہ اپنے پر کھول کر منڈلانے لگی۔ اس کی بے چینی دیکھ کر ہم لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ اتنے میں نبی اکرمؐ تشریف لائے۔ آپؐ سمجھ گئے۔ ارشاد فرمایا کہ "اس کو بچے کی وجہ سے کس نے دکھ پہنچایا ہے، اس کے بچے اسے واپس کر دو"۔ ہم نے فوراً بچوں کو چھوڑ دیا آپ نے اس وقت ان چیونٹیوں کے گھر بھی دیکھے جن کو ہم نے جلادیا تھا۔ آپؐ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا۔ دریافت فرمایا کہ ان چیونٹیوں کے گھروں کو کس نے جلایا۔ ہم نے بتایا کہ ہم نے جلایا۔ اب آپؐ کے چہرہ مبارک پر برہمی کے آثار صاف جھلکنے لگے۔ ارشاد ہوا "آگ کی سزا دینا صرف آگ کے مالک اللہ تعالیٰ کا حق ہے" آپؐ رحمۃ اللعالمین تھے۔ آپ کی رحمت صرف انسانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ شجر و حجر، دریا و سمندر، کیڑے مکوڑوں اور جانوروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح

جس طرح سورج کی روشنی سے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات حرارت وحیات حاصل کرتی ہیں اور چاند سے حسن ولذت، بارش سے نمو، ہواؤں سے خنکی، بادِ نسیم سے خوشبو تو وہ جو سب کا سرتاج اور زینتِ عالمِ امکان تھا۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی اور جس کے سر اقدس پر لولاک لما خلقت الافلاک کا تاج رکھا بھلا اس کی رحمت سے کون محروم رہ سکتا ہے۔

خُلقِ نبویؐ

حضرت سعد بن اطول غم سے ادھ مرے ہو رہے تھے جوان بھائی کی موت چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ، گھر میں ایک بیوہ موجود، ساتھ اچھا خاصا قرض۔ کیا کریں کیا نہ کریں سمجھ میں نہیں آتا تھا، بھائی کی موت تو مقدر تھی۔ واقع ہو گئی رو پیٹ کر صبر کا سل سینے پر رکھ لیا مگر بھائی چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں اور بچیوں کو چھوڑ کر گیا تھا اپنے پاس اتنی وسعت نہیں تھی کہ بلا جھجک ان کے اخراجات کا بار اٹھاتے بھائی کی بیوہ الگ سر جھکائے بیٹھی تھی قرضہ بھی معمولی قرض نہیں تھا ترکے میں صرف بھائی نے صرف تین سو اشرفیاں چھوڑی تھیں۔ سعد بن اطولؓ مخمصے میں پڑ گئے اگر مرحوم کے ترکے تین سو اشرفیوں سے قرض خواہوں کا قرض چکا دیں تو پھر یتیم بچوں کی پرورش، بچیوں کی شادی بیاہ کا فریضہ کس طرح سر انجام دیں گے تین چار دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے دماغ کے افق پر مایوسیوں، الجھنوں اور پریشانیوں کے بادل چھاتے چلے گئے انسان کو پیاس لگتی ہے تو پانی کی طرف دوڑتا ہے بیمار ہوتا ہے تو طبیب کو تلاش کرتا ہے۔ مدینہ میں غم کے ماروں کا ایک ہی غم خوار تھا ایسا غم خوار جو خیر خواہ بھی تھا اور معین و مددگار بھی جس نے عام اعلان کر رکھا تھا کہ جو آدمی مر جائے اور مال چھوڑ کر مرے تو اس کا مال اس کے وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن جو قرض چھوڑ کر مرے اور اس کے قرض کو ادا کرنے والا کوئی نہ ہو تو وہ میرے پاس آ جائے کیونکہ میں سب کا

غم خوار، سب کا درد منداور سب کے دکھ کو بانٹنے والا ہوں۔ قدرت نے مجھے یتیموں کا والی اور غلاموں کا مولیٰ بنایا ہے۔ میرے پاس آؤ کہ صحیح راہ میں ہی دکھا سکتا ہوں۔ ایسی راہ جو نجات اور کامرانی کی راہ ہے۔ سعد بن اطولؓ کو اس پریشانی کے عالم میں وہی مونس وغم خوار یاد آیا اور سیدھے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیک! مجھے مشورہ دیجیے کہ میں کیا کروں۔ بھائی وفات پا گیا چھوٹے چھوٹے یتیم بچے اور بچیاں ہیں وہ مقروض مرا ہے۔ صرف تین سو اشرفیاں اس نے ترکے میں چھوڑی ہیں۔ اگر ان اشرفیوں سے قرض ادا کر دوں تو یتیموں کی پرورش کس چیز سے کروں ؟ یارسول اللہؐ! آپ پر درود سلام ہو آپ رہبری فرمائیں۔ سعد بن اطولؓ کی عرض داشت سننے کے بعد ایک لمحے کے توقف کے بغیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سعدؓ! تیرا بھائی جنت میں داخلے سے قرض کی وجہ سے روک دیا گیا ہے کیونکہ اگر کسی آدمی پر قرض ہو تو جب تک اس کا قرض ادا نہ کیا جائے وہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتا تو پہلے جا اور قرض ادا کر یتیموں کی کفالت کا مسئلہ اس ذات پر چھوڑ دے جس نے انہیں یتیم بنایا ہے۔

نبیِ رحمتؐ اور بیمار بڑھیا

مدینہ کے نواحی علاقے میں ایک بڑھیا عرصہ سے بیمار تھی ایک دن اس کی طبیعت بہت خراب ہوگئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی حالت کا علم ہوا تو حسب عادت اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ نے بار بار عیادت کی فضیلت بیان فرمائی اور صحابہ کرامؓ کا یہ معمول تھا کہ اگر کسی کی بیماری کی خبر معلوم ہوتی تو ہر شخص بیمار پرسی میں سبقت کرتا۔ بیمار پرسی کرنے سے کوئی اچھا نہیں ہو جاتا البتہ بیمار کو ایک قسم کا روحانی سکون حاصل ہوتا ہے جو تمام عبادات میں افضل ترین عبادت ہے بعض لوگ

سمجھتے ہیں کہ صرف نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی عبادت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کے دِل کو خوش کر دینا ہی سب سے بڑی عبادت ہے کہ مسلمان کا دِل اللہ کا عرش ہوتا ہے آپ عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ بڑھیا لبِ مرگ ہے۔ بیمار کو تسلی دی اور واپس تشریف لے آئے مگر صحابہ کرامؓ سے ارشاد فرمایا کہ اس کے بچنے کی امید نہیں عشاء کی نماز کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمانے کے لئے حجرے میں تشریف لے گئے اُدھر بڑھیا نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ تجہیز و تکفین کا انتظام ہوا کسی صحابی نے نماز جنازہ پڑھائی اور بڑھیا کو دفن کر دیا گیا۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے اس لئے حضرات صحابہؓ نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا صبح کے وقت جب آپ نے بڑھیا کی حالت دریافت کی اور آپ کو بتلایا گیا کہ اسے دفن بھی کر دیا گیا ہے تو آپ سخت ناراض ہوئے کہ مجھے کیوں نہ بتایا گیا۔ وہ ایک غریب لاوارث بڑھیا تھی مگر تھی تو میری امتی میری نام لیوا۔ صحابہ کی جماعت کو ساتھ لیا اور بڑھیا کی قبر پر جا کر اس کی نماز جنازہ ادا کی۔

باب ۳

صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اسلام پر ہزار ماں بھی قربان

جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ والدین اور خاص کر ماں کے مرتبے سے واقف تھے۔ آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی معلوم تھا کہ ماں کے پیروں تلے جنت ہے اور کسی بھی صورت میں اسلام والدین کو ناراض کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ ایک حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ اگر کوئی شخص محض پیار کی نظر سے اپنے والدین یا والدین میں سے کسی ایک کو دیکھے تو اس کی ہر نظر کے عوض اللہ تعالیٰ ایک قبول شدہ حج اس کے نامۂ اعمال میں درج فرمائے گا۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا حضور! اگر کوئی شخص دن میں سو مرتبہ پیار بھری نظروں سے اپنے والدین کو دیکھے تو کیا سو قبول شدہ حج اس کے نامۂ اعمال میں درج کیے جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں، سو قبول شدہ حج اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوں گے۔ اللہ بہت بڑا اور عظمت والا ہے۔"

اس تمام عظمت کے باوجود حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ سعد نے اسلام قبول کر لیا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئیں اور قسم کھائی کہ جب تک سعد اسلام نہیں چھوڑیں گے، وہ نہ ان سے بات کریں گی نہ کھانا کھائیں گی اور نہ پانی پئیں گی۔ چنانچہ انہوں نے یہ قسم پوری کی۔ بوڑھی عورت تھیں، تین دنوں کی بھوک پیاس کے بعد بے ہوش ہو گئیں اور دم لبوں پر آ گیا۔ سعد اپنی ماں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنی ماں کے معمولی سے چشم و ابرو کے اشارے پر اپنی جان قربان کر دینے پر تیار رہتے تھے۔

وہ عزیز ترین ماں موت کے ساحل کے قریب تھی۔ بے ہوش ہوتی اور پھر ہوش میں آ جاتی۔ ماں کو ضد تھی کہ سعد اسلام کو چھوڑ دیں اور پھر کفر اختیار کر لیں۔ ایک طرف ماں کی محبت تھی، دوسری طرف اسلام کی۔ سعد بن ابی وقاصؓ دوراہے پر کھڑے تھے۔ ماں سمجھ رہی تھی کہ میری محبت غالب آئے گی اور سعد دوبارہ کفر کی آغوش

میں چلا آئے گا۔غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ایک مرتبہ ماں کو ہوش آیا تو سعدؓ اس کے قریب گئے اور کہا ماں! اگر تمہارے بدن میں ہزار جانیں بھی ہوں، اور ایک ایک کر کے ہر جان نکل جائے تو بھی یاد رکھو کہ میں دینِ اسلام کو نہیں چھوڑوں گا۔ یہ عہد وفا کچا دھاگہ نہیں کہ معمولی سے جھٹکے سے ٹوٹ جائے۔ یہ سودا تو ایسا سودا ہے جو اب انشاء اللہ جان کے ساتھ ہی جائے گا۔ آخر سعدؓ جیتے اور ماں کو شکست تسلیم کرنی پڑی کیونکہ ؎

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

سخی لوگوں کا کنبہ

عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ تین احرام پوش حاجی مکہ معظمہ کی طرف جا رہے تھے۔ ایک اونٹ پر کھانے پینے کا سامان اور زادِ راہ تھا۔ سواری کے اونٹ ذرا آگے نکل گئے، اور زادِ راہ والا اونٹ نہ جانے صحرا میں کہاں گم ہو گیا۔ کوئی دائیں دوڑا کوئی بائیں میلوں ڈھونڈتے پھرے لیکن نہ معلوم اونٹ کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا کہ اسے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ریگستانی علاقہ، دور دور تک پانی یا ہریالی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صحرائی علاقے میں زادِ راہ کا گم ہو جانا ہلاکت ہی سمجھیے لیکن کریں تو کیا کریں۔ چلتے رہے، چلتے رہے کہ نا امیدی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ رات کا وقت تھا ایک چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا۔ تینوں مسافر تیزی سے اس چراغ کی روشنی کو تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ جا کے دیکھا کہ ایک خیمہ ہے اور اس میں تنہا ایک بوڑھی عورت ہے اور ایک بکری۔

مسافروں نے جا کے بڑھیا کو بتایا کہ ہمارا زادِ راہ گم ہو گیا ہے۔ ہم حالتِ احرام میں ہیں اور بھوک اور پیاس سے پریشان ہیں۔ صحرائی لوگ ویسے ہی مہمان نواز ہوتے ہیں، اور اہلِ عرب کو تو اس معاملے میں خاص طرہ امتیاز حاصل ہے۔ بڑھیا

نے نہایت خوش دلی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ گھر میں دودھ موجود تھا۔ اس میں ٹھنڈا پانی ملا کر پلایا اور بکری ذبح کی۔ مہمانوں نے رات بھر آرام کیا۔ صبح سویرے جب روانہ ہونے لگے تو بڑھیا سے کہا کہ ہم لوگ مدینہ منورہ کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام حسن ہے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں ان کا نام حسین ہے۔ اور یہ جو ہمارے ساتھی ہیں ان کا نام عبداللہ بن جعفر ہے۔ اگر کبھی مدینہ منورہ آنا ہو تو ہم سے ضرور ملاقات کرنا۔ مہمانوں کے چلے جانے کے بعد بڑھیا کا شوہر آیا تو بڑھیا نے تمام کوائف بتائے۔ صحرا میں رہنے والے اس خاندان کا ظاہری ذریعہ معاش وہی ایک بکری تھی جسے بڑھیا نے ذبح کر کے مہمانوں کو کھلا دیا تھا۔ شوہر اس بات کو سن کر بہت پریشان ہوئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ تجھے بکری ذبح نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بڑھیا نے کہا کہ اللہ مالک ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد کچھ ایسا اتفاق پیش آیا کہ بڑھیا کو اپنے شوہر کے ہمراہ مدینے جانا پڑا۔ محض اس خیال سے کہ شاید امام حسنؓ اور حسینؓ یہ سمجھیں کہ بڑھیا اپنے احسان کا بدلہ لینے آئی ہے، بیوی اور شوہر نے ان سے ملاقات نہ کی مگر حسن اتفاق کہ ایک دن امام حسنؓ نے بڑھیا کو بازار میں دیکھ لیا اور اسے اس کے شوہر کے ساتھ گھر لے آئے۔ رخصت ہوتے وقت ایک غلام اور ایک ہزار بکریوں کا ریوڑ بطور ہدیہ دونوں کے حوالے کیا۔ پھر امام حسینؓ کے پاس لے گئے اور انہوں نے بھی ایک غلام اور ایک ہزار بکریوں کا ریوڑ بطور تحفہ پیش کیا۔ پھر عبداللہ بن جعفرؓ کے پاس لے گئے اور انہوں نے بھی اسی طرح ایک ہزار بکریوں کا ریوڑ اور ایک غلام دیا۔ مالا مال ہو کر شوہر اور بیوی اپنے قبیلے میں لوٹے۔ قبیلے والوں نے پوچھا اتنا مال کہاں سے مل گیا۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے خانوادے کے تین حضرات کی صرف ایک رات میزبانی کی تھی، سخی لوگوں نے ہمیں نواز دیا۔

غرور کا علاج

آج اہلِ مدینہ نے ایک ایسا واقعہ دیکھا کہ سب حیران رہ گئے اور ان کی حیرانی بے وجہ بھی نہیں تھی حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کسی معمولی شخصیت کے آدمی نہیں۔ زمانۂ قبل اسلام میں یہودیوں کے بہت بڑے عالم مانے جاتے تھے اور بہت مالدار بھی تھے۔ یہ وہی صحابی ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک دیکھتے ہی یہ کہہ کر اسلام قبول کر لیا کہ یہ چہرہ کسی جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں اپنی خاندانی گدی نشینی بھی چھوڑنی پڑی اور طرح طرح کی مشکلات میں گرفتار بھی ہونا پڑا لیکن ان کے پائے استقامت میں ادنیٰ سی لغزش بھی پیدا نہ ہوئی اور وہ اس قول پر ڈٹ گئے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں، ذات میں نہ صفات میں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ پس انداز کیا ہوا جو سرمایہ ان کے پاس محفوظ تھا عبداللہ بن سلامؓ نے اس سے کاروبار شروع کیا اور بہت جلد مدینہ منورہ کے ممتاز کاروباریوں میں شمار ہونے لگے۔ کاروباری حلقے میں انہیں بہت ہی عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے کہ وہ لین دین میں وعدے کے بہت پابند تھے۔ ظاہر ہے کہ جب اتنا بڑا سرمایہ دار اور معروف تاجر سر پہ لکڑیوں کا گٹھا رکھے بازار میں سے گزر رہا ہو تو لازماً لوگ متعجب ہوں گے۔ کسی نے آگے بڑھ کر حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو روک لیا اور اس نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے مالی حالات تو بہت مستحکم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو خادم اور غلام بھی دیئے ہیں لکڑیوں کا یہ گٹھا سر پہ اٹھائے آپ کیوں پھر رہے ہیں؟ کسی غلام کو دے دیئے ہوتے، کوئی مزدور رکھ لیتے! آپ بخیل آدمی بھی نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ یہ گٹھا آپ مجھے دے دیں میں آپ کے گھر پہنچا دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ مسکرائے اور فرمایا میں مریض ہوں اور حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق علاج کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر ایک اعتبار سے فارغ البال کیا ہے۔ دنیاوی مال و دولت کی فراوانی بھی ہے اور خادم و غلام بھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ شاید میرے اندر تکبّر پیدا ہو رہا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جنت میں وہ آدمی داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی غرور اور تکبر ہو۔ میرے بھائی! تمہارے خلوص و محبّت کا شکریہ، مجھے اپنا علاج کرنے دو اور تکبّر کو دفع کرنے دو۔

کمالِ اطاعت کی ایک ادنیٰ جھلک

جمعہ کے دن لوگ جب مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مسجد کے باہر دروازے کے قریب بیٹھا ہوا دیکھا تو سخت حیران ہوئے کہ مسجد میں جگہ بھی ہے اور جس جگہ وہ بیٹھے ہوئے تھے محض دو چار قدم کا فاصلہ تھا، مسجد میں جا کر بیٹھ سکتے تھے۔ آخر کیا بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ مسجد کے باہر دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب خطبہ ختم ہوا تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ مسجد کے دروازے کے باہر آپ کیوں بیٹھے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ میں مسجد کے اندر پہنچ ہی رہا تھا کچھ لوگ صحنِ مسجد میں کھڑے تھے اتنے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے۔ آپؐ نے لوگوں کو مسجد کے صحن میں کھڑا ہوا دیکھ کر ارشاد فرمایا لوگو! بیٹھ جاؤ۔ یہ آواز میں نے سنی تو میں جہاں تک پہنچا تھا، آپؐ کے حکم کی اطاعت میں وہیں بیٹھ گیا۔ کسی نے دریافت کیا حضرت! آپ جان رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو نہیں بلکہ ان لوگوں کو بیٹھ جانے کا حکم دے رہے تھے تو پھر آپ کو بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ فرمایا کہ چاہے آپؐ کسی کو حکم دیں، آپؐ کا حکم تو میں نے سنا کہ آپؐ بیٹھ جانے کا حکم دے رہے ہیں، اس لیے میں نے اس کی فوراً تعمیل کی۔

بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپؐ کا حکم میرے کانوں تک پہنچے اور میں عمل نہ کروں۔

ایک صاحب نے دریافت کیا حضرت بیٹھنا ہی تھا تو دو چار قدم کے فاصلے پر مسجد تھی، مسجد میں جا کر بیٹھ جاتے۔ بھلا دروازے پر بیٹھنے کی کیا تک تھی۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں نے بھی پہلے یہی سوچا تھا کہ مسجد میں جا کر بیٹھوں پھر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہوتے میں مر جاؤں تو میں اس حالت میں مر جاتا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جانے کا حکم دے رہے تھے اور میں آپؐ کے حکم کے خلاف چل رہا ہوتا۔ اس لیے میں اسی جگہ بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپؐ بہت خوش ہوئے اور عبداللہ بن رواحہؓ کے حق میں دُعا فرمائی کہ اللہ! اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جذبہ اور زیادہ کر۔

سلمان فارسیؓ ـــ زہد و درویشی کا نمونہ

بیماری بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ معالجین ان کی زندگی سے نا امید نظر آنے لگے۔ جب حالت زیادہ خراب ہو گئی تو جس کو جہاں بھی پتہ چلا، عیادت کے لیے دوڑا آیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی تشریف لائے۔ دیکھا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حالت غیر ہے۔ مزاج پرسی کی تو سلمان فارسیؓ کی آنکھوں سے آنسو اُبلنے لگے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمر دراز دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے وقت آپؐ سے راضی تھے۔ اگر آپ کی خدا نخواستہ وفات ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو گی۔ عرصے سے چھوٹے ہوئے ساتھی ملیں گے۔ آخرت کی نعمتوں سے مالا مال ہوں گے۔ سلمان فارسیؓ نے ٹھنڈی سانس لی۔ فرمایا کہ سعد میں نہ تو زندگی سے منہ موڑنے کے غم سے رو رہا ہوں نہ موت کے خوف سے۔ بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ

وسلّم نے ہم سے ایک عہد لیا تھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے عہد پر قائم نہیں رہا۔ آپؐ نے ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ زندگی میں ایک مسافر کے زادِ راہ سے زیادہ سامان جمع نہ کروگے۔ اور دیکھو میرے ارد گرد کتنے سانپ، بچھو، جمع ہیں ان کا اشارہ اس سامان کی طرف تھا جو ان کے کمرے میں اس وقت موجود تھا حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے مڑکر دیکھا تو ان کے کمرے میں ایک لوٹا، کپڑے دھونے کا ایک تسلہ، ایک پیالہ اور اسی طرح کی دو ایک چیزیں تھیں۔ جناب سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اتنے ہی سامان کو سانپ، بچھو سے تعبیر کر رہے تھے۔ حضرت علی بن بذیمہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی وفات کے بعد ان کا اثاثہ فروخت کیا گیا تو اس کی کل قیمت چودہ درہم تھی۔

جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمانؓ سے فرمایا کہ آپ ہم سے کوئی عہد لیجیے۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا کہ جب تم رنج میں مبتلا ہو تو خدا کو یاد کرنا جب کسی معاملے میں فیصلہ کرنا تو خدا کو یاد کرنا، اور جب کوئی چیز لوگوں میں تقسیم کرنا ہو تو خدا کو یاد کرنا۔ جناب سعدؓ سے جناب سلمانؓ نے عہد لیا، کلمہ پڑھا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد گردن ڈھلک گئی اور صدقِ سلمانیؓ کا آفتاب غروب ہو گیا۔

صبر و حلم

جوانانِ جنّت کے سردار سیدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ اپنے اعوان و انصار کے حلقے میں تشریف فرما تھے۔ ایسا لگتا تھا چاند کے گرد ہالہ ہے۔ امام حسن رضی اللہ عنہ کا اوپری دھڑ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بہت مشابہ تھا، اور وہ نہایت خوبصورت آدمی تھے۔ عین اسی لمحے ایک دیہاتی آیا اور اس نے آپؓ کو نہایت بدتمیزی سے مخاطب کیا اور آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ امامؓ سر جھکائے سنتے رہے۔ آپؓ کے جاں نثاروں سے بھلا یہ بدتمیزی کہاں برداشت ہوتی، سب کے ہاتھ تلوار کے دستے

پرتھے۔ قریب تھا کہ کوئی عاشق اٹھتا اور بدزبانی کرنے والی زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتا۔ امامؓ مجمع کا رنگ پہچان گئے۔ فرمایا کہ آپ لوگ صبر و تحمل سے کام لیں۔ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے آپ کو تو نہیں کہہ رہا ہے، مجھے کہہ رہا ہے اور میں سن رہا ہوں۔ پھر اپنے خادم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ غریب دور سے آیا ہوا ہے، بھوکا ہوگا۔ اس کے کپڑے میلے ہیں تھکا ماندہ نظر آرہا ہے۔

اسے لے جا، نہلا دھلا میرے کپڑوں میں سے ایک جوڑا اس کو پہنا، کھانا کھلا جب کھا پی کر آرام کرلے اور واپس جانے کا ارادہ کرے تو میرے پاس لے آنا۔ میں اسے کچھ پیسے دوں گا، معلوم ہوتا ہے کہ تنگ حال ہے۔ خادم نے حکم کی تعمیل کی بدّو کو نہلایا دھلایا کپڑے پہنائے، کھلایا پلایا اور تین دن مہمان رکھا تیسرے دن امام حسنؓ نے خادم سے کہا کہ میرے مہمان کو میرے پاس لے آؤ۔ مہمان جب حاضر ہوا تو آپؓ نے دریافت فرمایا "میرے بھائی! کیا اب بھی تم مجھ سے خفا ہو"۔ بدّو رونے لگا۔ کہا کہ حضرت بخدا گواہ ہے نہ میں پہلے آپ سے خفا تھا نہ اب خفا ہوں۔ خطا معاف، میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کا اثر آپ میں کس قدر ہے اور ان کے اخلاقِ حمیدہ سے آپ کو کتنا حصہ ملا ہے۔ سو میں نے دیکھ لیا۔ سیّدنا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا، الحمد للہ ہم آلِ فاطمہ پہاڑ ہیں۔ معمولی جھونکوں سے ہلنے والے نہیں، اس لیے کہ ہماری پرورش سرورِ کونین ختم المرسلین رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ تربیت میں ہوئی ہے۔

امامؓ نے صحیح فرمایا تھا۔ آپؓ کی شخصیت معمولی شخصیت نہیں تھی۔ ایک مرتبہ آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے پر بیٹھے ہوئے تھے اور آپؐ انہیں لے کر جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ملاقات ہوئی۔ سوارِ دوشِ رسولؐ کو دیکھ کر ابو ہریرہؓ نے فرمایا صاحبزادے! آپ کی سواری تو بہت اچھی ہے۔ یہ سن کر حضورؐ نے ارشاد فرمایا ابو ہریرہ! اگر سواری بہت اچھی ہے تو سوار بھی تو بہت اچھا ہے۔

عفو و درگزر

وہ آدمی جو امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا، ان کے غلام کے رویّے کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ پہلے تو یہ سمجھا کہ غلام بہرہ ہے، لیکن بہت جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ یہ بہرہ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے غلام کا نام لے کر مکان کے اندر سے اسے پکارا۔ اس نے سنا بھی مگر کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد آپؓ نے اسے دوبارہ بلایا۔ اس دفعہ بھی اس نے سنی ان سنی کر دی اور خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد آپؓ نے اس کو تیسری بار آواز دی لیکن یہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر کسی غصے کا اظہار نہ فرمایا اور خاموش رہے۔ اس آدمی سے برداشت نہ ہوا۔ اندر جا کر اس نے عرض کی کہ امیر المومنین! آپ کا غلام تو دروازے پر بیٹھا ہے، آپ کی آوازیں سن رہا ہے مگر جواب نہیں دیتا۔ آپؓ خاموش رہے۔ کچھ وقفے کے بعد غلام کسی کام سے اندر گیا۔ آپؓ نے دریافت فرمایا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی؟ غلام نے عرض کیا حضور! بیشک میں نے آپ کی آواز سنی تھی۔ تو پھر تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے دریافت فرمایا۔ غلام نے دست بستہ عرض کیا، حضور! میں معافی کا خواستگار ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں آپ کی خدا ترسی کی وجہ سے یہ یقین رکھتا ہوں کہ چاہے کتنی بڑی گستاخی مجھ سے سرزد ہو جائے، آپ مجھے سزا نہیں دیں گے۔ کوئی دوسرا حاکم ہوتا تو غلام کی کھال کھنچوا دیتا، مگر یہ حاکم آغوشِ نبوت کا پروردہ، حلم و عفو کا مجسمہ، محبت و انسانیت دوستی کا مرقع، شہرِ علم کا دروازہ تھا، مسکرائے اور فرمایا، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا بنایا جس سے خدا کی مخلوق محفوظ و مامون ہے۔ میرے نزدیک کسی کا دل دکھانا اور اپنے ماتحتوں کو ستانا سب سے بڑا گناہ ہے۔

ہم نیکی فروخت نہیں کرتے

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے چچازاد اور سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے حقیقی بھائی تھے۔ عالی نسب، عالی ظرف، جوانِ رعنا۔ مگر مزاج میں مسکنت اور تواضع حد سے زیادہ تھی۔ اکثر و بیشتر غریبوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے اور جب کسی کی پریشانی یا تنگدستی کا علم ہوتا، خود تکلیف اٹھا کر اور اپنی ضروریات کو پسِ پشت ڈال کر اس کی ضرور مدد فرماتے۔

ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جب کفارِ مکہ کے وفد نے نجاشی کو ورغلانے کی کوشش کی تھی تو وہ حضرت جعفر طیار رضی ہی تھے جنہوں نے قرآنِ کریم کی آیات کی تلاوت فرما کر نجاشی کے سامنے عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدے اور نظریے کی وضاحت فرمائی تھی۔ غزوۂ موتہ میں شریک ہوئے اور پرچم اسلام کو بلند رکھنے کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کی۔ جب ان کی شہادت کی خبر ملی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے گھر تشریف لے گئے اور ان کے نابالغ بچوں حضرت عبداللہ بن جعفر، عون بن جعفر اور محمد بن جعفر رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلایا اور ان کے سر پر دستِ مبارک پھیرا اور ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ کچھ تو باپ کا اثر اور کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے دستِ مبارک کی برکت، سارے بچوں کی خصلتیں بالکل باپ کی طرح تھیں۔ وہی تواضع و ایثار، عبادت و تقویٰ شعاری و غربا پروری۔ پاک خاندان کے پاک و شفاف موتی۔ ایک تاجر کئی دنوں سے پریشان پھر رہا تھا۔ اس کا ایک کام اُلکا ہوا تھا۔ خلیفۂ وقت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ تھے۔ مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض مدعا کرے۔ اجنبی تھا اس لیے اس کی سفارش کرنے والا کبھی کوئی نہ تھا۔

کسی نے اسے بتا دیا کہ آلِ جعفر کے پاس جاؤ وہ تمہاری سفارش کر دیں گے۔ کہ وہ سخی ابنِ سخی اور غریبوں اور پردیسیوں کے ملجا و ماویٰ ہیں وہ حضرت عبداللہ بن جعفر

رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ میری سفارش جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کر دیں۔ جناب عبداللہ نے معاملہ سنا اور صرف یہ غور کیا کہ اس کی سفارش میں کسی کی حق تلفی تو نہیں ہے۔ جب اچھی طرح معاملات سمجھ لیے تو اس کی سفارش فرما دی اور اس کا کام ہو گیا۔ تاجر تو بیچارا خوشی سے بے حال ہو گیا۔ اس نے نذرانے کے طور پر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں چالیس ہزار درہم پیش کیئے۔ عبداللہ کا چہرہ ان درہموں کو دیکھ کر متغیر ہو گیا۔ تاجر کی طرف سے رُخ پھیر لیا اور ایک جملہ ارشاد فرمایا جو تاریخِ اسلام کی پیشانی پر اس وقت سے ثبت ہے اور قیامت تک ثبت رہے گا:

"ہم آلِ ہاشم اپنی نیکی فروخت نہیں کیا کرتے۔"

یہ فرمایا اور تاجر سے کہا کہ یہ درہم اٹھالو۔

چور کے لیے عبداللہ بن مسعودؓ کی دُعا

دکاندار غلّہ تول رہا تھا اور وزن کر کے بوری میں ڈالتا جا رہا تھا۔ جب بوری بھر گئی اور اس نے بوری کے منہ کو ایک رسّی سے باندھ دیا تو خریدار نے اپنی پگڑی کے کونے کو نکالا کیونکہ اس نے ساری رقم پگڑی کے کونے میں باندھ کے پگڑی لپیٹ لی تھی۔ اب جو پگڑی اتاری اور اس کا کونا دیکھا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کسی نے پیسے کھول لیے تھے۔ خریدار بیچارا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اسے یاد آگیا کہ ایک جگہ پر آرام کرنے کے لیے اس نے پگڑی اتاری تھی اور تھوڑی دیر لیٹا تھا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر شاید کسی نے پیسے نکال لیے۔ اس نے دکاندار سے کہا بھائی! مجھے معاف کر دیں میں سمجھ رہا تھا کہ میرے درہم پگڑی میں ہیں اور اسی خیال سے میں نے غلہ بھی خرید لیا تھا مگر میں تو گنوا چکا۔ پیسے کسی نے کھول لئے ہیں۔ اور بھی بہت سے خریدار دکان پر موجود تھے۔ جب انہوں نے سنا کہ اتنی قابلِ احترام ہستی

کے ساتھ لوگوں نے یہ حرکت کر دی تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ ایک آدمی نے کہا یا اللہ! جس چور نے ان کے ساتھ یہ حرکت کی ہے اس کے ہاتھ کٹ جائیں۔ دوسرے نے کہا ان کی ذات تو ایسی ہے کہ ساری دنیا ان کا احترام کرتی ہے۔ اس کمبخت چور کو ان کی عظمت کا بھی خیال نہ آیا اور ان کو ان کی پاک کمائی سے محروم کر دیا۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو جائے گا۔ یہ باتیں سن کر بزرگ کھڑے ہو گئے فرمایا کہ آپ لوگ چُپ رہیں۔ دُکاندار سے کہا کہ تم غلے کی بوری رکھے رہو، میں پیسے لے کر آؤں گا تو ادائیگی کر کے اپنا سامان لے جاؤں گا۔ دُکاندار نے کہا کوئی بات نہیں آپ سامان لے جائیں، پیسے بعد میں آجائیں گے۔ آپ کو کون نہیں جانتا۔ دوسرے خریدار منع کرنے کے باوجود نہ ماننے اور مسلسل چور کو بُرا بھلا کہتے رہے یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن مسعود امام المحدثینؓ نے دستِ دعا دراز کیا: الٰہا! اگر چور نے میرے پیسے اپنی کسی ضرورت سے مجبور ہو کر نکال لیے ہیں تو اللہ! اس کی حاجت کو پورا کر دے تاکہ وہ آئندہ اس طرح کے عمل سے باز آجائے اور اگر اس نے یہ عمل جرأتِ گناہ کے باعث کیا ہے تو میرے مالک! اسے توبہ کی توفیق دے۔ ایسی توبہ کہ یہ گناہ اس کا آخری گناہ ثابت ہو اور پھر کبھی گناہ کرنے کا اس میں جذبہ ہی پیدا نہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دین خیر خواہی کا نام ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے یہی قول تھا۔

امام حسنؒ اور خوفِ الٰہی

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا، تاہم ابھی صبح ہونے میں کافی دیر تھی۔ کسی قدر صحن حرم میں خاموشی تھی۔ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نوافل میں مشغول تھا کہ قریب ہی سے آہ وزاری اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے کان

لگایا تو ایسا لگا کہ کوئی شخص بارگاہِ الٰہی میں عرض و معروض کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! مجھے معلوم نہیں کہ تو مجھے آتشِ دوزخ میں جلا کر خاکستر کرے گا یا نجات دے گا۔ بہر صورت تیری مغفرت کا امیدوار ہوں، میرے گناہوں کو معاف فرما دے اور مجھے اپنی چادرِ رحمت میں چھپا لے۔ خواجہ حسن بصریؒ کا بیان ہے کہ اس آدمی کی گریہ وزاری اور رونے دھونے سے مجھے ایسا لگا کہ کوئی بہت ہی بڑا گنہگار ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کر رہا ہے۔ اس کی عاجزی و زاری سن کر میرا جی چاہا کہ اسے دیکھوں، جب وہ دعا، مناجات سے فارغ ہوا تو میں اس کے قریب ہوا، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ ہیں، میں ان کے قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا، امام! آپ کے نانا فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت، آپ کے والد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے آپ کی نسبت، آپ کی والدہ ماجدہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا ذریعہ آپ کی نجاتِ اخروی کے لیے بہت کافی سرمایہ ہے۔ اس کے باوجود صحنِ کعبہ میں اس قدر نالہ وزاری کرنے کا کیا سبب ہے؟ امام حسن مجتبیٰؓ نے فرمایا کہ حسن بصری! جس دن قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی وانذر عشیرتك الاقربين۔ اے رسول صلی اللہ علیک! آپ اپنے قریب ترین عزیزوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرائیں، میرے نانا جان نے میری والدہ فاطمۃ الزہراؓ کو فرمایا بیٹی! میں حشر کے دن کسی چیز کا مالک نہ ہوں گا۔ لہٰذا خود کو قیامت کے دن عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا۔ جس دن سے میں نے یہ بات سنی ہے۔ پریشان ہوں اور سوچتا ہوں کہ جب شافعِ اُمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عزیز ترین بیٹی کو عذابِ دوزخ سے ڈرایا ہے تو میں تو بیٹی کا بیٹا ہوں، اس لیے ہر آن اس سے خائف رہتا ہوں۔

حسن بصریؒ نے فرمایا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ کی یہ بات سُن کر میں چیخ پڑا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیٹی کو عذاب سے ڈرا رہے ہیں اور امام حسن جوانانِ جنت کے سردار، عذابِ الٰہی سے اس قدر خائف ہیں تو میں کس شمار وقطار میں ہوں۔

وہ بارگاہ بہت عالی بارگاہ ہے۔ اس کی گرفت سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی اطاعت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس بارگاہ میں اگر کوئی وقعت ہے تو عمل ہی کو وقعت ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ ـــــ سادگی

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بہت کچھ کھو کر اور بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد ایمان کی دولت حاصل کی تھی، اس لیے وہ اس دولت کو اپنے دل کے نہاں خانے میں بڑے اہتمام سے محفوظ رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ پاک نے ان کے قلب و نظر کو ایسی جلا بخشی تھی کہ دنیا اور دولتِ دنیا انہیں انتہائی بے وقعت اور ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مدینہ میں ایک یہودی کا غلام بن کر زندگی گزارنے والا شہر مدائن کا گورنر بن گیا۔ چار ہزار درہم ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ مگر سلمان فارسیؓ کی زندگی میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہی سادگی، مسکینی، وہی گلیم پوشی و فقر و استغنا۔ ماہوار تنخواہ کی کوڑی کوڑی غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے اور اپنی گزر اوقات کے لیے کھجور کی چٹائیاں بنا کر فروخت کرتے۔ اور اس سے جو کچھ یافت ہوتی، اپنے اخراجات پورے کرتے۔ ساری زندگی مکان نہ بنایا کہ ہر وقت آخرت کا گھر بنانے کی فکر دامنگیر رہتی۔ آپ کے پاس ایک عبا تھی اس کو آدھا بچھاتے اور آدھا اوڑھ لیتے۔ ایک دن اپنے اسی سادہ لباس میں سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ ایک امیر نے بازار سے آٹے کی بوری خریدی۔ اس نے آپ کا حلیہ دیکھ کر آپ کو غلام سمجھا اور بیگار میں پکڑ لیا۔ آٹے کی بوری آپ کے سر پر لاد دی اور کہا کہ میرے گھر پہنچا دو۔

آگے آگے امیر اور پیچھے پیچھے مدائن کے گورنر حضرت سلمان فارسیؓ۔ امیر آپ کو پہچانتا نہ تھا۔ لیکن جب لوگوں نے آپؓ کو اس حال میں دیکھا تو آپؓ کو روک لیا

اور کہا کہ حاکمِ شہر! لائیے یہ بوجھ ہم اٹھالیں۔ ظالم دولت مند نے یہ سنا تو بدحواس ہوگیا۔ آپ کے پاؤں پکڑ لیے اور معافی مانگنے لگا۔ کہا حضرت! یہ بوجھ سر سے اتار دیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے جواب دیا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اب تو میں یہ بوری تمہارے گھر تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ آخر حضرت سلمانؓ نے وہ بوری امیر کے گھر پہنچائی۔ امیر خوف سے کانپ رہا تھا۔ حضرت سلمانؓ فارسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا! ڈرو مت۔ صرف مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ آئندہ کسی غریب یا غلام کو بیگار میں نہیں پکڑو گے، کسی پر ظلم نہ کرو گے۔ امیر کی آنکھیں اشک بار تھیں اور نظریں جھکائے مدائن کے گورنر سے آئندہ ظلم نہ کرنے کا عہد کر رہا تھا۔

سیّدنا ابوبکر خدمتِ خلق

مدینہ کے نواحی علاقے میں ایک بڑھیا رہتی تھی جو لاوارث تھی اور اس قدر معذور تھی کہ اپنی ضروریات کو بھی پورا نہیں کرسکتی تھی۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد ہی اس کے گھر جاکر صفائی کر دیتے، مشکیزے میں پانی رکھ دیتے اور کھانے کا سامان اس کے پاس رکھ کر چلے آتے تاکہ بڑھیا کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اتفاقاً ایک دن جب اس کے گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بڑھیا کا کمرہ صاف ستھرا ہے اور اس کے مشکیزے میں پانی بھی موجود ہے اور ساتھ ہی کھانے کا سامان رکھا ہوا ہے۔

بڑھیا سے پوچھا مائی! یہ سارے کام کس نے کیے ہیں۔ بڑھیا نے کہا بیٹے، میں تو نابینا ہوں، ایک شخص تم سے پہلے آیا تھا اس نے کیا ہوگا میں سمجھی کہ تم ہو۔ اب تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور بھی چکرائے کہ آخر وہ کون آدمی ہے جو مجھ سے بھی پہلے بڑھیا کی خدمت کر کے چلا گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کل چھپ کر یہ دیکھوں گا کہ اس کارِ خیر میں سبقت لے جانے والا کون آدمی ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ذرا پہلے

ہی آگئے اور بڑھیا کے مکان کے نکڑ پر چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے یہ دیکھا کہ معذور بڑھیا کی خدمت میں سبقت لے جانے والا کوئی اجنبی آدمی نہیں تھا بلکہ امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جو کچھ ہی دنوں پہلے مسلمانوں کے امیر منتخب ہوئے تھے۔ جنہوں نے سمجھا تھا کہ امارت، شان و شوکت اور خدم و حشم کا نام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا امیر مسلمانوں کا خادم ہوتا ہے۔ سب کی خبر گیری کرنے والا، سب کی عزت و آبرو جان و مال کا پاسبان۔ وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے آگے جواب دہ تصور کرتا ہے۔

اور اس خیال سے لرزہ براندام رہتا ہے کہ قیامت کے دن جب احکم الحاکمین تختِ جلال پر رونق افروز ہوگا اور مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ جب تم پر رعایا کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی تو تم نے اس ذمہ داری کو کیوں نہیں پورا کیا۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے، ابوبکر! آپ نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے کتنا مشکل نمونہ عمل قائم کر دیا ہے۔

حضرت ربیعہ رضؓ کا ایک ہی سوال

کسی کے ساتھ پُر خلوص محبت اس کا ادب و احترام اور اس کی خدمت، رفتہ رفتہ دل میں جگہ بنا ہی لیتی ہے۔ اور یہ چیزیں کبھی نہ کبھی رنگ لا کر رہتی ہیں۔ ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہ کی بھی یہی حالت تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ وابستہ ہوئے تو جی جان سب ہار گئے۔ کوشش کرتے کہ اپنے اوقات کا بیشتر حصہ آپ کی صحبت اور قرب میں گزاریں۔ صحیح مسلم شریف کی ایک روایت میں انہوں نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں اکثر رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہتا تھا اور آپ کے لیے تہجد اور فجر کے وقت پانی لاتا اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا تھا۔ ایک رات دریائے رحمت جوش

میں تھا۔ تہجد کا وقت تھا۔ میں نے وضو کا پانی لاکر حاضرِ خدمت کیا تو انتہائی مسرت کے عالم میں رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے فرمایا "ربیعہ! کچھ مانگو"۔ ربیعہ کے لیے یہ لمحہ عجیب لمحہ تھا۔ پوچھنے والے تھے رحمۃ للعالمین و سیّد الاوّلین والآخرین صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ سوال تھا کچھ مانگو۔ کوئی دنیادار ہوتا تو اقتدار و دولت کا سوال کرتا۔ جام جمشید اور قیصر و کسریٰ کے محل کا مطالبہ کرتا۔ مگر یہاں تو حال ہی دوسرا تھا۔ ربیعہؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا "یا رسول اللہ صلّی اللہ علیک! میں آپ کے ساتھ جنت میں رہنا چاہتا ہوں"۔ آپؐ نے فرمایا "اور کچھ؟" میں نے عرض کیا۔ سرکار! مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ میرا تو بس یہی ایک سوال ہے۔ مثل مشہور ہے فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ اسی سوال سے اندازہ کیجیے ان قدسی نفوس صحابہ کرامؓ کی سوچ کا جن کے دل فیضان نبوّت سے آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو چکے تھے، اور جن پر دنیا اور دولت کی حقیقت واضح ہو چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ دنیا کی ساری دولت و عزت، شہرت و مرتبہ ڈوبتا ہوا سورج اور ڈھلتی ہوئی چھاؤں ہے۔ بے حقیقت و ناپائدار۔ آج ہے کل نہیں۔ اصل راحت اور حقیقی عزت آخرت کی راحت و عزت ہے، جس میں ملال کا کوئی شائبہ ہے نہ زوال کا۔ اس لیے اپنے سوال پر ڈٹے رہے کہ "آقا! میں تو جنت میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "ربیعہ جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو نماز کی کثرت سے میری مدد کرو۔ یعنی اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو ذوق و شوق سے خدا کی عبادت کرو، کثرت سے نماز پڑھو کیونکہ بغیر اس کے جنت میں میرا ساتھ نہیں ہو سکتا۔

خوفِ خُدا

اللہ کا خوف ہی حکمت کی بنیاد ہے۔ انسانیت کے تمام فسادات بلکہ تمام گناہوں کی جڑ صرف خوفِ خدا کا نہ ہونا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے انعامات' اس کی رضا اور قرب کے لالچ میں عبادت کرتا ہے اور اس کے خوف اور ناراضی کے ڈر کے سبب گناہوں سے بچتا ہے جس دل میں خدا کا خوف نہیں، خیر و شر اور نیکی و بدی کا اس کے نزدیک کوئی معیار ہی نہیں۔ ایک رات حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی اہلیہ کی جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں ہے اور سر جھکائے مصلّے پر بیٹھے ہیں۔ بیوی نے پوچھا عبداللہ! کیوں رو رہے ہو۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے بیوی! سوچتا ہوں کہ جہنم کے اوپر پل صراط ہوگا۔ اور اس پر سے گزرنا ہی پڑے گا۔ نہ معلوم اسے پار بھی کر سکوں گا کہ نہیں۔ اسی خیال نے مجھے بے چین و مضطرب کر رکھا ہے۔ یہ سن کر بیوی بھی شوہر کے ساتھ رونے میں شریک ہوگئیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہیں شرفِ صحابیت حاصل تھا، جنہوں نے سیکڑوں اور ہزاروں نمازیں سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ادا کی تھی۔

ایمان کی حالت میں اس ایمانِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ سرد و گرم حالات میں آپؐ کے ساتھ رہے۔ آپؐ کی اطاعت و فرماں برداری ہی کو اپنی معراجِ حیات اور جینے کا مقصد قرار دیا۔ اور پھر حالت ایمان میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ مگر خوف کا عالم یہ ہے کہ ہر وقت لرزاں و ترساں ہیں یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ بابرکت کا فیض تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرتی ہے۔ اور جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے، اسے ہر چیز ڈراتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا جس آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو کا قطرہ بہے اور اس کے چہرے پر ٹپکے، اللہ تعالیٰ اس کے چہرے پر جہنم

کی آگ کو حرام کر دیتا ہے - ایک دن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:
سرکار! آپ کی اُمت میں کوئی ایسا بھی ہے جو بے حساب وکتاب جنت میں جائے۔ آپؐ نے فرمایا "ہاں! وہ شخص بے حساب وکتاب جنت میں جائیگا جو تنہائی میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے روتا رہا ہو۔

عبداللہ بن عباسؓ اور مسلمان سے ہمدردی

رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا۔ آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا عشرہ ہوتا ہے۔ ان آخری دس دنوں میں افضل ترین عبادت اعتکاف ہے۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کے گھر میں اس کے دروازے پر پڑے رہنا کہ مغفرت و بخشش کا پروانہ لے کر ہی گھر لوٹوں گا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اعتکاف کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ بہاروں کے دن اور مرادوں کی راتیں۔ تلاوت، نوافل اور ذکر الٰہی کا شغل تھا۔ عبد و معبود اور بندہ و مولا کے درمیان راز و نیاز کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن ٹھیک اشراق کے بعد ایک شخص سراسیمہ اور پریشان حال مسجدِ نبوی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تلاش کرتا ہوا آیا اور ان سے ملاقات کر کے عرض کی، حضرت! میں تو سخت مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اگر آپ فلاں شخص کے پاس بنفسِ نفیس تشریف لیجا کر صلح نہ کرائیں گے تو سمجھیے کہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میرے بعد ان کی دیکھ بھال کرنے والا بھی سوا خدا کے کوئی نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اعتکاف میں ہیں اور مسجد سے بغیر عذرِ شرعی نکل جانے پر آپ کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا، مگر میں کیا کروں! اگر سخت پریشانی میں نہ ہوتا تو میں ہرگز آپ سے

یہ درخواست نہ کرتا۔

اور کوئی ہوتا تو سائل سے معذرت کر لیتا یا جھڑک کر اسے بھگا دیتا مگر ابن عباسؓ آغوشِ نبوت کے پروردہ تھے، اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سائل کے ساتھ اس کی سفارش کرنے چلے گئے۔ اعتکاف ٹوٹ گیا۔ واپسی پر ایک شخص نے ٹوکا کہ حضرت آپ نے تو اپنا اعتکاف باطل کر دیا۔ فرمایا کم عقل آدمی میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مسلمان کے دکھ کو دور کرنا میرے ساتھ مسجدِ نبوی میں دس سال اعتکاف کرنے کے برابر ہے۔ تو کہتا ہے کہ میرا اعتکاف باطل ہو گیا۔ ارے بندہ خدا! مجھے تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجدِ نبوی میں دس سال اعتکاف کرنے کا ثواب مل چکا ہے۔

صحابہؓ کی نگاہ میں دُنیا کی بے وقعتی

اسکندریہ کے قبطی حکمران نے جو چال چلی تھی اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ چال ضرور کامیاب ہو گی۔ مال میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ سونے اور چاندی موتی اور جواہرات کی چمک دمک کے سامنے بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر اس نے یہ سمجھا تھا تو غلط نہیں سمجھا تھا۔ اسکندریہ کی فتح کی مہم جاری تھی اور اسلامی افواج اس شہر کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑی ہوئی تھیں۔ اسکندریہ کے بادشاہ نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے سرداروں سے کہا کہ ایک عمدہ خچر لے آؤ۔ خچر لایا گیا تو اس پر سونے، یاقوت اور جواہرات سے مرصّع زین کسوائی۔ پھر سنہرے تار سے تیار شدہ لگام اسے لگائی۔ سچے موتیوں کے نہایت قیمتی ہار خچر کے گلے میں ڈالے اور اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس خچر کو لے جاؤ اور اسے مسلمانوں کے لشکر کی طرف چھوڑ آؤ۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ جب یہ خچر مسلمانوں کے لشکر میں چلا جائے گا تو دنیوی مال و متاع کی محبت ان پر غالب آ جائے گی، پھر ان پر

غلبہ حاصل کرنا آسان ہوگا۔

خچر جب اسلامی لشکر میں پہنچا تو رات کا وقت تھا اور حضرت شرجیل ابن حسنہ رضی اللہ عنہ، لشکر کی نگہبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ خچر کی زیب و زینت اور اس پر لدے ہوئے زر و جواہر کو دیکھ کر اس کی طرف لپکنے کی بجائے جناب شرجیل ہنس پڑے اور فرمایا، خدا کے دشمن ہمارا امتحان لینا چاہتے ہیں کہ ہم دنیا کے طالب ہیں یا آخرت کے۔ خدا کی قسم جس دن سے ہمارے سینے ایمان کے نور سے منور ہوئے ہیں، ہمارے اندر کوئی مسلمان ایسا نہیں جو فانی چیزوں کی طرف توجہ کرے۔ ہماری نگاہ میں سونے کا ڈلا اور مٹی کا ڈھیلا برابر ہے، اس لیے کہ ہماری نگاہ باقی اور ہمیشہ رہنے والی چیز پر ہے۔ یہ فرمایا اور خچر کی لگام کو پکڑ کر قبطیوں کے لشکر میں چھوڑ دیا۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ جب چلتی پھرتی رشوت لوٹ کر غیر مسلموں کے لشکر میں پہنچی۔ یہ دیکھ کر قبطی بادشاہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ اسنے کہا خدا کی قسم اس قوم کو آسمان کے نیچے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ اس قوم کا ایک مقصد ہے، اور اپنے مقصد کے ساتھ اس کو عشق ہے۔ دنیا کی کوئی ہوس اور مال و دولت کی کوئی طمع اس کو اس کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔ مسلمانوں نے آخر کار اسکندریہ پر اسلامی پرچم لہرایا اور وہاں کے غریب عوام کو جو صدیوں سے ظلم و جور کی چکی میں پس رہے تھے نجات دلائی۔

امام حسن رضؓ اور جود و سخا

شوہر کی حالت دیکھ کر بیوی بہت پریشان تھیں۔ جتنے وہ ان دنوں چپ چپ سے رہنے لگے تھے کبھی ایسے نہ تھے۔ آخر ڈرتے ڈرتے انہوں نے دریافت کر ہی لیا: امام! آپ کو کیا پریشانی لاحق ہے میں نے آپ کو اس طرح کبھی نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا: بیوی! میرے پاس ایک لاکھ درہم جمع ہو گئے ہیں سمجھ میں

نہیں آتا کہ کیا کروں۔ نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو نیند۔ اگر خدانخواستہ اس دوران میں مجھے موت آجائے تو میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ میں تو ایسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ ہوں کہ ایک مرتبہ ان کے پاس بڑی مقدار میں مال آگیا تھا، دن بھر لوگوں میں تقسیم کرتے رہے۔ نماز کا وقت آجاتا تو نماز ادا فرماتے اور پھر تقسیم کرنے میں مصروف ہو جاتے۔ یہاں تک کہ عشا کی نماز ہو گئی۔ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت فرمایا کہ سارا مال ختم ہو گیا یا کچھ بچ رہا ہے۔ بلالؓ بھی تھک گئے تھے عرض کیا حضورؐ! تھوڑا سا مال رہ گیا ہے۔ آپؐ اس وقت جا کے آرام فرمائیں، بقیہ مال کل صبح تقسیم ہو جائے گا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں بلال! ایسا نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کے حق کا مال یہاں پڑا ہوا رہے میں گھر میں جا کر آرام کروں آج رات میں مسجد ہی میں قیام کروں گا۔ کل صبح مال تقسیم کر کے جاؤں گا۔

آپؐ رات بھر مسجد میں ٹھہرے۔ دوسرے دن صبح کو مال تقسیم کر کے گھر واپس تشریف لائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت سعدیؓ بنت عوف نے مشورہ دیا کہ آپ بھی کل صبح اپنے قریبی اعزّہ کو بلائیں اور ان کے درمیان یہ ایک لاکھ درہم تقسیم کر دیں۔ دوسرے دن صبح امام حسن رضی اللہ عنہ کی پریشانی دور ہو گئی، وہ مال تقسیم ہو گیا۔ جس وقت مال تقسیم ہو رہا تھا، امام حسنؓ کی بیوی ان کے پیراہن پہ پیوند لگا رہی تھیں۔

اسلامی اخوّت

مہاجرین مدینہ میں بالکل بے سر و سامان آئے تھے۔ اگرچہ ان میں کچھ دولت مند لوگ بھی تھے مگر چونکہ وہ کافروں سے چھپ کر مکہ سے نکلے تھے۔ اسلئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہ لا سکے تھے۔ اس میں تو انصارِ مدینہ کے گھر ان کے مہمان خانہ بنے رہے لیکن ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

خیال فرمایا کہ مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے درمیان محض دین کی بنیاد پر رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے۔ یہ اقدام تاریخِ عالم میں مثالی اور اوّلین اقدام تھا۔ آپؐ نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنا دیا، اور اب وہ ایک دوسرے کے حقیقی بھائی کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھے۔ انصار اپنے مہاجر بھائیوں کو اپنے اپنے گھر لے گئے اور گھر کے ایک ایک سامان کا جائزہ دینے کے بعد کہا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ آپ کا خون دوسرا اور ہمارا دوسرا ہے۔ آپ کا وطن دوسرا اور ہمارا دوسرا ہے۔ آپ کا ذریعۂ معاش دوسرا اور ہمارا دوسرا ہے۔ آپ کی معاشرت دوسری اور ہماری دوسری ہے۔ لیکن چونکہ آپ کا خدا وہی ہے جو ہمارا ہے، آپ کا رسولؐ وہی ہے، جو ہمارا ہے، آپ کا قبلہ وہی ہے، جو ہمارا ہے، آپ کا قرآن وہی ہے جو ہمارا ہے اس لیے ہم صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ہمارے نخلستان آپ کے ہیں۔ ہمارے کھیت کھلیان میں آپ کا آدھا حصہ ہے، حتیٰ کہ اگر آپ غیر شادی شدہ ہیں اور ہماری دو بیویاں ہیں تو ہم ایک کو طلاق دے دیتے ہیں آپ اس سے عقد کر لیں۔ مہاجرین نے کہا "آپ کے خلوص کا شکریہ مگر ہمیں کھیتی باڑی کا کوئی تجربہ نہیں ہے' اس لیئے ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ انصار نے کہا "بیشک آپ کھیتوں میں کام نہ کریں، کام ہم کریں گے، پیداوار آدھی آدھی تقسیم ہو جائے گی۔ یہ صورتِ حال ہو گئی کہ یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تو اس کی جائداد و مال مہاجر کو ملتا۔ چشمِ فلک نے ایسی محبت، اخوت اور بھائی چارے کا معاشرہ صرف ایک بار دیکھا ہے۔ اور اس کے بعد سے آج تک اس کی آنکھیں ایسا معاشرہ دیکھنے کا انتظار کر رہی ہیں بلکہ اب تو پتھرانے لگی ہیں؛ اس وقت تو بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ ایک دوسرے کے محلّے جلا رہے ہیں اور جلتے ہوئے مکانوں میں کلمہ گو مسلمانوں کے بچوں کو جھونک رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بازی مار لی۔ نہ جانے یہ حال جان کر رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی!

ابنِ عباسؓ اور سجدۂ نماز

شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کسی مقام پر تنگی نہیں ہے۔ وضو کر سکتے ہو وضو کرلو۔ اگر کسی شدید بیماری کے سبب یا کسی عذرِ شرعی کے باعث نہیں کر سکتے تو تیمم کرلو۔ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں تو لیٹے لیٹے ہی اشارے سے نماز ادا کرلو۔ حج کے وسائل و ذرائع ہیں اور کوئی مانع شرعی موجود نہیں تو حج کرو اور اگر کوئی شرعی عذر ہے تو نہ کرو کوئی گناہ نہیں۔ غرضکہ شریعت کسی بھی مقام یا حاجت میں انسان کو دشواری میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی۔ سیدھی سادی عالمگیر اور ہمہ گیر شریعت ہے جو ہر ملک، ہر برِاعظم اور ہر ماحول میں زندگی گزارنے والوں کے لیے ہر دور میں قابلِ عمل ہے۔ یہ احکام تو احکامِ رخصت ہیں جو مجبوری کے عالم میں فوراً تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر کچھ لوگ اصحابِ عزیمت ہوتے ہیں جو آخرت کے ثواب کو کسی دنیوی مجبوری کے سبب شریعت کی اجازت کے باوجود ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ جلیل القدر مرتبے والے لوگ ہیں جن کا دیکھنا عبادت اور جن کا کلام بیمار دلوں کے لیے دارو ئے شفا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں موتیا بند کا پانی اتر آیا۔ ان کے زمانے میں کئی آنکھ بنانے والے اور آپریشن کرنے لوگ لوگ تھے۔ انہوں نے اُن کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور کہا کہ حضور! ہم آپ کی آنکھیں بنا دیں گے۔ تفسیر درِ منثور میں جلال الدین سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے دریافت فرمایا کہ مجھے کن کن چیزوں سے پرہیز کرنا ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ پرہیز کوئی خاص نہیں، صرف چار پانچ دنوں تک زمین پر سجدہ کرنے کے بجائے کسی اونچی سی تپائی پر سجدہ کرنا ہوگا کیونکہ زمین پر سجدہ کرنے میں اندیشہ ہے کہ آنکھوں پر زور پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم! مجھے تو ایک رکعت

بھی اس طرح منظور نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو شخص جان بوجھ کر ایک نماز بھی چھوڑ دے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کرے گا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اس سے ناراض ہوں گے۔ یہ فرمایا اور آنکھیں نہ بنوائیں۔ ساری زندگی نابینا رہے۔ یہ منظور تھا، مگر پانچ دن کی نمازوں کے سجدے نامکمل کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، یہ ان سے پوچھیے جو اس سے محروم ہیں، پھر ان عاشقانِ باوفا کا تصور کیجیے جنہوں نے مکمل سجدے کی خاطر اپنی بینائی کو قربان کر دیا اور صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

سیدنا ابوبکرؓ اور عشقِ نبویؐ

حرم کعبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز ادا فرما رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے میں چادر لپیٹ کر اسے بل دینا شروع کیا۔ سخت تکلیف کا عالم تھا۔ گلے کی پھانس کی وجہ سے آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کسی نے اطلاع دے دی۔ دیوانہ وار بھاگے آئے۔ اور کفارِ مکہ سے کہا لوگو! تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہتا ہے۔ کیا یہ کوئی جرم ہے۔ کیا اس نے کسی کا کچھ بگاڑا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ ظالموں کا یہ گروہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر ابوبکرؓ پر ٹوٹ پڑا اور آپ کو بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ ابوبکرؓ پر مار پڑ رہی تھی مگر ان کا دل مقامِ طمانیت پر فائز تھا کہ میں مضروب سہی، زخمی و رنجور سہی مگر میرے محبوبؐ تو ان کے ظلم و تعدی سے محفوظ ہیں۔ اتنی سخت چوٹیں آئیں کہ جناب ابوبکرؓ بے ہوش ہو گئے۔ لوگ اٹھا پٹھا کر انہیں ان کے گھر لے گئے۔ گھنٹوں بے ہوش رہے۔ سارا چہرہ چوٹ کی وجہ سے ورم کر آیا تھا۔ بازو، کمر، ٹانگوں سب پر چوٹ آئی تھی۔ بدن ہلانا دشوار تھا کہ ابوبکرؓ نے آنکھیں کھولیں۔ ماں سرہانے کھڑی تھی۔ پانی کا پیالہ

ہونٹوں کے قریب لے گئی۔ ابو بکرؓ نے منہ پھیر لیا۔ دودھ کا گلاس قریب کیا ابو بکرؓ نے منہ پھیر لیا۔ ماں نے دریافت کیا بیٹا کیسے ہو۔ ماں کو جواب دینے کے بجائے ابو بکرؓ نے اس نے سوال کیا کیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ماں! مجھے تو یہ بتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں۔ میرے دل کے قرار، میرے باطن کے نور، میرے آقا میرے حبیب و محبوب باطن اور میرے مرکزِ نگاہ کیسے ہیں۔

ماں نے کہا بیٹے! آپ بخیر ہیں۔ مگر ابو بکرؓ کو سکون کہاں۔ فرمایا "مجھے انؐ کے پاس لے چلو" لوگوں نے کہا تم سخت زخمی ہو۔ اس حالت میں چل کیسے سکتے ہو۔ ابو بکرؓ نے کہا مجھے سہارا دو۔ جیسے تیسے میں ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اپنی آنکھوں سے انہیں صحیح سلامت دیکھ لوں گا تو اپنا سارا دکھ درد بھول جاؤں گا۔ میری جان، میرا مال، میرے ماں، باپ، آل واولاد سب ان پر قربان۔ وہ سلامت ہیں تو سب سلامت ہے۔ غرضیکہ کسی طرح ابو بکر صدیقؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو صحیح و سلامت دیکھ کر اپنا درد وغم بھول گئے۔ معراج کا موقع آیا۔ آپؐ نے کفارِ مکہ سے واقعۂ معراج بیان کیا تو کفار آپ کو جھٹلانے لگے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ابو جہل کی زبانی واقعۂ معراج سنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنے بغیر آپ کی تصدیق فرمائی تو آپ کو بارگاہِ نبوت سے "صدیقِ اکبر" کا لقب ملا۔ مہر وفا اسے کہتے ہیں کہ زندگی بھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے، وفات کے بعد آپؐ کے پہلو میں آرام فرما ہیں۔

اور انشاء اللہ حشر کے دن آپ کے ساتھ اٹھیں گے۔ ع

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے

سیّدنا ابوبکرؓ کا کفن

بیعتِ خلافت کے بعد مسجد نبوی میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا تھا، وہ نہ صرف تاریخ اسلام میں بلکہ تاریخ عالم میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ فرمایا "لوگو! خدا کی قسم میں نے کبھی ایک دن یا رات بھی امارت کی خواہش نہیں کی تھی، نہ ہی اپنے اندر اس کی ہلکی سی خواہش رکھتا تھا، نہ میں نے خفیہ یا علانیہ اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کیا تھا، یہ خلافت میرے لئے کسی درجے میں بھی سامانِ راحت ہے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو کہ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ جب تک میں سیدھے راستے پر چلوں، میری پیروی کرنا۔ اور اگر میں صراطِ مستقیم سے بھٹکنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دینا۔"

صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ خلافت کے دوران کبھی بھی راہ مستقیم سے نہیں ہٹے یہاں تک کہ دو سال چند مہینوں کے بعد سردی کی ایک رات میں غسل فرمالیا اور شدید بخار میں مبتلا ہو گئے۔ بخار جان ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ کسی نے کہا کہ طبیب کو دکھائیے۔ فرمایا "میں نے طبیبِ حقیقی سے مشورہ کر لیا ہے۔ اب مجھے کسی دنیوی طبیب کی ضرورت نہیں"۔ وقتِ آخر آن پہنچا تو اپنی چہیتی بیٹی سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو بلایا۔ فرمایا "بیٹی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟" انہوں نے جواب دیا سحول کپڑے کی تین چادروں میں۔ فرمایا "بیٹی! ایک تو یہی چادر لے لینا جو میں اوڑھے ہوئے ہوں، اسے دھولینا اور دو اور چادریں لے کر اس میں ملا کر مجھے کفنا لینا۔ سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: "بابا! یہ تو بہت پرانی اور بوسیدہ چادر ہے، اسے لے کر کیا کروں گی"۔ فرمایا "بیٹی! نئی چیزوں کے زندہ لوگ مردوں سے زیادہ حقدار ہوتے ہیں"۔

کفن تو آخر کار لہو اور پیپ ہی کے لیے ہے۔ وفات کے بعد امیر المومنین سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وصیت پوری کی گئی۔ لوگ رو رہے تھے کہ یارِ غارِ رسولؐ رخصت ہو گئے۔ خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ نے آنکھیں موند لیں۔ شام کا وقت تھا۔ دروازے سے لگی ایک یتیم بچی اس لیے رو رہی تھی کہ اُمتِ مسلمہ کا حکمران رخصت ہو گیا۔ اب ہر روز شام کو میری بکریاں کون دوہے گا کیونکہ خلیفہ بننے سے پہلے بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی بکریاں دوہا کرتے تھے اور خلیفہ بننے کے بعد بھی ان کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

حضرت علیؓ کی فراستِ ایمانی

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک نہایت پیچیدہ مقدمہ پیش ہوا۔ دو شخص ایک عورت کے پاس آئے اور ایک سو اشرفیاں اس کے پاس امانت رکھیں۔ اور کہا کہ جب تک ہم دونوں تیرے پاس نہ آئیں یہ اشرفیاں نہ دینا۔ امانت رکھ کر دونوں چلے گئے۔ ایک سال کے بعد ان میں سے ایک شخص آیا اور عورت سے کہنے لگا کہ میرا ساتھی تو مر گیا، اس لیے ہماری اشرفیاں لوٹا دے۔ عورت نے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ امانت رکھتے وقت دونوں نے کہا تھا کہ جب تک ہم دونوں تیرے پاس نہ آئیں، اشرفیاں نہ دینا۔ اس آدمی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ یہ عورت امانت میں خیانت کرنا چاہتی ہے اور عورت کے اہلِ قبیلہ کو جمع کر لیا۔ تمام لوگوں نے کہا کہ اب جبکہ اس کا ساتھی مر چکا ہے، دونوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں اس لیے تو اشرفیاں دے دے۔ عورت بیچاری دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اہلِ قبیلہ کے اصرار پر مجبور ہو گئی اور سو کی سو اشرفیاں اس کے حوالے کر دیں اس کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا دوسرا ساتھی جس کے بارے میں اس کے ساتھی نے کہا تھا کہ مر گیا ہے، آگیا اور عورت سے اپنی اشرفیوں کا مطالبہ

کرنے لگا۔ عورت نے جواب دیا کہ تمہارے ساتھی نے آکر بیان کیا تھا کہ تم مرگئے ہو۔ اس لیے میں نے وہ اشرفیاں تمہارے ساتھی کو دے دی ہیں۔ اب میں تم کو کہاں سے دوں۔ یہ مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس وقت مدینہ کے قاضی تھے، اس لیے حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہ مقدمہ حضرت علیؓ کے پاس بھیج دیا۔ مدعی اور مدعٰی علیہ کے بیانات سننے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سمجھ گئے کہ ان دونوں نے اس عورت کے ساتھ جعل سازی کی ہے۔ لیکن اگر آپ فوراً یہ فرما دیتے کہ تم دونوں نے مل کر جعل سازی کی ہے تو مدعی مانتا نہیں۔ سیدنا علی مرتضیٰؓ نے مدعی سے فرمایا کیا تم دونوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ جب تک ہم دونوں ایک ساتھ نہ آئیں، اشرفیاں نہ دینا۔ اس نے کہا جی ہاں، ہم نے یہ کہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا "تمہاری سو اشرفیاں میرے پاس ہیں، جاؤ اپنے ساتھی کو لے کر آؤ، ہم تمہارا مال تمہارے حوالے کر دیں گے۔"

جھوٹے مدعی کو تو دن میں تارے نظر آنے لگے کیونکہ مولا علیؓ کے ایک ہی جملے نے ان دونوں کی جعل سازی کے تانے بانے کو بکھیر دیا تھا۔ شاید اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

علی المرتضیٰؓ اور ایک مقروض

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی کا جنازہ لایا گیا۔ آپؐ جنازے کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور اپنی عادت کے مطابق حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اس میت پر کسی کا قرض تو نہیں ہے؟ حاضرین میں سے ایک صحابیؓ آگے بڑھے اور عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنے دینار میرے اس کے ذمے باقی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کے وارث سے دریافت فرمایا، تم اس کا قرض ادا کر دو

گے؟ اگر وعدہ کرو تو میں اس کی نماز جنازہ پڑھا دوں گا۔

میت کے بیٹے نے کہا، "حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) میری کئی ایک سیانی اور کنواری بہنیں بیاہنے کو باقی ہیں میرے پاس تو ان کی شادی کے اخراجات بھی نہیں ہیں میں کہاں سے ادا کر سکوں گا؟ میرے باپ نے تو قرض کے سوا کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے" چونکہ قرض حق العباد ہے اس لیے کسی صورت میں بھی معاف نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے ادا نہ کر دیا جائے یا قرض دینے والا معاف نہ کر دے۔ آپ پیچھے ہٹنے لگے کیونکہ یہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ مقروض کی نماز جنازہ ادا نہیں فرماتے تھے آپ نے اعلان فرمایا، "تم میں سے کوئی آدمی اس کا قرض ادا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے" مجمع دم بخود تھا کیونکہ محنت کش اور غریب عوام کا مجمع تھا مجبوراً آپ پیچھے ہٹنے لگے اور فرمایا، کہ "تم لوگ نماز پڑھا دو" یہ ایک بہت بڑی سعادت تھی جس سے میت محروم ہو رہی تھی کہ ایک آواز آئی "حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کا قرض اپنے ذمہ لیتا ہوں پیوند زدہ کپڑے، غبار آلود بال شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کھڑے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں محنت مزدوری کر کے میت کا قرض ادا کر سکتا ہوں۔۔۔۔

آپ نماز جنازہ ادا فرمائیں" حضور صلی اللہ و علیہ وسلم مسکرا کر آگے بڑھے کہ آخر شیر خدا شیر خدا ہی ہوتا ہے پہاڑ ٹل تو ٹل جائے یہ اپنے وعدے سے نہیں ہٹ سکتا۔ نماز جنازہ ادا فرمائی۔ اور میت کے ساتھ ساتھ علی کرم اللہ وجہہ کے لیے بھی دعا فرمائی۔

عمرؓ۔ نبوت کا کمال

جب ایک مقدمے کا دو ٹوک فیصلہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دربار خلافت میں کیا۔ تو لوگ ان کی بصیرت، معاملہ فہمی اور فراست ایمانی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک آدمی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، "عمرؓ تم کتنے لائق، عالم اور سمجھدار ہو" جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کا یہ جملہ سن کر تلملا اٹھے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا، "لوگو! ذرا اس بے وقوف کو دیکھو کہ عمرؓ کی اتنی

تعریف کر رہا ہے، حالانکہ یہ کمال عمرؓ کا نہیں ہے ---------

خطاب کا یہ بیٹا عمرؓ تو زمانہ جاہلیت میں مکہ کی عورتوں کے پاس جا کر یہ درخواست کیا کرتا تھا کہ چند پیسوں کے عوض میں تمہاری بکریاں چرا دیا کروں گا -------

مکہ کی عورتیں مجھے اپنی بکریاں چرانے کے لیے نہیں دیتی تھیں اور کہا کرتی تھیں۔ کہ عمرؓ تم بہت بدمزاج آدمی ہو۔ کہیں غصے میں آکر ہماری بکریوں کو مار دو گے۔ تو ہمارا سخت نقصان ہو جائے گا۔ عجیب بات ہے۔ کہ وہ عمرؓ جو کل بکریوں کو چرانے کا اہل نہیں تھا۔ آج قوموں اور ملتوں کو چرا رہا ہے۔ یہ بے وقوف یہ سمجھتا ہے۔ کہ یہ عمرؓ کا کمال ہے۔ حالانکہ یہ کمال اس کالی کملی والے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔ جنہیں قتل کرنے کے ارادے سے ننگی تلوار لے کر میں گھر سے نکلا تھا۔ مگر اس فیضان نظر کو کیا کہیے کہ قاتل عمرؓ جب گیا تھا۔ تو قاتل بن کر گیا تھا، اور لوٹا تو فاروق اعظم بن کر لوٹا۔

؎ عمرؓ سوئے نبی گئے، نظر سوئے عمرؓ گئی
پڑی نگاہِ مصطفےؐ تو زندگی سنور گئی

باب ۴

حکومت اور حکّام

خلیفۂ اوّل اور خدمتِ خلق

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک جانکاہ صدمہ تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ کی ہمت ٹوٹ گئی تھی کسی کو ہوش نہ تھا اگر اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ استقامت کا مظاہرہ نہ فرماتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ مگر صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا تشریف لانا اور منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمانا کہ "لوگو! تم میں سے جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا، اسے جان لینا چاہیے کہ اس کے معبود کی وفات ہو گئی۔ اور تم میں سے جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، اسے جان لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ حیّ و قیّوم ہے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جملے نے صحابہ کرامؓ کی آنکھیں کھول دیں۔

گمشدگانِ راہ کو نشانِ منزل ملا۔

ڈولتی ہوئی کشتی کو لنگر میسر آیا اور گھٹا ٹوپ تاریکی میں امید کی کرن نمودار ہوئی پھر مسئلہ خلافت کا درپیش ہوا اور ثقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان ہونے کے بعد لوگوں کو اطمینان میسر آیا اور لوگ خوش ہو گئے۔ مگر ایک یتیم لڑکی دوڑی ہوئی خلیفہ کے پاس آئی اور بہت غمزدہ انداز میں کہا: "ابو بکرؓ! اب تو آپ خلیفہ ہو گئے ہیں، اب ہماری بکریوں کو کون دوہے گا؟ آپ روزانہ شام کو ہمارے گھر آ کر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ اب دیکھیے ہمارا کیا بنتا ہے"۔ حضرت ابو بکرؓ قیصر و کسریٰ کے جانشین نہیں تھے کہ اپنے عشرت کدے سے نکلنا گوارا نہ کرتے، فرمایا کہ بیٹی تو نہ گھبرا میں خلیفہ بن گیا تو کیا مجھ میں لعل ٹنک گئے، میرا معمول جاری رہے گا کیونکہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے اور یتیموں بیواؤں کی خدمت تو عین عبادت ہے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہونے کے باوجود دورانِ خلافت نہایت پابندی سے بکریاں دوہنے کی یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ لیکن جس دن

ان کی وفات ہوئی، کوئی رو رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یارِ غار ہم سے رخصت ہو گیا۔ کوئی اس لیے رو رہا تھا کہ مملکت اسلامیہ کو قرار و استحکام بخشنے والا رخصت ہو گیا۔ کوئی اس لیے غمزدہ تھا کہ جامع قرآن دنیا سے سفر کر گیا اور وہ یتیم بچی غم و اندوہ کی تصویر بنی ہوئی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کی چوکھٹ پکڑے اس لیے رو رہی تھی کہ اب میری بکریاں کون دوہے گا۔ یتیموں کا والی اور بیواؤں کا وارث تو دنیا سے منہ موڑ کر چلا گیا تھا۔

مسلم حکمران کا کردار

حاجیوں کا قافلہ مکہ معظمہ کی طرف جا رہا تھا کہ صحرا میں ایک بوڑھے نے قافلے کو روک کر دریافت کیا کہ تمہارے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ اور جب اسے آپ کے وصال کی اطلاع ملی تو زار و قطار رونے لگا۔ قافلے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ لوگوں نے بوڑھے کو بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور جب ان کی بھی وفات ہو گئی تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ بوڑھا جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ملا اور بتلایا کہ میرا نام ابو عقیل ہے، مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام دی تھی اور میں آپ کے دستِ مبارک پر ایمان لایا تھا۔ مجھے آپ نے اپنا جوٹھا ستّو بھی پلایا تھا اس کا اثر یہ ہے کہ میں اب بھی بھوک اور پیاس کے عالم میں اس کی سیری و سیرابی کو محسوس کرتا ہوں۔ قبول اسلام کے بعد بکریوں کا ایک گلہ لیکر صحرا میں چلا آیا۔ اسے چراتا اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرتا تھا۔ میں نماز پڑھتا ہوں اور روزہ رکھتا ہوں مگر اس سال ایسی وبا آئی کہ ساری بکریاں مر گئیں ایک زندہ بچی تھی اسے بھیڑیا اٹھا لے گیا۔ فریادی ہوں۔ آپ میری دستگیری فرمائیں۔ خلیفہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ میں چل رہا ہوں۔ آگے پانی کا

چشمہ ہے وہاں مجھ سے ملاقات کرو۔ چشمہ پر پہنچ کر آپ اونٹنی کی لگام پکڑے بوڑھے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب بوڑھا نہ پہنچا تو آپ نے چشمہ کے محافظ کو حکم دیا کہ بوڑھا آئے تو اس کی اور اس کے اہل و عیال کی کفالت کرنا۔ حج سے واپسی پر میں اس کا مستقل انتظام کر دوں گا۔ حج سے واپسی پر سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حسب وعدہ چشمہ پر پہنچے تو وہاں سوائے بوڑھے ابو عقیل کے سب لوگ موجود تھے۔ دریافت کرنے پر چشمے کے محافظ نے بتایا کہ آپ کے جانے کے تیسرے دن بوڑھا ابو عقیل آیا تھا۔ اسے سخت بخار تھا تین دنوں کے بعد اس کی وفات ہو گئی۔ خلیفہ زار و قطار روتے ہوئے اس کی قبر پر تشریف لے گئے کہ میں ایک ایسے صحابی کی خدمت نہ کر سکا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوٹھا ستّو پیا تھا۔ پھر اس کے اہل و عیال کو اپنے ساتھ مدینہ منورہ لے گئے اور تادم آخر ان کی کفالت کرتے رہے کہ مسلمانوں کا حکمران مسلمانوں کا خادم ہوتا ہے۔ مخدوم نہیں۔

ابو عبیدہؓ اور اسلامی اخوت و مساوات

لشکر اسلام فتح پر فتح اور کامرانی پر کامرانی حاصل کرتا جا رہا تھا۔ ایرانی حیران تھے کہ آخر وہ عرب بدو جنہیں ہم اپنے دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھانا بھی گوارا نہ کرتے تھے آج اتنے ترقی یافتہ، پرجوش اور مہذّب کیسے بن گئے کہ ان کے سیل رواں کو روکنا ایرانی افواج کے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ یہ وہی تو اونٹوں کے گلہ بان ہیں جن کی طرف سے اگر کبھی شورش ہوتی تو ہم سرحدی علاقوں کے گورنروں کو ہدایت کر دیتے اور وہ انہیں مار پیٹ کر دو چار دنوں میں ٹھنڈا کر دیتے۔ لیکن اب یہ طوفان ہیں۔ ایسا طوفان جس کی طاقت کے سامنے ایوان کسریٰ خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا ہے۔ اور ہزار سالہ کیانی اقتدار کا سورج غروب ہو رہا ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراحؓ اس وقت لشکر اسلام کے سپہ سالار تھے جب مفتوحہ ایرانی شہر کے

معززین نے ان کی دعوت کی فاتح سپہ سالار کی شخصیت معمولی نہیں ہوتی اس لیے دعوت کا اہتمام بھی شاندار طریقے پر کیا گیا۔ ایک سے ایک برتن لائے گئے۔ پرتکلف کھانے تیار کیے گئے اور مجلس طعام کچھ اس انداز میں سجائی گئی کہ اس پر جنت کا گمان ہوتا تھا جب دسترخوان الوان نعمت سے سجا دیا گیا تو حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ کو مجلس طعام میں شرکت کے لیے بلایا گیا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ

زہر پوری طرح بدن میں سرایت کر چکا تھا۔ ہر لحظہ موت کے قریب سے قریب تر کرتا جا رہا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کس نے زہر دیا ہے اور کیوں دیا ہے۔ لیکن قاتل نے جب ان کے سامنے اعتراف جرم کیا تو بجائے اس کے کہ اسے گرفتار کرا کے اس سے قصاص لیتے صرف اتنا کیا کہ لوگوں نے انہیں زہر دینے کے عوض جو اسے تین سو اشرفیاں دی تھیں وہ اس سے لے کر بیت المال میں جمع کرا دیں اور قاتل سے جو غلام تھا کہا کہ تو بھاگ جا ورنہ جب یہ بات لوگوں کو معلوم ہوگی وہ تجھے قتل کر دیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کی جان جائے۔

انہیں بنو امیہ کے امراء نے زہر دلوایا تھا اس لیے کہ انہوں نے بنو امیہ کی زیادتیوں کی تلافی کی تھی انہوں نے جبر و ظلم کے ذریعہ بنو ہاشم کی جن جائیدادوں پر قبضہ کیا تھا ان سے چھین کر وہ زمینیں اور جائیدادیں بنو ہاشم کو واپس کی تھیں۔ انہوں نے تو اپنی بیوی کے زیورات بھی اتروا کر بیت المال میں جمع کرا دیے تھے۔ اب وقت آخر آن پہنچا۔ نزع کا عالم طاری ہونے والا ہی تھا کہ سلمہ بن عبدالملک کہنے لگے امیر المومنین! آپ نے بھی تو عجیب ہی کام کیا نہ دیکھا نہ سوچا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ اپنے پیچھے تیرہ بیٹے چھوڑے جا رہے ہیں لیکن آپ نے ایک دمڑی بھی اپنی اولاد کے لیے نہیں چھوڑی ہے سوچیے تو آپ کے بعد آپ کی اولاد کا کیا

بنے گا۔

خلیفۂ راشد جناب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تیمارداروں سے کہا ذرا مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ جب انہیں اٹھا کر بٹھا دیا گیا تو فرمایا، ذرا غور سے میری بات سنو۔ میں نے اپنی اولاد کا مال کسی دوسرے کو نہیں دیا۔ سلمہ بن عبدالملک نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا تو میں دوسروں کا مال ان کے حوالے کیوں کردوں۔ بیت المال کا مال مسلمانوں کی امانت ہے۔ اگر میں اسے اپنی اولاد کو دے دیتا تو خدا کے آگے مجھے جواب دہ ہونا پڑتا رہا معاملہ اولاد کا تو سن لو کہ اگر میرے بیٹے سعادت مند اور اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کیلئے کافی ہے اور اگر اسکی بارگاہ کے باغی ہونگے تو وہ جس حال میں رہیں مجھے انکی کوئی فکر نہیں۔ یہ فرمایا۔ کلمہ پڑھا اور جان جانِ آفریں کو سپرد کر دے گا۔

حکمران — خادمِ قوم

بچہ جب لنگڑاتا اور روتا ہوا محل میں داخل ہوا تو اسے اس حالت میں دیکھ کر ملکہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ روتی چیختی بچے کے پاس گئی۔ اسے سخت چوٹ لگی تھی۔ کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور گھٹنے کی ہڈی تو ٹوٹ چکی تھی بچہ تکلیف سے بے حال ہو رہا تھا اولاد کی یہ حالت دیکھ کر ملکہ تقریباً بدحواس ہو گئی۔ اس نے بچے سے پوچھا کہ تم کو کس نے مارا ہے۔ بچے نے ایک لڑکے کا نام بتایا جس کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا کھیل ہی کھیل میں لڑائی ہو گئی اس لڑکے کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ اس نے اسی سے اچھی طرح خلیفہ کے بیٹے کی مرمت کر دی۔ یہ سن کر تو ملکہ آگ بگولا ہو گئی اس نے فوراً ملازموں کو حکم دیا اور وہ اس لڑکے کو پکڑ کر محل میں لائے۔ لیکن لڑکے کے پیچھے پیچھے اس کی ماں بھی روتی پیٹتی آ گئی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سو رہے تھے۔ شور سنا تو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ پوچھا، کیا بات ہے۔ ملکہ نے لڑکے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ دکھائی۔ ملزم لڑکے کی ماں رو رو کر کہہ رہی تھی یہ میرا بیٹا ہے اس کا باپ مر چکا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے عورت کو قریب بلایا۔ پوچھا کیا اسے بیت المال سے تنخواہ ملتی ہے؟ عورت نے عرض کیا "نہیں"، خلیفہ نے حکم دیا اس عورت اور اس کے یتیم بچے کا نام فوراً رجسٹر میں درج کیا جائے اور انہیں پابندی سے روزینہ ادا کیا جائے۔ بیوی نے سخت احتجاج کیا کہ اس نے آپ کے بیٹے کو لنگڑا کر دیا سزا دینے کے بجائے الٹا آپ اُسے روزینہ اور گزارہ الاؤنس دے رہے ہیں آپ دیکھیں گے آئندہ وہ آپ کے دوسرے بیٹے کو بھی لنگڑا کر دے گا جناب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بیوی اللہ کو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ قدرت ہونے کے باوجود آدمی معاف کر دے

اور اگر حکومت ملے تو عوام کو ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے کیونکہ اسلام کے نظام حکومت کی بنیاد ہی عوام کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر قائم ہے۔ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے نہ کہ مخدوم اور جابر سلطان۔

صلاح الدین ایوبیؒ۔ فقر شاہی

ستائیس صفر سن ۵۸۹ھ کے دن کے بارے میں علامہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایسا تکلیف دہ دن اسلام اور مسلمانوں پر خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وفات کے بعد کبھی نہیں آیا کیونکہ اس دن اسلامی دنیا تاریک ہو گئی تھی اور مسلمانوں کا ایسا حکمران دنیا سے رخصت ہوا جس کی حکومت وسیع و عریض علاقے پر پھیلی ہوئی تھی لیکن جب اس کی وفات ہوئی تو اس کے خزانے میں صرف ۴۰ درہم تھے اور اس کا کفن ایک دوسرے شخص نے دیا تھا۔ کہ سلطان کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جاتا۔ دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے اپنے لیے کوئی محل نہیں بنایا۔ نہ وہ محل میں رہتا تھا۔ اس کے جسم نے کبھی بھی ریشم کے لباس کو چھوا تک نہ تھا۔

خدا کی راہ میں جہاد اس کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ جہاد کی خاطر اس نے اولاد، عیش و آرام، وطن اور مسکن اور ہر گھریلو دلچسپی سے منہ موڑ رکھا تھا اس نے بادشاہت کا جامہ پہنا ہی اسی لیے تھا کہ وہ خدا کی راہ میں آزادانہ جہاد کے قابل ہو سکے اور رعایا کی فراغت و خوشحالی کا سامان کر سکے اگر اسے دنیوی لذتیں عزیز ہوتیں تو وہ یہ مقصد بیروشلم کی طرف بڑھے یا یورپی سورماؤں سے نبرد آزما ہونے کے بغیر بھی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا مقصد تو صرف ایک تھا۔ کہ خدا کا کلمہ بلند اور اس کا دین سرفراز ہو۔ جب سلطان کی حکومت مصر میں قائم ہوئی تو اس نے سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیا۔ سلطان سے پہلے تعلیمی نظام کا قیام حکومت کی ذمہ داری نہیں تھی۔ عثمان

حکومت سنبھالتے ہی سلطان نے ممالکِ محروسہ میں جگہ جگہ مدارس کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں۔ اور تمام درسگاہوں کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے بڑی بڑی جائیدادیں وقف کیں۔ تعلیم کے بعد اس نے سب سے زیادہ عوام کی صحت کی حفاظت کا انتظام کیا حتیٰ کہ شاہی قلعہ میں ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کیا۔ اس نے اپنے دور میں تجارت وصنعت کو فروغ دیا جس سے بے روزگاری دور ہوئی اور بہت جلد ملک کے عوام میں مرفہ الحالی کا دور دورہ ہوا۔ وہ بڑا متواضع تھا۔ اور ہفتے میں ایک دن کھلی کچہری لگاتا تھا جس میں ہر آدمی کو اجازت ہوتی تھی کہ وہ سلطان کے سامنے اپنی شکایت پیش کر کے اس کا ازالہ کرائے حتیٰ کہ اس کچہری میں خود سلطان کے خلاف مقدمات دائر ہوتے اور قاضی فیصلہ کرتے۔ قاضی کے ہر فیصلے کے سامنے سلطان سرِ تسلیم خم کرتا۔ اس کے ان اقدامات کی وجہ سے ملک کے عوام اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کی فوج کے سپاہی ملازمت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی ذاتی شرافت کی بنا پر اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اسی لئے ستائیں صفر ۵۸۹ھ کو جب سلطان صلاح الدین ایوبیؒ لحد میں لٹائے گئے تو عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا۔ اور امت مسلمہ کو ایسا لگا جیسے کہ آج اس کا والی و وارث دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔

اطاعتِ امیر

سترہ سالہ محمد بن قاسم نے کفرستانِ ہند میں پرچم اسلام کو جس طرح بلند کیا اسے شاید قیامت تک فراموش نہ کیا جا سکے۔ راجہ داہر کے مظالم سے تنگ آ کر عرب خواتین نے سندھ کے ریگزار میں فریاد بلند کی تھی تو حجاج بن یوسف والیٔ عراق اپنے تخت پر کھڑا ہو گیا اور تین مرتبہ اعلان کیا لبیک لبیک ہم تمہاری مدد کو آ رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں محمد بن قاسم کا لشکر تیار ہوا اور دیبل پر حملہ آور ہوا۔ کفرستان

ہند میں حق کی یہ پہلی اذان تھی مگر کیسی اذان ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود

ہوتی ہے بندہ مؤمن کی اذان سے پیدا

سندھ کے غیر مسلم جو صدیوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے جن کا مسلسل استحصال کیا جا رہا تھا جن سے جانوروں سے بھی زیادہ خراب برتاؤ کیا جاتا تھا محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے فاتحانہ داخلے کے بعد پہلی مرتبہ سکھ کا سانس لینے کے قابل ہوئے۔ انہیں آزادی ملی، عزت ملی، تحفظ میسر آیا انہوں نے اسلام کے نظام مساوات کو دیکھا اسلامی رواداری کا مشاہدہ کیا تو کتابوں میں لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اس کی مورت بنا کر اپنے عبادت خانوں میں اس کی پرستش شروع کر دی۔ محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقے میں جبر و استحصال سے پاک حقیقی اسلامی نظام حکومت قائم کیا اور اپنے حسن سلوک سے ساری قوموں کے افراد کو متاثر کر دیا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دارالحکومت میں اب سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر بیٹھا وہ بڑا جابر حکمران تھا اس نے قبائلی تعصب کے پیش نظر محمد بن قاسم کو دارالحکومت میں طلب کیا۔ محمد بن قاسم جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا خلیفہ کا حکم نامہ دیکھتے ہی جلاد کی تلوار اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ امراء نے بغاوت کا مشورہ دیا۔ سندھ کے عوام نے ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا اور مرنے مارنے پر تل گئے سب نے کہا کہ آپ نہ جائیں محمد بن قاسم چاہتا تو انکار کر دیتا اور بغاوت پر کمربستہ ہو جاتا لیکن ایک سچے اور مخلص مجاہد نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر سلیمان بن عبدالملک کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔

"ہر چند کہ میں یہ جانتا ہوں کہ سلیمان بن عبدالملک میرے خون کا پیاسا ہے اور مجھے اپنی موت نظر آ رہی ہے لیکن میں صرف اپنی جان بچانے کے لیے آنے والی نسلوں کو یہ سبق نہیں دینا چاہتا کہ ایک فرد اپنی ذات کے لیے امیرِ وقت سے بغاوت کرے اور مسلمانوں کا کشت و خون ہو۔"

محمد بن قاسم نے جان دے دی لیکن اسلام کے نظام اطاعت کو رسوا ہونے نہ دیا۔ اس طرح رہتی دنیا تک ایک قابلِ تقلید مثال چھوڑی۔ خون سے لکھی ہوئی یہ تاریخ بھلا کون بھلا سکتا ہے۔

موسیٰ بن نصیر کی دُعا

مورخ ابن خلکان نے موسیٰ بن نصیر کی سیرت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ عقل مند، رحم دل، سخی، بہادر اور نیکو کار تھے۔ یہ نیکو کاری انہوں نے وراثت میں اپنے والد نصیر سے پائی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب موسیٰ بن نصیر نے اندلس کا سارا علاقہ فتح کر لیا تو وہ ایک طوفان کی صورت میں پرتگال کے بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کی طرف بڑھے اور وہاں سے ہوتے ہوئے فرانس کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ پورے یورپ کو پامال کرتے مگر عین اس وقت جبکہ وہ وادیِ بلائی میں اترے تھے ولید بن عبدالملک کا قاصد پہنچا اور واپسی کا حکم دیا۔ اگر موسیٰ بن نصیر اس حکم پر واپس نہ ہوتے تو آج یورپ کا گوشہ گوشہ نورِ اسلام سے منور ہوتا اور وہاں کی اکثریت مسلمان ہوتی۔ موسیٰ بن نصیر صرف سپاہی نہیں تھے بلکہ ابن خلکان کے بقول کہ وہ ولی صفت خدا رسیدہ بزرگ بھی تھے ایک مرتبہ افریقہ میں قحط پڑا تو موسیٰ بن نصیر لوگوں کو ساتھ لے کر صحرا میں آئے۔ اس دن وہ روزہ سے تھے۔ انہوں نے صحرا میں پہنچ کر نماز استسقا پڑھی اور خطبہ دیا لیکن خطبہ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا نام نہیں لیا۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے خطبے میں خلیفہ کے لئے دعا کیوں نہ کی۔ اس زمانے میں یہ عمل بغاوت پر محمول کیا جاتا تھا مگر موسیٰ بن نصیر نے فرمایا یہ ایسی جگہ ہے جہاں اللہ جل شانہٗ کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ موسیٰ جانتے تھے کہ ان کی اس بات کا کیا انجام ہو گا لیکن جن کی نگاہیں جمال و جلالِ خداوندی سے آشنا ہوتی ہیں، انہیں کسی کی پروا ہوتی ہے

نہ انجام کار کی فکر۔ یہ نمازی اور پراسرار بندے جب ایک مرتبہ اللہ اکبر یعنی (اللہ سب سے بڑا ہے) کہہ دیتے ہیں تو پھر راہ مستقیم پر قائم ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ عقیدہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ہر اقتدار خاک میں مل سکتا ہے، ہر تاج پامال ہو سکتا ہے، ہر کمال زوال کو مستلزم ہے۔ انقلابات کے جھکڑ تخت کو تختے میں اور بادشاہی کو فقیری میں تبدیل کر سکتے ہیں مگر وہ جس کا ملک لازوال جس کا اقتدار دائمی۔ اور جس کا جاہ و جلال ابدی و سرمدی ہے، وہ ذات قادر مطلق کی ذات ہے۔ جو سر اس کے سامنے ایک بار جھک گیا وہ اب کسی بارگاہ میں نہیں جھک سکتا۔ یہی توحید ہے اور موسیٰ بن نصیر صحیح معنوں میں موحد تھے۔ خطبے کے بعد موسیٰ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور آسمان پر ہر سو بادل چھا گئے۔ پھر تو ایسی بارش ہوئی کہ جل تھل ہو گیا۔ بارش کو تو ہونا ہی تھا کہ سچے مومن و مجاہد نے اپنے رب سے خلوص کے ساتھ سوال کیا تھا۔

دلداری

سلطان ناصر الدین محمود اپنے ذاتی اخراجات کے لئے خزانے سے کچھ نہیں لیتا تھا بلکہ قرآن کریم کی کتابت کر کے اس سے حاصل ہونے والے ہدیے سے اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے بڑی محنت سے قرآن کریم کی کتابت کی اور اپنے ایک دوست کو بلا کر اسے کتابت شدہ قرآن کریم دکھا رہا تھا۔ دوست نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر بادشاہ کو بتایا کہ یہاں کتابت کی غلطی ہے۔ بادشاہ نے اس لفظ کے گرد ایک دائرہ بنا دیا گیا۔

اور اپنے دوست سے کہا کہ بعد میں اس کی اصلاح کر لونگا۔ کافی دیر تک وہ دوست بادشاہ کے پاس بیٹھا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ دوست کے جانے

کے بعد بادشاہ نے قرآن کریم نکالا اور اس دائرے کو مٹا دیا۔ جس وقت بادشاہ اس لفظ کے گرد یہ دائرہ بنا رہا تھا، اس کا ایک غلام دیکھ رہا تھا۔

پھر جب اس نے اس دائرے کو مٹا دیا تب بھی غلام نے اسے مٹاتے ہوئے دیکھا۔ غلام کو سخت تعجب ہوا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے بادشاہ سے دریافت کیا حضور! جب آپ کے دوست نے کتابت میں غلطی کی نشاندہی کی تھی تو آپ نے یہ کہہ کر کہ بعد میں اس کی اصلاح کرلونگا ایک دائرہ بنا دیا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آپ نے کوئی اصلاح بھی نہیں کی اور دائرے کو مٹا بھی دیا۔ سلطان ناصر الدین مسکرایا۔ اور جواب دیا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے دوست نے غلطی کی نشاندہی کی لیکن حقیقت میں غلطی نہیں تھی۔ مگر اس خیال سے کہ اس کی دل شکنی نہ ہو میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے لفظ کے گرد دائرہ بنا دیا تھا۔ اور جب وہ چلا گیا تو میں نے اسے مٹا دیا۔ میرے عزیز! کاغذ پہ بنا ہوا دائرہ آسانی سے مٹایا جاسکتا ہے لیکن دل کا داغ مٹانا آسان نہیں ہے اگر میں اس کی دل شکنی کر دیتا تو اس کے دل پر ایسا داغ پڑ جاتا جسے میں کبھی مٹا نہ سکتا تھا۔ میرے عزیز دل ایک نازک آبگینہ ہے۔ اسے بہت سنبھال کر رکھنا چاہیے ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

فاتح مصر عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور کبوتر کا گھونسلہ

فسطاط عربی زبان میں خیمہ کو کہتے ہیں۔ مگر تعجب انگیز امر یہ ہے کہ فسطاط مشرق وسطیٰ کا ایک عظیم شہر ہے۔ آخر ایک شہر کا نام فسطاط یعنی خیمہ کیوں رکھا گیا، جو آدمی بھی سنتا ہے تعجب میں پڑ جاتا ہے کیونکہ اس شہر میں تو بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ ہوٹل، کاروباری مراکز، اسکول اور کالج کیا نہیں ہے اس شہر میں۔ اس کے

باوجود اس کا نام فسطاط ہے۔ بعض لوگ سوچیں گے کہ شاید اگلے زمانوں میں یہ شہر خیموں کا شہر رہا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہے گذشتہ زمانوں میں بھی یہ ایک عظیم الشان شہر تھا جس کی عظمت کی گواہی آج تک اس شہر کے کھنڈرات دیتے ہیں۔

قصہ اصل میں یہ ہے کہ جس زمانے میں اسلامی فوجیں اسکندریہ کا محاصرہ کیئے ہوئے تھیں، اسلامی افواج کی نگرانی کے لیئے گورنر مصر حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ کو فسطاط شہر میں قیام کرنا پڑا اور ان کا خیمہ وہاں نصب کیا گیا۔ اسی طرح حضرت عمرو ابن العاصؓ کو کئی مہینے فسطاط میں قیام کرنا پڑا۔ محاصرہ اللہ کی مہربانی سے کامیاب ہوا اور اسلامی افواج فاتحانہ اسکندریہ میں داخل ہو گئیں۔ اس بات کی اطلاع گورنر مصر کو فسطاط میں دی گئی اور اسلامی افواج کے کمانڈر نے حضرت عمرو ابن العاصؓ کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی جب روانگی کا وقت قریب آیا تو گورنر مصر حضرت عمرو ابن العاصؓ نے حکم دیا کہ خیمہ اکھاڑ لیا جائے۔ مزدور خیمہ اکھاڑنے میں مصروف تھے کہ ٹہلتے ٹہلتے جناب عمرو ابن العاصؓ خیمہ میں آگئے دیکھا کہ ایک کبوتر نے خیمے کے ایک کونے میں گھونسلہ بنا دیا ہے۔ اور کبوتری نے انڈے دینے رکھے ہیں۔ خیمہ اگر اکھاڑ دیا جاتا تو کبوتر کا گھونسلہ اجڑ جاتا اور انڈے ٹوٹ جاتے۔ گورنر نے حکم دیا کہ خیمے کو اسی حال میں چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ میں آشیانہ اجاڑنے نہیں آیا ہوں بلکہ آشیانہ بنانا یا بنوانا میرا کام ہے۔ خیمہ بہت قیمتی تھا۔ مزدوروں کو سخت تعجب ہوا کہا کہ حضور! جب اس خیمے میں کوئی رہے گا نہیں تو یہ بارش میں بھیگ کر اور دھوپ سے جھلس کر ضائع ہو جائے گا۔ گورنر مصر نے جواب دیا کہ خیمہ ضائع ہو جائے تو ہو جائے میں کبوتر کے آشیانے کو اجاڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خیمہ کھڑا رہا محض اس لیئے کہ ایک بے زبان چڑیا بے ٹھکانا نہ ہو جائے گورنر مصر کا یہ عمل دراصل اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ چونکہ یہ خیمہ عرصے تک کھڑا رہا اس لیے اس مناسبت سے اس شہر ہی کا نام فسطاط یعنی

خیمہ پڑ گیا۔ جب تک یہ شہر رہے گا اور اس کا یہ نام رہے گا جانوروں سے ہمدردی کرنے کا یہ نمونہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی فراخدلی

ایک مطلق العنان حکمران کے سامنے اس کے منہ پر اسے بُرا بھلا کہہ دینا جان جوکھوں کا کام ہے۔ کیونکہ مطلق العنان حکمران خود کو کسی قانون کا پابند نہیں سمجھتا۔ سلیمان بن عبدالملک کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک دل جلے نے اس کے سامنے بھرے دربار میں اسے فاسق اور فاسق زادہ کہہ دیا۔ سلیمان بن عبدالملک غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے جو اس وقت دربار میں موجود تھے، سوال کیا کہ اس آدمی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ اس نے خلیفہ کا احترام کیا نہ دربار خلافت کا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس کا سر قلم کروا دوں۔ آپ اپنی رائے سے مجھے آگاہ فرمائیں۔

عمر بن عبدالعزیز نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے خلیفہ سے فرمایا: امیر المومنین آپ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ جس طرح اس نے آپ کو گالی دی ہے، آپ بھی اسے گالی دے لیں۔ شریعت کی رو سے اس سے زیادہ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ عمر بن عبدالعزیز کے اس جواب سے اہل دربار اور خود خلیفہ سلیمان بن عبدالملک بے حد متاثر ہوئے۔ عمر بن عبدالعزیز کا یہ رویہ خلیفہ بننے کے بعد بھی باقی رہا۔

کوفہ کے ایک شخص نے کوفہ کے گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کے سامنے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو گالی دی۔ گورنر کوفہ نے اسے گرفتار کر لیا اور جناب عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ ایک شخص کو میں نے آپ کو گالی دینے کے جرم میں گرفتار کر لیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے بدتمیز اور گستاخ کی گردن اڑا دوں۔

لیکن اس خیال سے میں نے اسے قید میں ڈال دیا ہے کہ اس کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کروں۔ میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔ براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ نے جواب میں لکھا کہ اگر تم اسے قتل کر دیتے تو خدا کی قسم میں تم سے اس کا قصاص لیتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو گالی دینے پر کوئی شخص واجب القتل نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ جس طرح اس نے مجھے گالی دی ہے اسی طرح تم بھی اسے گالی دے دو۔ میری رائے اس کے بارے میں یہ ہے کہ اسے رہا کر دو۔ میں نے اسے معاف کر دیا کیونکہ معاف کر دینے کا بہت بڑا اجر ہے۔ میرا اپنا اصول یہ ہے کہ میں بدی کا جواب بدی سے نہیں دیتا، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ہے۔

عمر بن عبد العزیزؒ اور لونڈی

تاریخ کی آنکھیں حیرانی سے یہ ماجرا دیکھ رہی تھیں کیونکہ اس کی آنکھوں نے ابتدائے آفرینش سے ایسا واقعہ نہیں دیکھا تھا۔ لونڈی آرام سے بستر پر سو رہی تھی اور خلیفہ اسے پنکھا جھل رہا تھا۔ چونکہ گرمی سخت تھی اور لونڈی کو مسلسل ٹھنڈی ہوا مل رہی تھی اس لیے وہ گھنٹوں پڑی سوتی رہی۔ یک بیک جو اس کی آنکھ کھلی اور خلیفہ کو پنکھا جھلتے ہوئے دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ ہڑ بڑا کر اٹھی اور معذرت خواہانہ انداز میں خلیفہ کے قدموں پر گر پڑی۔ "عالی جاہ! مجھے معاف فرما دیجیے کہ میں خادم ہو کر مخدوم بن گئی" گرمی کا زمانہ تھا خلیفہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سو رہے تھے اور لونڈی انہیں پنکھا جھل رہی تھی۔ اتفاقاً اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ پلنگ کی ایک پٹی سے ٹیک لگا کر سوگئی پنکھا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھوڑی دیر کے بعد خلیفہ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لونڈی ٹیک لگائے سو رہی ہے

اور پنکھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکا ہے۔ خلیفہ نے پنکھا اٹھالیا اور آہستہ آہستہ لونڈی کو جھلنے لگے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لونڈی کو لگی تو بے سدھ ہو گئی اور گھنٹوں پڑی رہی خلیفہ پنکھا جھلتے رہے۔ لونڈی نے جب یہ ماجرا دیکھا تو مارے ندامت و شرمندگی کے سر پیٹنے لگی۔

اور شور مچانا شروع کیا خلیفہ نے فرمایا "اس میں شرمندگی یا پریشانی کی کیا بات ہے ؟ تو بھی میری طرح ایک انسان ہے۔ تو بھی گرمی محسوس کرتی ہے، اس لئے میں نے چاہا کہ جس طرح تو مجھے پنکھا جھلتی رہی ہے، اسی طرح میں بھی تجھے پنکھا جھلوں۔ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات نے غلام و آقا اور شاہ و گدا کے امتیاز کو مٹا دیا ہے۔ پتہ نہیں بارگاہِ الٰہی میں کل قیامت کے دن تجھے شرف قبولیت ملے گا یا مجھے ! عقل والوں کو عاقبت پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور دنیا کی مادی برتری کو وجۂ امتیاز نہیں بنانا چاہیے ۔ وجۂ امتیاز تو از روئے قرآن صرف تقویٰ ہے ۔ اور تقویٰ کا حقیقی تعلق دل کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ رنگ و نسل اور عہدہ و منصب سے" ۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عمل اور چند جملوں سے پورے نظام اسلام کی مکمل تفسیر بیان کر دی ۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کی احتیاط

آدمی لائق تھا۔ باصلاحیت اور تجربہ کار تھا۔ اس میں ملکی انتظام کو چلانے کی مکمل صلاحیت موجود تھی، اس لیے جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی صلاحیتوں کا علم ہوا تو اسے کسی جگہ کا حاکم بنا دیا ۔ اتفاقاً چند دنوں کے بعد جناب عمر بن عبدالعزیزؒ سے ایک شخص ملے اور باتوں باتوں میں اس شخص کا تذکرہ نکل آیا جسے جناب عمر بن عبدالعزیزؒ نے کسی شہر کا حاکم بنایا تھا۔ خلیفہ کے ملاقاتی نے بتلایا کہ یہ شخص حجاج بن یوسف کے زمانے میں بھی کسی شہر کا حاکم تھا۔ اتنا سننا تھا

کہ لگا جیسے خلیفہ چونک پڑے۔ فرمایا! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شخص حجاج بن یوسف
کے دور میں بھی کسی شہر کا حاکم تھا۔ ملاقاتی نے بتایا جناب! میں غلط نہیں کہہ رہا، اگر
آپ کو شبہ ہو تو اس حاکم کو بلا کر میری بات کی تصدیق کر لیں۔ خلیفہ نے فوراً حکم نامہ
لکھوایا اور اس حاکم کو دارالخلافہ میں طلب کیا۔ خلیفہ کا حکم پاتے ہی وہ حاکم دربارِ
خلافت میں حاضر ہو گیا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تم حجاج بن یوسف
کے زمانے میں بھی کسی شہر کے حاکم تھے؟ اس نے کہا۔ جی ہاں۔ خلیفہ نے اسے فوراً
معزول کر دیا۔

اس نے عرض کیا حضور! میں تو صرف چند دنوں تک حجاج کے دور میں حاکم
رہا ہوں، زیادہ عرصہ تو میں نے اس کی ملازمت نہیں کی ہے۔ جناب عمر بن
عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا برا ہونے کے لیئے اتنا ہی کافی ہے کہ تو اس کے
ساتھ ایک دن یا اس سے بھی کم رہا۔

کیونکہ پاس رہنے والے پر صحبت کا اثر لازماً پڑتا ہے جو متقیوں کے ساتھ رہتا
ہے اس پر تقویٰ کا اثر پڑتا ہے اور جو ظالموں اور فاسقوں کے ساتھ رہتا ہے اس پر فسق
و فجور اور ظلم و جبر کا اثر غیر محسوس طریقے پر پڑ جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
ہے کہ صالح آدمی کے پاس بیٹھنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشک والے
کے پاس بیٹھا ہو کہ اگر مشک نہ بھی ملے تب بھی اس کی خوشبو سے تو لطف اندوز ہوتا
ہے اور برے ساتھی کی مثال آگ کی بھٹی والے کی سی ہے کہ اگرچہ چنگاری نہ بھی پڑے
تاہم دھواں تو سونگھنا ہی پڑتا ہے۔

خلیفہ نے یہ فرمایا اور اس پر کو فوراً برخاست کر دیا کہ تو نے ایک ظالم حکمران
کی خدمت کی تھی۔

نورالدین زنگی

قطب الدین نیشاپوری سلطان کا پرانا درباری تھا جب اس نے دیکھا کہ انتہائی بے خوفی سے سلطان دشمنوں کے لشکر میں گھس رہا ہے اور پھر اس جمگھمٹ سے نکلتا ہے تو اس کا دل کانپ گیا۔ وہ بے تحاشا چیخنے لگا۔ سلطان! خدا کے لیے ہمیں امتحان میں نہ ڈالیئے۔ اگر خدانخواستہ آپ مارے گئے تو گویا ساری مخلوق ماری جائے گی۔ دشمن اس ملک کو فتح کر لیں گے اور مسلمان تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ لڑائی گھمسان کی ہو رہی تھی۔ شور و ہنگامہ اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر چیختے چیختے قطب الدین نیشاپوری سلطان کے قریب پہنچ گیا۔ سلطان نے اس کی آواز سن لی، اور اسی وقت قطب الدین نیشاپوری کو ڈانٹا: قطب الدین اپنی زبان بند کر تو اللہ تعالیٰ کے حضور گستاخی کر رہا ہے۔ میری کیا حیثیت ہے مجھ سے پہلے اس دین اور مملکت کا اللہ کی ذات کے سوا کون محافظ تھا۔ میں تو اس کا ادنیٰ غلام اور اس کے دین کا چاکر ہوں اس عالی بارگاہ میں نورالدین زنگی جیسے بے شمار خادم ہیں۔ میری حیات و موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرے لیئے یہ عین سعادت ہے کہ اس نے مجھے اپنے دین کی خدمت اور جہاد فی سبیل اللہ کی توفیق بخشی۔ سلطان نورالدین زنگی نے یہ کہا اور بڑی طرح رونے لگا: "مالک! میرے اس درباری کی غلطی کو معاف فرما کہ اس کی نظر تھوڑی دیر کے لیے حقیقت سے ہٹ کر مجاز پر ٹھہر گئی تھی۔

مولا! بادشاہت و سلطنت صرف تجھ ہی کو زیبا ہے ہم تو آج اس لیئے عزت دار ہیں کہ تیرے دین کا پرچم ہمارے ہاتھوں میں اور تیرے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا جوا ہماری گردن پر ہے۔" سلطان چونکہ اپنی حقیقت کو جانتا تھا اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اس پر کرم فرمایا اور ہر معرکہ میں فتح مند کیا۔ نورالدین کے دربار میں امیروں اور رئیسوں کی عزت نہیں تھی۔ البتہ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ کوئی عالم دین آ رہا ہے تو وہ خود اس کے استقبال کے لیئے تخت سے اٹھ کھڑا ہوتا اور انہیں بڑی عزت و تکریم سے

اپنے مسند پر بٹھاتا کہ علم اللہ کا نور ہے اور ہر حال میں قابل احترام۔

اقلیتوں کے حقوق

سلطان سکندر لودھی کی دینداری ہندوستان کے حکمرانوں میں ضرب المثل ہے۔ یہ پرجوش دیندار اور موحد حکمران مانا جاتا ہے۔ اس نے اپنے دور حکومت میں بہت سی خلاف اسلام رسوم و رواج کو مٹایا اور کوشش کی کہ خالص قرآن و سنت پر مبنی طرز زندگی کو رائج کیا جائے۔ ایک مرتبہ سلطان تھانیسر کے دورے پر آیا ہوا تھا اس کے جوش ایمانی اور جذبۂ اسلامی کو دیکھ کر بعض تنگ نظر مولویوں نے اس سے شکایت کی کہ ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے ہم کو بے حد تکلیف ہوتی ہے لہٰذا آپ خود اس بات کا جائزہ لے کر ان کے مندروں کو مسمار کرا دیں۔ وقتی طور پر سلطان بھی ان کے مشورے سے متاثر ہو گیا اور اپنے مذہبی جوش میں آکر مندروں کو گرانے پر آمادہ ہو گیا۔ شدہ شدہ اس بات کی اطلاع تھانیسر کے مشہور عالم دین مولانا عبداللہ تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ کو مل گئی۔

ان سے برداشت نہ ہوا اور سلطان کی قیام گاہ میں پہنچ گئے۔ اس کے دربار میں حاضر ہو کر فرمایا: بادشاہ! اسلام نے کسی مذہب و ملت کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ لہٰذا میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اس عمل سے باز آجا کیونکہ یہ شریعت کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔ بھرے دربار میں اس طرح ٹوک دینے پر جلال شاہی کے پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ نہایت برہمی کی حالت میں سلطان نے کہا تم کافروں کی حمایت کرنے آئے ہو اور بتوں کو آباد کرنا چاہتے ہو؟ مولانا نے جواب دیا سلطان میں حق کی حمایت کرتا ہوں۔ مجھے آپ ہی بتا دیجیے کہ صحابہ کرام اور خلفائے راشدین نے کتنے گرجے اور صومعے گرائے۔ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا جو آغوش نبوت کے پروردہ تھے اور جن کی رگ و پے میں توحید رچی بسی ہوئی تھی

تو آپ ایسا کرنے والے کون ہیں؟ یہ دین و شریعت کا معاملہ ہے، اس میں بغیر کسی سند کے کسی کا قول یا عمل معتبر نہیں ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں جس طرح مسجد کا احترام ملحوظ رکھا جاتا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ مولانا عبداللہ تھانیسری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر سن کر سلطان سکندر لودھی ہوش میں آگیا۔ اور مندروں کے گرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسلام کی تعلیمات رواداری پر مبنی ہیں جبر اور طاقت کے ذریعے اسلام غلبہ حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اصولوں کی صداقت اور اخلاق کریمانہ کے ذریعے دلوں کو فتح کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی فتح پائیدار ہوتی ہے۔

حکمران کی ذمّہ داری

خلیفہ مامون الرشید کی موت کے بعد اس کا کھلنڈرا بھائی معتصم باللہ ۳۸ سال کی عمر میں تخت خلافت پر بیٹھا۔ کسی کو بھی امید نہ تھی کہ یہ کھلنڈرا جوان اتنی بڑی سلطنت کا انتظام سنبھال سکے گا لیکن معتصم باللہ بڑا ذمہ دار اور منتظم مزاج ثابت ہوا۔ اس نے ملک میں سب سے زیادہ زراعت کی ترقی پر زور دیا، اس لیئے کہ وہ جانتا تھا کہ ملکی معیشت میں زراعت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو۔ اس نے صنعتوں کے فروغ دینے میں بھی بہت دلچسپی لی جس سے ملک کے عوام کو روزگار کے نئے نئے مواقع میسر آئے۔ خوش قسمتی سے معتصم کو محمد بن عبدالمالک جیسا دانا و بینا وزیر بھی مل گیا تھا جس نے خلیفہ کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا پورا زور صرف کر ڈالا۔ زراعت و صنعت کی ترقی کے باعث ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوا اور لوگ اطمینان سے زندگی گذارنے لگے۔ لیکن معتصم سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوگئی کہ امن و امان کی صورت حال خراب ہونے لگی۔ معتصم چونکہ بڑا بہادر اور بے پروا تاجدار تھا اس لیئے اس نے فوج میں کثرت سے ترکوں کو بھرتی کرلیا۔

اس نے خود اپنے محافظ دستے میں چار ہزار ترک بھرتی کیے۔ یہ ترک سپاہی بڑے منہ چڑھے اور غیر مہذب تھے اس لیے جب یہ محل سے نکل کر بازاروں میں جاتے تو اودھم مچ جاتا۔ طرح طرح کی خرمستیاں کرتے۔ عوام کو چھیڑتے شوخی سے بھرے بازار میں گھوڑے دوڑاتے اور کئی بچے ان کے نیچے آکر زخمی ہو جاتے۔ شروع شروع میں تو اہل بغداد نے ان کی خرمستیوں کو گوارا کیا لیکن جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو عوام انہیں گھیر کر گھوڑوں سے اتار لیتے اور سخت سزا دیتے۔ ترک سپاہیوں نے بارہا معتصم سے اس کی شکایت کی مگر معتصم نے بغداد کے شہریوں کو حق بجانب جان کر ان کی شکایت پر کان نہ دھرے۔ تب ترکوں نے بھی شہریوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ عید کا دن تھا خلیفہ معتصم باللہ نماز عید سے فارغ ہو کر محل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ عوام کے ایک ہجوم نے اس کا راستہ روک لیا۔ ترک محافظ حائل ہونے لگے تو خلیفہ نے انہیں روک دیا اور خود عوام کے قریب چلا گیا۔ مجمع سے ایک بوڑھا نکلا اور اس نے خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

خلیفہ! آپ نے ان وحشیوں کو ہمارے درمیان لا بسایا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے کئی بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو چکی ہیں۔ خلیفہ کی ہمسائیگی رعایا کے لیے باعث رحمت ہوتی ہے مگر آپ کی ہمسائیگی تو ہمارے لیے باعث زحمت بن گئی۔

خلیفہ سناٹے میں آگیا۔ ایک مطلق العنان حکمران تھا، ایک معمولی سا ایک اشارہ کرتا تو بوڑھے کا سر قلم ہو جاتا لیکن آمر مطلق حکمران بھی خود کو شریعت اسلامیہ کے سامنے جواب دہ تصور کرتا تھا۔ بوڑھے سے معذرت کی اور فوراً ترک محافظوں کو دور دراز چھاؤنیوں میں منتقل کر دیا کہ امن و امان برقرار رکھنا حکمران کی اولین ذمہ داری ہے۔

حکمران کی اسلامی حیثیت

اسلامی تاریخ کا وہ عظیم فاتح جس کے نام سے صدیوں صلیبی لشکر لرزہ براندام

رہتا تھا، اگر چاہتا تو سونے چاندی کے انبار جمع کر لیتا بلکہ خالص چاندی اور سونے کی اینٹوں سے محل تیار کر لیتا لیکن وہ فرض شناس اور خوفِ خدا رکھنے والا فرماں روا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ اور سپاہیوں کے خیمے دو ہی اس کے ٹھکانے تھے۔ اس کو کسی چیز سے دل بستگی تھی نہ وابستگی۔ خاندان اور اولاد احباب کی محبت نے اسے کبھی بھی اپنی طرف ہمہ تن متوجہ نہیں کیا؛ البتہ اپنے فرائض ادا کر دیتا تاکہ حشر کے دن جواب دہی نہ کرنی پڑے۔ وہ بیت المال کو امت کی امانت جانتا۔ تھوڑی بہت جو اس کی ذاتی جائیداد تھی، اس سے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے اخراجات پورے کرتا۔ ایک مرتبہ وہ نہایت تنگ دست ہو گیا۔ روپے کی اس کو سخت ضرورت تھی۔ سلطان نے اپنے بھائی ملک عادل سے ڈیڑھ لاکھ دینار بطور قرض مانگے۔ ملک عادل نے دیکھا کہ موقع غنیمت ہے، اس نے سلطان سے کہا کہ بسر و چشم! میں آپ کو ڈیڑھ کیا دو لاکھ دینار دے سکتا ہوں، اور وہ بھی آپ کی مرضی پر منحصر ہوگا جب جی چاہے میری رقم لوٹا دیجیے گا۔ میں آپ سے واپسی کا تقاضا بھی نہیں کروں گا بس آپ اتنا کریں کہ اس کے بدلے میں مجھے حلب کی حکومت دیدیں۔ ملک عادل کا سوال سن کر سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ملک عادل کو مخاطب کر کے اس نے کہا:

"ملک عادل! کیا تم نے خیال کر لیا ہے کہ سلطنتیں بھی فروخت کی جاتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مکان رہنے والوں کی اور مملکتیں ملک والوں کی ملکیت ہوتی ہیں، ہماری ذاتی ملکیت نہیں۔ ہماری حیثیت تو صرف ایک خزانچی اور چوکیدار کی ہے۔ ایک مسلمان حکمران اہل دین کا نگہبان اور شہریوں کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے اور بس۔ یہ روپیہ اور زر و مال نہ میرا ہے اور نہ تمہارا۔ ہم خیانت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے ڈیڑھ لاکھ دینار اپنے پاس رکھو، مجھے نہیں چاہئیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا اور ملک عادل کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے۔ کچھ عرصہ بعد سلطان کی وفات ہو گئی اور جاننے والوں کو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اسلامی تاریخ کے فاتح عظیم کے ترکہ میں اتنا بھی نہ تھا کہ اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جاتا۔ نامور

عالم دین قاضی فاضل نے اپنی جیب سے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔
شاید اسی کو شاہی میں گدائی کہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی اور ایک غلام

غلام جب ایک بہت بڑے صوبے کا صوبے دار بنایا گیا اور محمود غزنوی کی موجودگی میں اس کے سر پر تاج رکھا جانے لگا تو وہ بے اختیار رو پڑا حالانکہ یہ رونے کا موقع نہ تھا بلکہ خوشی اور مسرت کا وقت تھا سلطان محمود غزنویؒ کو غلام کی یہ حرکت دیکھ کر سخت تعجب ہوا اور اس نے اس سے رونے کی وجہ دریافت کی۔ غلام نے کہا کہ حضور! تخت پر بیٹھنے اور تاج پہننے کے بعد مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا اور میں خود کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ قصہ یہ ہے کہ آپ ہندوستان میں اتنے جابر و ظالم مشہور تھے اور آپ کے نام کا ایسا ہوا لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا کہ مائیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں۔ بچپن میں میری ماں بھی آپ کے نام سے مجھے ڈراتی تھی۔ اتفاق سے راجاؤں کے اس لشکر میں میں بھی شامل تھا جو آپ سے لڑنے کے لیے میدان میں آیا تھا۔ ہمیں شکست ہوئی اور بالآخر غلام بن کر میں آپ کے ساتھ غزنی آگیا۔ آپ کے نام کے ساتھ ساتھ میں آپ کی صورت سے بھی خوفزدہ تھا، لیکن آپ نے میرے ساتھ کمال شفقت کا برتاؤ کیا، میری تعلیم و تربیت کا انتظام کیا، یہاں تک کہ میں اپنے باپ کی شفقت تک کو بھول گیا۔ آپ نے میرے اوپر ہمیشہ اعتماد کیا، حالانکہ میں آپ سے اس قسم کے برتاؤ کی امید نہ رکھتا تھا۔ اور آج آپ نے مجھے اتنے بڑے صوبے کا والی مقرر کر دیا۔ یہ سوچ کر کہ کاش میری والدہ آج زندہ اور موجود ہوتی تو میں اُسے بُلا کر دکھاتا کہ جس شخص کو ہوّا بنا کر تو نے میرے سامنے پیش کیا تھا اور بچپن میں جس کا نام لے کر تو مجھے ڈراتی تھی، وہ ویسا نہیں ہے جیسا کہ تم سمجھتی تھیں۔ وہ تو ایک مہربان بھائی، مخلص دوست اور شفیق باپ جیسا محبت بھرا دل اپنے

سینے میں رکھتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر محمود غزنوی مسکرانے لگا اور کہا میرے عزیز! میں نے جو برتاؤ تیرے ساتھ کیا یہ میرا کوئی ذاتی فعل نہیں تھا بلکہ یہ تو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہے کہ جو خود کھاؤ وہی غلاموں کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ۔ حضورؐ کی جب وفات ہو رہی تھی تو آپ کی آخری وصیت یہ تھی کہ نماز کا خیال اور ان غلاموں کا خیال رکھنا جو تمہارے قبضے میں ہیں۔

حجاج بن یوسف کی موت

سفاک اعظم حجاج ابن یوسف کی ستم رانی کو عراق میں بیس سال گزرے تھے۔ کہ اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے لگا۔ بے گناہوں کو سخت مصیبتوں کا مزہ چکھانا شروع کر دیا۔ حجاج موت کی سختیوں میں گرفتار تھا۔ کہ ابو منذر رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور پوچھا حجاج تیرا کیا حال ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کیا پوچھتے ہو۔ شدید مصیبت سخت تکلیف اور ناقابل برداشت درد میں مبتلا ہوں۔ آخری وقت ہے اگر اس جبار قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا۔ تو میرا کیا بنے گا؟

ابو منذرؒ نے فرمایا۔ حجاج خدا اپنے انہی بندوں پر رحم کرتا ہے۔ جو اللہ کے بندوں پر رحم کرتے ہیں۔ اس کی مخلوق سے محبت رکھتے ہیں، تو فرعون اور ہامان کا ساتھی تھا تو نے نیک لوگوں کے راستے کو چھوڑ دیا تھا۔ تو نے بڑے بڑے علماء کو قتل کرا دیے۔ ان کی جماعت فنا کر ڈالی تو نے تابعین کی جڑیں کاٹ دیں۔ اور ان کا پاک درخت اکھاڑ پھینکا۔ تو نے مخلوق کی اطاعت میں پڑ کر خالق کی نافرمانی کی۔

خون کی ندیاں بہائیں۔ جانیں لیں۔ آبروئیں برباد کیں۔ ظلم و جبر کی روش اختیار کی۔ تو نے اپنا دین بچایا اور نہ ہی دنیا۔ تو آج کے دن سے غافل تھا۔ تو اس امت کے لیے قہر تھا۔ اللہ کا شکر ہے اس نے تیری موت کے سامان سے اس امت

کو راحت بخشنے کا انتظام کیا ہے۔ یہ بے لاگ تقریر سن کر حجاج مبہوت رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جو دوسروں کو مبتلائے مصیبت کر کے ہنسا کرتا تھا۔ آج اس کی مصیبت پر موت ہنس رہی تھی۔ مرض ایسا خراب کہ دہکتی ہوئی انگیٹھیاں اس کے جسم کے ساتھ لگا دی جاتیں۔ مگر سردی کم نہ ہوتی تھی ظلم اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے جس طرح جو بو کر گیہوں نہیں کاٹ سکتے۔ آم کے درخت سے املی نہیں توڑ سکتے۔ اسی طرح ظلم کے بدلے رحم نہیں مل سکتا۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔

صلاح الدین ایوبیؒ کا نظام حکومت

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے جب ملک شام فتح کیا تو ان کے وزراء نے نئے مفتوحہ ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سلطان سے عرض کیا عالیجاہ! یہ نصرانیوں کا ملک ہے یہاں کے لوگ نہایت سرکش اور سخت جان واقع ہوئے ہیں اس لیے مخلصانہ مشورہ ہے کہ ان کے لیے سخت گیری کی ضرورت ہے مگر اسلام کے سیاسی اصول بہت نرم ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ احکام اسلام کے علاوہ بھی اگر کچھ اور قوانین نافذ کر دیے جائیں تو یہاں کے لوگوں پر قابو رکھنے میں آسانی ہو گی حکومت کو استحکام حاصل ہو گا اور وہ تمام قوتیں جو نظام حکومت کو کمزور کرنے والی ہیں کچلی جا سکیں گی۔ سلطان صلاح الدینؒ کا چہرہ یہ باتیں سن کر متغیر ہو گیا فرمایا "تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے یہ جو ملک فتح کیا ہے اس لیے فتح کیا ہے کہ اپنی حکومت اور سلطنت قائم کروں اور لوگوں کی گردنوں پر اپنی غلامی کا جوا رکھوں سو کان کھول کر سن لو کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ میں نے محض اللہ کو خوش کرنے کے لیے اور اس کی رضا کی خاطر یہ ساری کوشش کی ہیں۔ میں تو صرف اپنے مالک کا چاکر ہوں میں اپنا حکم ہرگز نہیں نافذ کروں گا صرف احکام اسلام نافذ کروں گا یہ ملک رہے یا جائے

مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ تم لوگ اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں کوئی بھی حکم قرآن وسنت کے خلاف صادر نہیں کر سکتا اور قرآن وسنت کی مخالفت میں کوئی بھی کوشش میں ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ قرآن اللہ کا فرمان اور سنت رسولؐ کی امانت ہے انسانیت کی فلاح راہ مومن ہویا کافر اہی دونوں پر عمل کرنے میں ہے،، سلطان نے قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر کیا ہر مذہب کے ماننے والوں کو مکمل آزادی دی مملکت کے ہر فرد کو تحفظ کا احساس ملا جس طرح مسجدیں محفوظ تھیں دیگر مذاہب کے عبادت خانے بھی محفوظ تھے۔ ہر مذہب کا ماننے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ قرآن کے سائے میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ جس نے اعلان کر رکھا ہے کہ دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد شام میں عظیم انقلاب آیا اور کہاں تو شام نصرانی اکثریت کا ملک تھا اور کہاں مسلم اکثریت کا علاقہ بن گیا تلوار کے زور پر نہیں نہ مال و دولت کا لالچ دے کر بلکہ اسلام کی برکتوں نے اہل شام کو یہ بتا دیا کہ یہی وہ دین ہے جو انسانیت کو ہر قسم کے جبر واستحصال سے نجات دلا سکتا ہے۔ اہل شام کو اسلام کی رحمتوں سے روشناس کرانے والا آج بھی شام کی خاک میں محو استراحت ہے۔

اسلامی حکومت کا چارٹر

اموی بادشاہ ہشام ابن عبدالرحمٰن نے آٹھ سال اسپین میں نہایت عدل وانصاف، خدا ترسی اور خیر سگالی کے ساتھ حکومت کی اسکا دور حکومت مثالی قرار دیا جاتا ہے آٹھ سال کے بعد وہ سخت علیل ہوا اور بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے اپنی موت کو یقینی جان کر اپنے لڑکے الحکم کو ولی عہد مقرر کیا اور موت کے وقت وصیت کی "میرے بیٹے تخت حکومت پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو کسی انسان پر ڈالی جاتی ہے۔ اس لیے

میرے بعد جب تم حکمران بننا تو امیر و غریب کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھنا ہر ایک کو عدل و انصاف کے ترازو پر تولنا حاکم کی نظر میں نہ کوئی اپنا ہوتا ہے نہ بیگانہ کسی کے ساتھ زیادتی اور ظلم نہ کرنا جو لوگ تمہارے محتاج اور تمہارے تابع ہیں ان سے نرمی کے ساتھ پیش آنا۔ انسانوں کے مرتبے میں کوئی فرق نہ کرنا جو حکام رعایا سے زیادتی کریں انہیں سخت سے سخت سزا دینا۔ سپاہیوں کو اس بات پر مامور کرنا کہ وہ عوام کے مال و جان کی حفاظت کریں۔ اس کے سوا انہیں کسی کام پر نہ لگانا۔ کیونکہ حکومت کا مقصد ہی یہ ہے کہ عوام کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اگر عوام کو تحفظ میسر نہیں تو حکومت کا ہونا نہ ہونا برابر ہے رعایا کے دلوں میں اپنے لیے نفرت نہ پیدا ہونے دینا۔ کیونکہ یہ نفرت حکومت کو کمزور کر دیتی ہے۔ سب سے زیادہ کسانوں اور کاشتکاروں کا خیال رکھنا کہ وہی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ان کی فلاح و بہبود کیلئے ہر وقت مستعد رہنا اور ہر موقع پر مدد کرنا۔ اگر تمہاری رعایا خوشحال رہی۔ اور اس نے تمہیں دعائیں دیں تو تمہاری دنیا بھی سدھر جائے گی اور عاقبت بھی سنور جائے گی۔ خبردار اقربا پروری اور خویش نوازی سے پرہیز رکھنا کیونکہ یہ چیزیں رعایا کے درمیان حسد پیدا کرتی ہیں۔ اور حسد کی آگ سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔" ہشام نے یہ جملے کہے کلمہ پڑھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ آنکھیں اب قیامت ہی کے دن کھلیں گی لیکن ہشام نے دنیا سے چلتے وقت آنے والے حکمرانوں کو ایک چارٹر دے دیا تاکہ جب کبھی اسلامی فلاحی مملکت قائم ہو تو مسلم حکمران اس پر عمل کر کے فلاح دارین حاصل کر سکیں۔

عمر بن عبدالعزیزؒ میں تبدیلی

نمود و نمائش شان و شوکت اور جاہ جلال جناب عمر ابن عبدالعزیزؒ کی فطرت کا حصہ بن چکے تھے۔ کیا مجال کہ کپڑے پر شکن پڑ جائے اور وہ اسے استعمال کر لیں

زرق برق لباس میں جب اپنے شاندار گھوڑے پر سوار ہو کر بازار میں نکلتے تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے خوشبو ایسی کہ سڑکیں اور گلیاں مہک اٹھیں. قدرت نے مردانہ وجاہت بھی بخشی تھی. شاہی خاندان کے تعلق اور زیب و زینت نے اس کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کھلنڈرا اور عیش و نعمت میں پلا ہوا نوجوان کبھی درویشی بھی اختیار کر سکتا ہے. لیکن ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اور وہ وقت ایک دن آن پہنچا، جامع مسجد دمشق میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھ پر لوگوں نے خلافت کی بیعت کی بیعت ہوتے ہی جناب عمر بن عبدالعزیزؒ کے کاندھے جھک گئے۔

اب نہ تمکنت ہے نہ شان و شوکت شادیانے بجاتے نہیں بلکہ روتے ہوئے مسجد سے باہر نکلے۔ نقیب نے عرض کیا عالی جاہ! یہ دس آراستہ گھوڑے کھڑے ہیں سواری کے لیے جسے پسند فرمائیں سوار ہو جائیں یہ سب کے سب شاہی محل سے لائے گئے ہیں. فرمایا یہ گھوڑے میرے لیے نہیں بلکہ بیت المال کے ہیں فرمایا میرے لیے میرا خچر ہی کافی ہے. آپ اس پر سوار ہو گئے اور قیام گاہ کی طرف تشریف لے گئے۔ دوسرے دن جب شاہی محل میں تشریف لائے تو قیمتی پردے دیکھ کر فرمایا کہ یہ کیا فضول خرچی ہے انہیں اتار کر فروخت کر دو اور رقم کو بیت المال میں جمع کر دو تاکہ وہ رقم غریبوں کی مالی مشکلات حل کرنے پر خرچ کی جا سکے دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور لمحہ بہ لمحہ ان کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا کہ خلیفہ بنتے ہی اس شخص کے اندر کیا تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ نہ خدم و حشم رہا نہ زیب و زینت اس درویش خلیفہ نے ایسی سادگی سے زندگی گزاری کہ فاروق اعظمؓ کا دور لوگوں کو یاد آنے لگا۔

مملکت میں کوئی بھی غریب نہ رہا، جرائم کا خاتمہ ہو گیا ایسی فراوانی اور کشادگی بعد کے کسی دور میں دیکھنے میں نہ آئی ایک شخص نے دیکھا کہ خلیفہ کے گریبان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ازراہ ہمدردی کہا امیر المومنین! خدا

نے آپ کو سب کچھ دے رکھا ہے کاش کہ آپ عمدہ کپڑے پہنتے۔ آپ نے سر جھکا لیا اور فرمایا میانہ روی عقل کی حالت میں اور عفو و کرم قدرت کی حالت میں سب سے بہتر ہے۔

سلیمان بن عبد الملک کا وعدہ

دو ہی مسافر تھے۔ رات کا وقت اور ریگستان کا سناٹا۔ کہ بادل اور طوفان نے آگھیرا۔ بادل تو جلد ہی چھٹ گئے۔ لیکن طوفان تھا۔ کہ تھا ہی پھیلا تا منہ پھاڑے چلا آرہا تھا۔ آدمی کیا چیز ہے۔ چٹانیں ادھر ادھر لڑھک رہی تھیں۔ کہ دونوں مسافروں نے ایک پہاڑی کی آڑ لے لی۔ بجلی چمکنے لگی۔ اور ساتھ والی پہاڑی پر گری اور اسے پاش پاش کر دیا خلیفہ سلیمان بن عبد الملک اب اپنی ساری شان و شوکت بھول چکا تھا۔ موت اس کے سامنے تھی کیونکہ اسے نظر آرہا تھا۔ کہ اب شاید اسی پہاڑی پر بجلی گرے گی جس کے سائے میں وہ پناہ لیے ہوئے تھا۔ اس وقت اس کا رفیق اس کے قریبی عزیز حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس نے فوراً ایک لاکھ کی تھیلی اپنے سامان سے نکالی اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ کہ یہ ایک لاکھ کی تھیلی منزل پر پہنچ کر محتاجوں میں تقسیم کر دینا۔ یہ میری جان کا صدقہ ہے۔ شاید اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ یہ بلا ہم لوگوں کے سر سے ٹال دے۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جو خلیفہ سلیمان کی حرکتوں سے واقف تھے۔ اور چاہتے تھے کہ اسے نصیحت کریں اور سیدھے راستے پر لگا دیں۔ اسی طرح کے موقع کی تاک میں تھے۔ انہوں نے موقعہ مناسب سمجھا اور خلیفہ سے فرمایا امیر المومنین اس وقت آپ اور میں صرف دو آدمی اس ویرانے میں موجود ہیں اور ہم دونوں کا گواہ اللہ تعالیٰ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی بجلی گرے اور ہم دونوں کو راکھ کر کے چلی جائے۔ آپ کی حکومت اور دولت آپ کے کسی کام نہیں آسکے گی۔ ایسا ہی ایک میدان آئندہ

بھی درپیش ہوگا۔ جسے نبیوں کی زبان میں میدان حشر کہا جاتا ہے۔ ہمیں اور آپ کو ایک دن اس میدان میں بھی کھڑے ہونا ہے۔ اور اپنے مالک کے سامنے جوابدہی کرنی ہے۔ اس دن کا تصور کیجئے۔ اور اپنی بے لبسی کا یہ ایک لاکھ درہم خیرات کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ اس وقت خدا سے وعدہ کیجئے کہ آپ نے بنو ہاشم کی جن زمینوں پر زور اور ظلم سے قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ وطن واپس پہنچ کر انہیں واپس کر دیں گے۔ سلیمان بن عبدالملک نے جو خوف سے لرز رہا تھا عمر بن عبدالعزیزؒ سے وعدہ کر دیا۔ اب طوفان تھم چکا تھا۔ چاند نکل آیا تھا وطن واپس پہنچ کر سلیمان نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور تمام ضبط شدہ جائیدادیں ان کے مالکوں کو واپس کر دیں۔ ہم کسی کی ملکیت زمین یا مکان پر ناجائز قبضہ کرتے وقت یہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمیں ایک روز داور محشر کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے۔

نگاہِ مردِ مومن

جس زمانے کی بات ہے اس وقت ٹیونس حکومت مصر کے ماتحت تھا اور مصر کا حکمران مقوقس تھا اور اس نے ابو ثوب کو ٹیونس کا گورنر مقرر کر رکھا تھا۔ حکومت واقتدار ایسی چیز ہے کہ اس کا لالچ رشتوں کی پرواہ کرنے نہیں دیتا مقوقس کے بیٹے نے خود اپنے باپ کو قتل کر دیا ٹیونس کے گورنر ابو ثوب نے موقع غنیمت جان کر خودمختاری کا اعلان کر دیا اور بڑی شان وشوکت سے حکومت کرنے لگا۔ اتنے میں اسلامی لشکر نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی سرکردگی میں مصر پر حملہ کیا اور فتح یاب ہو کر وہاں اسلامی حکومت قائم کر دی۔ چونکہ پہلے ٹیونس مصر کا ایک صوبہ تھا اس لیے حضرت یزید بن عامرؓ ابو ثوب سے خراج وصول کرنے گئے ابو ثوب کے دور حکومت میں تمام زراعت کا انحصار بارش پر تھا اس نے کچھ تالاب

بنوا رکھے تھے جن میں بارشوں کے زمانے میں اتنا پانی جمع ہو جاتا کہ دوسرے سال تک کافی ہوتا۔ گرمی کے زمانے میں جب بارشوں کا سلسلہ موقوف ہو جاتا تو لوگ انہیں تالابوں سے اپنے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتے اتفاقاً گزشتہ سال بارش نہیں ہوئی تھی تالاب اور حوض خشک پڑے تھے اور لوگ امید و بیم سے آسمان کی طرف تک رہے تھے عین اسی زمانے میں حضرت یزید بن عامرؓ ابو ثوب کے پاس خراج وصول کرنے پہنچے ابو ثوب غصہ سے سرخ ہو گیا اور بولا "صوبہ کی حالت نہیں دیکھتے ؟ چلے آئے خراج وصول کرنے ۔ اگر تم مسلمان لوگ ایسے ہی ہو اور تمہارے رسول سچے رسولؐ ہیں تو ان کے وسیلہ سے دعا کرو بارش ہو جائے ہم لوگ بھی تمہارے دین کی صداقت کو مان لیں گے" یہ بہت بڑا چیلنج تھا جس سے حضرت یزید بن عامرؓ کا سابقہ تھا۔ انہوں نے انتہائی عاجزی کے ساتھ ایک کونے میں جا نماز بچھایا صلوٰۃ حاجت پڑھی اور دست دعا دراز کیا۔ ابن عامرؓ نے ابھی دعا ختم نہیں کی تھی کہ تیز بارش شروع ہو گئی اور اس طرح تیونس کے عوام حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ابوبکر صدیقؓ اور حلوا

بیوی کو اس بات کا علم تھا کہ شوہر کو کھانا کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھانے کا شوق بہت زیادہ ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ کھانے کے بعد میٹھا کھانا سنت ہے مگر وہ اپنی سخت کوشش کے باوجود میٹھے کا انتظام نہیں کر سکتی تھی کیونکہ بیت المال سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ کھانے کی تیاری میں صرف ہو جاتا تھا لیکن بیوی تھی گرہستن اور کفایت شعار اس نے روزانہ کے اخراجات میں سے پیسہ دو پیسے بچانا شروع کیے اس طرح کافی دنوں کے بعد وہ اس قابل ہو گئی کہ کوئی میٹھا کھانا تیار کر سکے چنانچہ ایک دن آٹا اور گھی

اور کھجور کا گڑ لائی حلوا تیار کیا اور رات کے کھانے کے بعد خوشی خوشی شوہر نامدار کی خدمت میں پیش کیا۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ خلیفہ راشد بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کی پسندیدہ چیز ان کے سامنے رکھی گئی تھی مگر انہوں نے بیوی سے دریافت فرمایا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ حلوا کس طرح تیار کیا میرا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آ گئے کہ تم نے یہ حلوا تیار کر لیا؟ یہ سوال سن کر بیوی سناٹے میں آ گئی کیونکہ وہ خلیفہ کے مزاج سے واقف تھی وہ یہ جانتی تھی کہ یہ تو وہ شخص ہے جو خلیفہ بننے کے دوسرے ہی دن کپڑوں کے تھان کندھے پر رکھ کر بچوں کے لیے روزی کمانے نکل گیا تھا کہ راستے میں عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوئی انہوں نے دریافت کیا ابوبکرؓ! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ اب آپ امیر المؤمنین ہیں خلیفۃ الرسول ہیں آپ کے شایان شان نہیں کہ کپڑوں کے تھان کندھے پر لاد کر گلی گلی پھریں اور روزی کمائیں۔ جناب ابوبکرؓ نے جواب دیا آخر یہ تو بتاؤ کہ میں اپنے بال بچوں کو کیا کھلاؤں؟ تجارت کرنا تو میرا پیشہ ہے اس وقت سیدنا عمر فاروقؓ نے مجلس شوریٰ بلائی اور بالاتفاق فیصلہ ہوا کہ خلیفہ اور ان کے بال بچوں کے روزانہ کھانے کے اخراجات بیت المال سے ادا کر دیے جائیں اور سال میں دو جوڑے کپڑے ایک جوڑا گرمی کا اور ایک جوڑا سردی کا انہیں بیت المال سے فراہم کئے جائیں بیوی نے عرض کیا خلیفہ! بیت المال سے جو روزینہ آتا ہے اس میں سے پیسہ دو پیسہ بچا کر میں نے اکٹھا کیا اور اس میں سے آپ کے لیے میں نے یہ حلوا تیار کیا ہے۔ خلیفہ نے حلوے سے ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے روزینہ میں میری ضروریات سے دو پیسے زیادہ آتے ہیں۔ ہاتھ دھو کر دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی وقت بیت المال کے خزانچی کو حکمنامہ لکھا کہ میرے روزینہ میں سے دو پیسے کم کر دیے جائیں کیونکہ یہ ضروریات سے زیادہ ہیں جب اس طرح کے مسلم حکمران تھے تو اسلامی مملکت پر رحمت خداوندی کی بارشیں ہوتی تھیں۔ اب نہ وہ حکمران ہیں اور نہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمتیں۔

باب۵

عدل وانصاف

عہدۂ قضاء کی ذمّہ داری

جس وقت خلیفہ مقتدر باللہ کی ماں نے قاضی ابو جعفر کو محل میں طلب کیا اسی وقت اس کا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو سیدہ مجھ سے کوئی غلط کام کروانا چاہتی ہے کیونکہ اس نے ایک وقف زمین کے کاغذات کے ساتھ قاضی ابو جعفر کو طلب کیا تھا۔ زمین موقوفہ تھی اور باوجود اس کے کہ موقوفہ زمین کو خریدنا جائز نہیں شہزادی نے اسے خرید لیا تھا۔ زمین کی رجسٹری کے کاغذات دیکھنے کے بعد اس نے قاضی ابو جعفر سے کہا کہ میں اس کاغذ کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں تاہم قاضی ابو جعفر کا شمار بڑے ذہین اور جہری قاضیوں میں ہوتا تھا۔ ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے اندازہ لگا لیا کہ چوں کہ شہزادی وقف زمین خرید چکی ہے' اور اب یہ چاہتی ہے کہ اس وقف کو باطل کر دے' اس لیے غالباً وہ دستاویز لے کر پھاڑ دے گی۔ اس نے کہا سیدہ! اللہ تعالیٰ آپ کی عزت دے میں مسلمانوں کے کاغذات کا امین ہوں لہٰذا یا تو آپ اصول کے مطابق مجھے اپنے فرائض ادا کرنے دیں یا پھر مجھے اس عہدے سے ہٹا کر اپنا کوئی پسندیدہ آدمی یہاں لے آئیں پھر اس سے جو چاہیں کرائیں جب تک میں اس عہدے پر موجود ہوں کسی قیمت پر یہ بد دیانتی کروں گا نہ کسی کو کرنے دوں گا چاہے اس کے لیے میری گردن کیوں نہ کاٹ دی جائے۔ دستاویز اٹھایا سلام کیا اور محل سے رخصت ہو گیا۔ قاضی کی شکایت شہزادی نے اپنے بیٹے مقتدر باللہ سے کی۔ مقتدر باللہ نے قاضی کو طلب کیا اور حقیقت دریافت کی۔ قاضی ابو جعفر نے بے کم و کاست سارا واقعہ بیان کر دیا اور خلیفہ سے کہا کہ اگر میرا یہ رویہ آپ کو ناپسند ہے تو میرا استعفیٰ قبول فرمایا جائے تھوڑی دیر کے لیے مقتدر باللہ سکتے میں آگیا شاید اس کی نگاہ میں اس وقت قاضی شریح کی عدالت کا منظر آگیا تھا مقتدر باللہ سنبھل گیا اور کہا ابو جعفر! بے شک تمہارے ہی جیسے لوگ عہدۂ قضا کے قابل ہیں۔ سن لو اگر کسی وقت میرے خلاف بھی تمہیں کوئی فیصلہ کرنا پڑے تو بے دھڑک کرنا یہ تمہارا فرض ہے۔ اقتدار کو عدلیہ ہی لگام دے سکتی ہے اور ایک اسلامی مملکت میں عدلیہ

خودمختار و آزاد ہوتی ہے۔

رشوت کی سزا

علی ابنِ حمود خود سے حکمران نہیں بنا تھا۔ بلکہ جب سلیمان کے وقت میں اندلس میں طوائف الملوکی اور رشوت کا بازار گرم ہوا تو اہل قرطبہ نے افریقہ کی حکومت کے حاکمِ اعلیٰ علی ابن حمود کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ علی ابنِ حمود بڑا ذہین اور اونچے درجے کا سپہ سالار تھا۔ اس نے قرطبہ پر قبضہ کرتے ہی جو سب سے اہم فیصلہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ چاہے کچھ بھی کرنا پڑے ملک سے وہ رشوت کا خاتمہ کر کے رہے گا۔ کیونکہ رشوت کسی قوم کے جسم کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ناسور رکھتا ہے۔ جب قوموں کی تباہی کا وقت قریب آجاتا ہے تو رشوت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

جو غیر مستحق کو اونچے عہدے پر کر دیتا ہے اور اہل لوگ گمنامی کے گوشوں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ علی ابن حمود نے اعلان کیا کہ جو شخص ناجائز طور پر کسی کا مال لے گا اسے خوفناک سزا دی جائے گی۔ ایک دن علی ابن حمود نے ایک سپاہی کو دیکھا کہ وہ گھوڑے پر انگوروں کی ایک ٹوکری لادے چلا جا رہا ہے۔ اس نے اسے روکا اور سپاہی سے پوچھا کہ تم نے یہ انگور کہاں سے لیے۔ سپاہی نے بے پروائی سے جواب دیا "جہاں سے ایک سپاہی لے سکتا ہے"۔ ابن حمود سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو اس نے کسی باغ والے کے باغ سے انگور جبراً اتڑوائے ہیں۔

چنانچہ سپاہی نے اعتراف کر لیا۔ ابن حمود نے حکم دیا کہ اس سپاہی کی گردن اڑا دی جائے اور اس کا سر انگوروں کی اسی ٹوکری میں رکھ کر اس طرح شہر میں پھرایا جائے کہ اس کا پورا جسم گھوڑے کی پشت سے بندھا رہے۔ اور اعلان کرنے والا آگے آگے اعلان کرتا رہے کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو رعایا پر ظلم یا زیادتی کریگا۔
بظاہر یہ ایک سخت سزا تھی لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئندہ کسی کو رشوت لینے یا

کسی پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ اور قرطبہ امن کا گہوارہ اور شانتی کی سرزمین بن گیا۔

امنِ عامّہ اور اسلامی حکومت

چوتھے خلیفۂ راشد سیّدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ مدینے سے باہر سفر میں جا رہے تھے کہ انہوں نے ایسا منظر دیکھا کہ انہیں اپنی سواری سے اتر جانا پڑا۔ دیکھا کہ دو نوجوان آپس میں گتھم گتھا ہیں مولا علی کرم اللہ وجہہٗ نے سواری روکی اور جا کر ان دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ لڑنے جھگڑنے سے منع فرمایا اور آگے چل پڑے۔
ابھی دو چار ہی قدم آگے بڑھے ہونگے کہ آواز آئی "خداوندا میری مدد فرما" حضرت فوراً واپس مڑے اور اس آواز دینے والے کے پاس پہنچ گئے۔ فرمایا "مدد آگئی"۔ یہ آواز دینے والا وہی نوجوان تھا جو کچھ دیر پہلے دوسرے نوجوان سے گتھم گتھا تھا۔ نوجوان نے کہا "امیر المومنین! میں نے اس آدمی سے کپڑے کا سودا اس شرط پر کیا تھا کہ یہ مجھے کھوٹے درہم نہیں دے گا۔ میں نے اسے کپڑے دیدیے لیکن اس نے میرے ساتھ فریب کیا اور مجھے کھوٹے سکے پکڑا دیے۔ اب جو میں انہیں واپس کر رہا ہوں تو یہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے مجھے ایک طمانچہ بھی مارا ہے"۔ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا "سکہ بدلوانے کی تم فکر نہ کرو یہ تو میری ذمے داری ہے کہ میں کھوٹے سکوں کے بجائے کھرے سکّے تمہیں دلوا دوں البتہ طمانچہ مارنے کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے"۔ نوجوان نے فوراً ہی دو گواہ پیش کر دیے جنہوں نے تصدیق کی کہ واقعتہً دوسرے نوجوان نے اس کو طمانچہ مارا ہے۔ اب مجرم کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے پکڑ لیا اور نوجوان سے کہا کہ تم بدلے میں اس کو اسی طرح طمانچہ مارو جس طرح اس نے تمہیں مارا تھا۔
نوجوان نے کہا "امیر المومنین! میں نے اسے معاف کر دیا"۔ آپؓ نے فرمایا

اس کا تمہیں اختیار ہے خواہ بدلہ لو یا معاف کر دو۔ بحیثیت حکمران کے میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا۔ لیکن اس مجرم پر حکومت کا ایک حق ابھی بھی عائد ہے وہ یہ کہ اس نے معاشرے کے امن کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ وعدہ کیا اور وعدہ خلافی کی۔ اور اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے طاقت کا استعمال کیا۔ حکومت اس حق کو نہیں چھوڑے گی کیونکہ امن عامہ کو برقرار رکھنا اور کمزوروں کے حقوق کی حفاظت کرنا ایک اسلامی حکومت کا فریضہ ہے اس لیے میں حکم دیتا ہوں کہ اس مجرم کو درے لگائے جائیں۔

جس وقت مجرم کو درے لگائے جا رہے تھے تاریخ اس منظر کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رہی تھی تاکہ آنے والی نسل انسانیت کے لیے سند رہے اور امت مسلمہ اپنے ماضی کی اساس پر مستقبل کی تعمیر کر سکے۔

رشوت کی ایک شکل

قبیلۂ ازد کی زکوٰۃ جمع کر کے مالِ زکوٰۃ سے لدے پھندے جب حضرت ابن اللتبیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو شہر میں دھوم مچ گئی۔ اونٹوں کی قطاریں، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، شہد اور درہم و دینار مسجد نبوی میں ڈھیر لگ گئے۔ فقرائے مدینہ نے دل میں سوچا کہ اب تو شاید ہمارا مقدر ہی سنور گیا کیونکہ یہ ساری دولت اور مال مویشی ہمیں لوگوں کے درمیان تقسیم ہوں گے۔ ہمارے تو دلدر ہی دور ہو جائیں گے۔ اور زکوٰۃ کے نظام کو نافذ کرنے میں شریعت نے مصلحت ہی یہی رکھی ہے کہ مال امیروں سے لے کر غریبوں کی طرف لوٹا دیا جائے۔ اس کی وجہ سے چند ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز نہیں ہوتا اور سائل و محروم کو ان کا حق مل جاتا ہے۔ مال میں بڑھوتری ہوتی ہے اور معاشرے کے افراد کے درمیان اخوت، محبت، مواخات، ہمدردی اور بھائی چارہ کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ دنیا کے تمام معاشی مسائل کا حل دولت کی منصفانہ تقسیم میں ہے اور زکوٰۃ کا نظام اسی منصفانہ تقسیم کا پیش خیمہ ہے۔ مدینہ کے فقراء نے دیکھا کہ صبح

کے وقت جو زکوٰۃ لے کر ابن لتبیہ آئے تھے وہ سارا سامان آدھا ہو چکا ہے جب
ابن لتبیہ نے یہ کیا کہ آدھا مال تو اس میں سے نکال کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے
کیا اور آدھا مال الگ کر کے آپؐ سے عرض کیا کہ یہ مال جو میں نے آپؐ کو دیا ہے
یہ تو مالِ زکوٰۃ ہے اور یہ آدھا مال جو میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے یہ وہ ہے جو
قبیلۂ ازد کے لوگوں نے بطور تحفہ مجھے دیا ہے۔ چہرہ نبوت سرخ ہو گیا حضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے ایسا لگتا جیسے شعلے نکل رہے ہوں۔ فرمایا ابن
لتبیہ! یہ تو بتا کہ اگر تو اپنے باپ اور ماں کے گھر میں بیٹھا رہا ہوتا تو میں تجھے عاملِ
زکوٰۃ بنا کر نہ بھیجتا تو کیا یہ تحفے تجھے ملتے۔ لوگو یہی رشوت ہے۔ خبردار ایسا
نہ ہو کہ قیامت کے دن تم اس حال میں اللہ کے سامنے حاضر کیے جاؤ کہ تمہاری
پیٹھ پر کوئی اونٹ کوئی گائے اور کوئی بکری سوار ہو۔ یعنی عہدے سے ناجائز فائدہ
اٹھانا بھی رشوت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا اے اللہ! میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تیرا
حکم تیرے بندوں تک پہنچا دیا۔

گواہی کی اہمیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک
مصلّٰی ہی پر تشریف فرما رہا کرتے تھے۔ سورج کے بلند ہو جانے کے بعد اشراق کے
نوافل ادا فرماتے اور پھر اس کے بعد اپنے دیگر معمولات میں مصروف ہو جاتے۔ مگر
حضرت خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن نمازِ فجر کے بعد مصلّٰی پر بیٹھے رہنے
کے بجائے آپ کھڑے ہو گئے اور ہماری طرف متوجہ ہو کر آپ نے تین مرتبہ ارشاد
فرمایا "جھوٹی گواہی دینا اور شرک کرنا دونوں برابر کے گناہ ہیں" اتنا کہنے کے بعد آپ
نے سورۂ حج کی دو آیتوں کی تلاوت فرمائی جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "تم بتوں کی ناپاکی سے
دور رہو اور جھوٹی بات کہنے سے دور رہو اور خدا کے لیے یکسو ہو جاؤ۔ شرک

چھوڑ کر توحید اختیار کرو" ان آیات میں جھوٹی بات کہنے سے آپؐ کی خصوصی مراد جھوٹی گواہی دینا ہے۔ یوں تو جھوٹ بولنا گناہِ کبیرہ ہے۔ اور قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے لیکن عدالت میں جھوٹی گواہی دے کر ناحق کو حق بنانا اور بے قصور کو قصور وار ٹھہرا دینا تو بہت ہی بڑا گناہِ کبیرہ ہے کیونکہ گواہی دراصل ادائے امانت ہے جسے چھپا لینا گویا امانت میں خیانت کرنے کے مثل ہے۔ اسی لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرک کے برابر کا گناہ قرار دیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ گواہی میں اکثر حق اللہ کے ساتھ حق العباد بھی شامل ہوتا ہے جو اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتا جب تک صاحبِ حق اسے معاف نہ کر دے۔ اس لیے یہ بہت ڈرنے کا مقام ہے۔ بندہ جب عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ دراصل حاکم کے سامنے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے جو دلوں کے راز جاننے والا سمیع و بصیر مالک الملک ہے۔ اسی لیے بیہقی کی ایک روایت میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی دے کر گواہ ابھی اپنی جگہ سے ہٹتا نہیں کہ اس پر جہنم واجب ہو جاتی ہے۔ آج کل تو جھوٹی گواہی کو ایک فن سمجھا جاتا ہے۔ واقعات کو مسخ کر دینا اور چند وقتی فائدوں کے لیے ایمان کا سودا کرنا فن نہیں بلکہ حماقت ہے۔ ایسی حماقت جس کے نتیجے میں دنیا کی نامرادی اور ذلت کے ساتھ آخرت کا کبھی نہ ختم ہونے والا ابدی عذاب ہے۔ بھلا کوئی مومن ایسے گھاٹے کا سودا کر سکتا ہے۔

مسلمان سپاہی کا کردار

مصر کی فتح کے سلسلے میں اسلامی لشکر جنگل کی آگ اور سیلاب کے پانی کی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ جس علاقے پر قبضہ کر لیتا غیر مذہب سے تعلق رکھنے کے باوجود اس علاقے کے بسنے والے مسلمانوں کے برتاؤ کو دیکھ کر انہیں رحمت خداوندی تصور کرتے۔ اور اطاعت گزار و فرمانبردار بنتے چلے جاتے۔ اس لشکر کے سردار حضرت

عمرو ابن العاصؓ تھے۔ مصر کا بادشاہ مقوقس سخت حیران تھا کہ باوجود تمام تر جنگی تیاریوں، بھاری لشکر، اسلحہ اور سامانِ رسد کے کم تعداد میں ہونے کے باوجود آخر مسلمان کیوں غالب آتے جا رہے ہیں۔

کوئی مادی اور ظاہری وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پے در پے شکستوں سے وہ بوکھلا گیا تھا۔ اتفاق سے ایک شکست خوردہ لشکر میدان جنگ سے واپس آیا تو مقوقس نے اس کے چند سمجھ دار سرداروں کو دربار میں طلب کیا اور ان سے دریافت کیا کہ تم نے مسلمانوں کو کیسا پایا؟ سرداروں نے جواب دیا کہ بادشاہ ہم اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جو موت کو زندگی سے زیادہ عزیز اور محبوب رکھتی ہے۔ اور میدانِ جنگ میں اپنی جان سے اس طرح کھیلتی ہے جیسے بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔

اس قوم کا کوئی فرد دنیا کو مرغوب نہیں رکھتا۔ ہر فرد کبر و نخوت سے خالی ہے اور تواضع کو پسند کرتا ہے۔ سپاہی اور سردار سب ایک ساتھ بیٹھ کر زمین پر کھانا کھا لیتے ہیں۔ ان کے امیر و غریب اس طرح مساوات سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کون چھوٹا ہے کون بڑا کون غلام ہے اور کون آقا۔ جب ان کی نماز کا وقت آتا ہے تو کوئی بھی ایسا شخص باقی نہیں رہتا جو عبادت میں حاضر نہ ہو۔ وہ نماز سے پہلے منہ ہاتھ دھوتے ہیں پھر نہایت عاجزی کے ساتھ ایک ہی صف میں اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے ہیں اور مصیبت زدہ سے سب ہمدردی کرتے ہیں۔

مقوقس نے یہ جواب سن کر کہا کہ اگر یہ قوم پہاڑ کو اکھیڑنے کا ارادہ کرے گی تو یقیناً اس میں کامیاب ہوگی۔ دنیا میں کوئی بھی لڑ کر اس قوم کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مقوقس کا یہ اعتراف دراصل دشمن کی دی ہوئی ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ صحیح فضیلت وہی ہوتی ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی مجبور ہو جائے۔

اقلیتوں کا احترام

مفتوحہ علاقے کے سابق بادشاہ کا بیٹا اگرچہ غیر مسلم تھا اور مسلمان حکمران نے اس کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا مگر وہ مسلمانوں کے اخلاق اور رواداری سے اتنا متاثر تھا کہ وقتاً فوقتاً آذربائیجان کے گورنر جناب عبدالرحمٰن ابن ربیعہ سے ملنے چلا آتا تھا۔ اور عبدالرحمٰن ابن ربیعہ بھی اس سے نہایت شائستگی اور شفقت سے ملتے تھے۔ کیونکہ اسلام کی تعلیم یہی ہے۔ مخالف سے مخالف شخص کے ساتھ بھی اسلام بداخلاقی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے جو دنیا میں غلبہ حاصل کیا وہ اخلاق ہی کے ذریعے حاصل کیا۔ کیونکہ تلواروں سے جسم پر تو قبضہ کیا جا سکتا ہے دل پر نہیں۔

جناب عبدالرحمٰن ابن ربیعہ کے پاس شہزادہ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ عبدالرحمٰن کی نظر شہزادے کی انگلی پر پڑی جس میں ایک نہایت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی تھی ہیرے کی چمک گورنر عبدالرحمٰن کی آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ گورنر نے پوچھا شہزادے! اتنا قیمتی ہیرا تمہیں کہاں سے ملا۔ شہزادے نے کہا کہ میرے باپ نے ایک حکمران کو لکھا تھا تو اس نے انہیں بھیجا تھا یہ بہت ہی بیش قیمت اور خوبصورت ہیرا ہے۔ اگر آپ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے جواب دیا ہرگز نہیں مسلمان جب کسی ملک پر حملہ کرتا ہے تو اس کا مقصد لعل و جواہر اور سونا چاندی جمع کرنا نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنا اور انسانیت کے مظلوم طبقات کو ظلم سے نجات دلانا ہوتا ہے۔ آذربائیجان کے گورنر عبدالرحمٰن ابن ربیعہ کے اس طرز عمل سے شہزادہ اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور کہا کہ اگر اس وقت کوئی میرا ہم مذہب ایرانی حاکم ہوتا تو مجھ سے یہ انگوٹھی زبردستی چھین لیتا۔ مگر تمہارے اندر صحیح معنوں میں ایک مسلمان کا کردار پایا جاتا ہے۔ اسی کردار نے مجھے تمہارے مذہب کی صداقت و حقانیت کا قائل کر دیا ہے۔

اسلامی حکومت کی غرض وغایت

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو پہلی مرتبہ جو شورائی اور جمہوری نظام عطا فرمایا اس میں یہ ضروری قرار دیا کہ حکمران عوام کے ذریعہ معاش کی ذمے داری اپنے اوپر لے اور ان کی معاشی کفالت کا بار اٹھائے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مسلمان حکمران کی یہ بھی ذمے داری قرار دی کہ وہ عوام کے اخلاق وعادات بھی سنوارے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا ایسا جامع اور مؤثر نظام قائم کرے کہ خود بخود نیکی پروان چڑھنے لگے اور برائی پامال ہو جائے۔ اسلامی نظامِ حکومت کے تحت قائم ہونے والی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ عوام کے اعمال وافعال، طریقِ بود وماند، معاملات اور باہمی لین دین کی بھی نگرانی کرے انہیں ایک دوسرے کا دوست بنائے۔ ان میں ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی پیدا کرے کیونکہ اچھے معاشرے کی تخلیق اس کے سوا ممکن نہیں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام تر توجہ عوامی اخلاق کو سنوارنے پر مبذول فرمائی۔ آپ نے مسلمانوں کے بازاروں کی نگرانی۔ تجارت اور کاروبار کے اصول وضع فرمائے۔ بذاتِ خود تاجروں کے پاس تشریف لے گئے اور انہیں شریفانہ تجارت کے طریقے بتلائے آپ نے باہمی رشتوں کو مضبوط بنانے پر زور دیا حقوق و فرائض کا تعین فرمایا۔ بڑوں کو حکم دیا کہ وہ چھوٹوں پر رحم کریں چھوٹوں پر واجب کیا کہ وہ بڑوں کا ادب کریں۔

آپ نے بتایا کہ اچھی حکومت وہ ہے جس کا حاکم بھی اچھا ہو اور محکوم بھی فرض شناس وخوش اخلاق ہوں۔ ایک دوسرے کے بہی خواہ ہوں عوام کو اپنے حکمران پر اعتماد ہو اور حکمران عوام کا خیر خواہ ہو آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اچھا اخلاق آدھا دین ہے۔ مومنین میں سب سے کامل ایمان والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔ ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ " انسان اپنے اچھے اخلاق کے سبب آخرت کے بلند درجات تک پہنچ جاتا ہے خواہ وہ عبادت کے اعتبار سے پیچھے ہی کیوں نہ ہو۔

اور عبادت کے باوجود آدمی اپنے برُے اخلاق کی بدولت جہنم کے نچلے طبقے میں پہنچ سکتا ہے۔"

آپ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ "نرم مزاج اور خوش اخلاق آدمی دنیا اور آخرت دونوں جگہ کا سردار ہے۔"

مختصر یہ کہ اسلامی حکومت کی غرض و غایت ہی ایک صالح معاشرے کا قیام ہے۔

لشکرِ اسلام کا کردار

محدثین کی جماعت نے امام نسائیؒ جن کا اصل نام احمد اور کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی، کوئی غیر معروف آدمی نہیں ہیں ساری دنیا کے علماء اور محدثین ان کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ امام ابو علی نیشاپوری اور امام احمد ابن محمد طحاوی نے کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے بجا طور پر امام تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں بھی طاق تھے۔ رات اور دن کا بیشتر حصہ خدا کی عبادت اور ذکر و فکر میں گزارتے مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ صوم داؤدی کے پابند تھے یعنی ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ حج بھی اکثر کیا کرتے تھے اور جہاد کا ولولہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو ایسی بے پناہ شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا کہ لوگ دیکھ کر حیران ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر صحابہ کرام یاد آتے تھے یعنی رات کو زاہد شب زندہ دار اور دن کو میدان جہاد کا شہسوار۔ وہ جس طرح قلم کے دھنی تھے ویسے ہی تلوار کے بھی دھنی تھے۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے تو عاشق زار تھے۔ انہوں نے امیر المومنین کرم اللہ وجہہ کے مناقب میں ایک عظیم کتاب "خصائص علیؑ" نامی لکھی تھی جس پر شامی بہت ناراض ہوئے اور انہیں بڑی بے دردی سے پیٹا گیا چنانچہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے سن ۳۰۳ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ انتقال کے وقت ان کی عمر اٹھاسی سال تھی جب وہ اپنی زندگی سے ناامید ہو گئے تو انہوں نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ جیسے بھی ہو

مجھے لاد پھاند کر مکہ پہنچا دو۔ اکثر محدثین اور مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کی وفات مکہ میں ہوئی اور صفا اور مروا کے درمیان انہیں دفن کیا گیا۔ امام نسائیؒ کو نسائی اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت خراسان کے شہر نسا میں ہوئی۔ نسا کے معنی عورتیں ہوتی ہیں۔ اور نسا کو نسا اس لیے کہتے ہیں کہ خراسان کے چند علاقوں کو فتح کرتے ہوئے جب مسلم افواج شہر نسا کے قریب پہنچیں تو اس شہر کے تمام مرد اپنی عورتوں کو چھوڑ کر شہر سے بھاگ گئے۔ جب مسلمان فوجوں نے یہ دیکھا کہ شہر میں مرد ہیں ہی نہیں صرف عورتیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ شریعتِ اسلام کی رو سے عورتوں سے لڑنا یا ان کو قتل کرنا یا ان کی بے عزتی کرنا روا نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سپاہی بھی شہر میں داخل نہ ہوا اور شہر چھوڑ کر واپس آ گئے۔ یہ حالات جب ان مردوں کو معلوم ہوئے جو بزدلی کی وجہ سے تنہا اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے تو شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ اور عورتوں کو بھی سخت تعجب ہوا کہ آخر یہ کون سی قوم ہے جو اپنے اصول کی اتنی پابند ہے اور جس کا اخلاقی معیار اتنا بلند ہے کہ ہتھیار اٹھانا تو درکنار نظر اٹھا کر بھی انہوں نے کسی غیر محرم عورت کو دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ چند ہی دنوں بعد سارا شہر لشکر اسلامی کے سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا ہمیں بھی وہ کلمہ پڑھا دو جس کلمے نے تمہیں اخلاق وحسنِ معاشرت کا ایسا کامل نمونہ بنا دیا۔ ہم بھی اسی دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں جو دین ذروں کو آفتاب اور قطروں کو گہر کی آبرو بخشتا ہے۔

ع صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ!

عدالتِ اسلامی کا رویّہ

شروع شروع میں خلیفہ معتضد باللہ نے محکمہ قضا اپنے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ لیکن بہت جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس میں اس محکمہ کو چلانے کی اہلیت نہیں ہے چنانچہ اس نے اپنے دور کے ایک جیّد عالم ابو حازم کو قاضی مقرر کر دیا۔ اور وہ قرآن

وسنت کی روشنی میں اپنے فرائض ادا کرنے لگے۔ عین اسی زمانے میں بہت سے لوگوں نے ایک مقروض پر اپنے اپنے قرض کا دعویٰ دائر کیا۔ اور گواہ پیش کر کے ڈگری حاصل کر لی۔ قاضی ابو ہازم نے ان کی قرض کی رقم وصول کروا دی جب خلیفہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو چونکہ اس کی بھی کچھ رقم اس مقروض کے ذمے باقی تھی اس لیے اس نے قاضی ابو ہازم کو لکھا کہ مجھے اس کے خلاف مدعی سمجھ کر اس سے میرا مال بھی دلوا دیں۔ قاضی نے جواب دیا امیرالمومنین! مقروض کے ذمے لوگوں کی رقمیں باقی تھیں انہوں نے میری عدالت میں مقدمہ دائر کیا گواہ پیش کیے۔ میں نے گواہوں پر جرح کی اور جب ان کا حق ثابت ہو گیا تو میں نے ان کو ڈگری دے دی۔ اگر آپ بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کریں تو میں آپ کے دعوے پر بھی غور کرنے کو تیار ہوں۔ خلیفہ نے قاضی کو لکھا کہ میرے دعوے کے دو معزز ترین گواہ ہیں جن کے بارے میں جھوٹ بولنے کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی نے جواب میں لکھا کہ یہ دونوں شخص آپ کے نزدیک معزز ترین ہو سکتے ہیں جب تک یہ میرے سامنے پیش ہو کر گواہی نہ دے دیں اور میں ان پر جرح کر کے یہ اندازہ نہ لگا لوں کہ واقعتاً وہ قابلِ اعتبار ہیں یا نہیں اور شریعت اسلامیہ نے شہادت کا جو معیار مقرر کیا ہے وہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں یا نہیں میں ان کو معزز کس طرح تسلیم کر سکتا ہوں۔

اور ان کے بیان کی بنیاد پر کس طرح فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کا دعویٰ صحیح ہے اور آپ کے گواہ سچے ہیں تو آپ عدالت میں ان کو پیش کریں۔ گواہوں کو قاضی کا یہ رویہ پسند نہ آیا اور انہوں نے عدالت میں حاضری سے انکار کر دیا۔ خلیفہ کے وکیل نے ابو ہازم کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ لیکن جب گواہ پیش کرنے کا موقع آیا تو وہ پیش نہ کر سکا۔ اب قاضی کا قلم دوراہے پر کھڑا تھا ایک طرف خلیفہ کا وقار اور اس کے دعوے کی حرمت تھی اور دوسری طرف شریعت کا قانون جس سے کوئی بھی بالا و برتر نہیں ہے۔ فیصلہ کرنے میں ایک

لمحے کی دیر نہ ہوئی اور قاضی ابو حازم نے ثبوت نہ ہونے کی بنا پر خلیفہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ خلیفہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو مسکرایا اور فخر سے کہا الحمدللہ میں نے نقصان برداشت کر لیا لیکن شریعت کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار نہ کیا۔

ابن ابی عامر کا یادگار انصاف

اکلوتے بیٹے والدین کو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ بڑی منت مراد کے بعد قرطبہ کے گورنر ابن ابی عامر کو اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا بیٹا عنایت فرمایا تھا۔ بیٹے پر ماں باپ دونوں جان چھڑکتے تھے۔

بچے نے جب جوانی کی منزلوں میں قدم رکھا اور قد کاٹھ نکالا تو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ جوانی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابن ابی عامر کے بیٹے کو مردانہ حسن سے بھی مالا مال کیا تھا۔ حسین و جمیل نوجوان قرطبہ کے گورنر کا بیٹا لاڈ پیار میں پلا بڑھا لازماً مزاج میں تمکنت پیدا ہو گئی۔

ایک دن لڑکوں سے کسی بات پر الجھ پڑا تو ایک لڑکے کو بیدردی سے مارا اور مار مار کر لہولہان کر دیا۔ لڑکے کے والد نے قرطبہ کے گورنر ابن ابی عامر کے پاس مقدمہ دائر کر دیا۔ وہ بھی عجیب منظر تھا۔ جب باپ کے سامنے اس کے اکلوتے بیٹے کے خلاف مقدمہ پیش ہوا۔ ابن ابی عامر سخت کشمکش میں تھا۔ فرض اور محبت کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی۔

فرض کا تقاضا تھا کہ انصاف کا حق پورا کیا جائے لیکن اولاد کی محبت ہر لمحہ آڑے آ رہی تھی۔ بالآخر اسلامی نظامِ عدل کے تقاضے غالب آ گئے اور گورنر قرطبہ نے اعلان کیا کہ بر سرِ عدالت اس کے بیٹے کو بید مارے جائیں۔ گورنر نے جلاد کو حکم دیا کہ خوب زور سے بید مارنا تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ ناز و نعمت میں پلا ہوا

نوجوان ہر بید پر تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ اور رحم طلب نگاہوں سے باپ کو دیکھتا تھا۔
لیکن ایسا لگتا کہ گورنر قرطبہ پتھر کا ہو گیا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد باپ کے سامنے بیٹا بید زنی کی تکلیف نہ برداشت کرنے کی وجہ سے دم توڑ گیا۔ ابن ابی عامر نے حکم دیا کہ لاش کو گھر پہنچا دیا جائے۔ عدالت برخواست کر کے ابن ابی عامر جب گھر پہنچا تو وہاں کہرام بپا تھا۔ ماں کو غش پر غش آ رہے تھے۔ باپ بھی بیٹے کی لاش سے لپٹ کر خوب خوب رویا اور اپنی بیگم سے معذرت کرتے ہوئے کہا، بیگم! مجھے معاف کرنا میں باپ بعد میں ہوں اور قاضی پہلے قاضی کی حیثیت سے میں نے انصاف کیا اور باپ کی حیثیت سے رو رہا ہوں۔ ایک مسلمان حکمران کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی عدل کے تقاضوں کو فراموش نہ کرے۔ میں نے اولاد کو تو کھو دیا مگر مجھے خوشی ہے کہ اسلامی عدالت کے نام کو بٹہ نہیں لگایا۔"

اسلامی عدل کا ایک نمونہ

مامون کے عقائد و نظریات سے بحث نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ بڑی آن بان اور جاہ و جلال والا حکمران تھا۔ اس دور کی معلوم دنیا میں خلافت عباسیہ سے بڑی مملکت زمین کی پشت پر نہیں تھی۔ عباسی حکمرانوں کے دربار کی شان و شوکت کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ قیصر روم کا سفیر عباسی دربار میں آیا تو اس کی شان دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔

اتوار کا دن تھا۔ مامون اس دن ان مقدمات کی سماعت کرتا تھا جو سرکاری حکام اور شاہی خاندان والوں کے خلاف ہوتے۔ مامون تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اس کا بیٹا عباس اپنے باپ کی پشت پر کھڑا تھا کہ ایک بڑھیا پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں گرد و غبار میں اٹی ہوئی حاضر ہوئی۔ اس کے ظاہری حلیہ اور پریشان چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ دور و دراز علاقے سے سفر کر کے آ رہی ہے اور مظلوم و مقہور ہے۔

اس نے دربار میں آتے ہی کہا السلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ سلام وخطاب کا وہی مومنانہ طرز۔ وہی سادگی اور بدویانہ انداز۔ خلیفہ کو اس کا یہ طرز بہت پسند آیا سلام کا جواب دیا اور پوچھا:

ماں! تو کس کے خلاف فریاد کرنے آئی ہے۔ بڑھیا نے کہا امیر المومنین اسی کے خلاف میری فریاد ہے جو آپ کے پیچھے کھڑا ہے یعنی آپ کا بیٹا عباس۔ اس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ امرا اور حکام لرز اٹھے۔ دیکھیے بڑھیا کا کیا حشر ہوتا ہے۔ شاہزادے کے خلاف شکایت کی ہے۔ خود تاریخ ٹکٹکی باندھے فیصلے کی منتظر تھی کہ اسے اس فیصلے کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنا تھا۔ امیر المومنین مامون کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ حاجب احمد ابن ابی خالد کو حکم دیا ابو خالد! عباس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بڑھیا کے ساتھ کھڑا کر دو کہ اس وقت یہ شاہزادہ نہیں فریق مقدمہ ہے۔ بڑھیا ذرا بلند آواز میں اپنی داستان الم سنانے لگی تو ابو خالد نے اس سے کہا اللہ کی بندی! تجھے یاد رکھنا چاہیئے کہ تو امیر المومنین سے ہم کلام ہے۔ اتنی اونچی آواز میں بات نہ کر۔ مامون نے کہا "ابو خالد اسے بولنے دو کیونکہ حق نے اسے گویا اور باطل نے میرے بیٹے کو گونگا بنا دیا ہے۔ مقدمہ کی سماعت کے بعد مامون نے اپنے بیٹے کو بڑھیا کی جائیداد واپس کرنے کا حکم دیا اور اس ظلم پر اسے سزا دی۔ بڑھیا کی زمین کا تاعمر محصول معاف کر دیا اور اس کے لیے آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ گراں قدر سالانہ وظیفہ بھی مقرر کیا۔ کہ مامون اگرچہ ایک مستبد حکمران تھا مگر تھا تو مسلمان۔ نبی عادل صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ غلام۔

قیدیوں کیساتھ سلوک

دومۃ الجندل کے معرکے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فتح یابی کے بعد

بہت ساما لِ غنیمت ملا۔ مگر سب سے قیمتی مالِ غنیمت دو جوان تھے جن میں ایک کا نام نصیر اور دوسرے کا سیرین تھا۔ ایک تو جوہرِ قابل اس پر جناب خالد بن ولید کا فیضِ تربیت۔ دونوں جوان ہیرا بن گئے ان دونوں کے صاحبزادگان نے تاریخِ اسلام میں اتنا عظیم مرتبہ حاصل کیا کہ کم لوگوں کو نصیب ہوا ہو گا۔ نصیر کے بیٹے موسیٰ اور سیرین کے بیٹے ابن سیرین۔ ایک نے افریقہ کے صحراؤں میں پرچمِ اسلام بلند کیا اور دوسرے نے اقلیم علم و زہد میں اپنا سکہ دلوں پر بٹھایا۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے علم حدیث میں بڑا نام پیدا کیا۔ ہزاروں علماء نے ان سے علم حدیث سیکھا اور دنیا کے گوشے گوشے کو اپنے علم کی ضیا پاشیوں سے منوّر کیا۔

نصیر کے بیٹے موسیٰ نے افریقہ اور اندلس کو اسلامی قلمرو میں شامل کر کے فاتحینِ اسلام کی فہرست میں اپنا لکھوایا۔ وہ ہر معرکہ میں لشکر کے آگے ہوتے۔ افریقہ کے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جب وہ لشکر لے کر روانہ ہونے لگے تو اسلامی افواج کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے جو تقریر فرمائی تھی اس کی گونج آج بھی اسلامی تاریخ کے گنبد میں سنائی دے رہی ہے۔ آپ نے فرمایا:

لوگو! میں تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں۔ مگر تمہیں میرے اندر کوئی خوبی نظر آئے تو میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کیا کرو کہ وہی تعریف کے لائق ہے اور اس خوبی کی پیروی کیا کرو۔ اور اگر میرے اندر کوئی برائی دیکھو تو خبردار اس کی پیروی نہ کرنا۔ بلکہ اگر ہو سکے تو مجھے اپنی غلطی پر متنبہ کر دینا۔ کیونکہ اوّل و آخر میں انسان ہوں۔ خطا و نسیان کا پتلا۔ افریقہ کے معرکوں میں موسیٰ بن نصیر نے بربروں کو پے در پے شکستیں دیں اور مفتوحین کو قتل کرنے کی بجائے زیادہ تر قیدی بنایا یہاں تک کہ چھ لاکھ بربر قید ہوئے۔ موسیٰ بن نصیر نے قیدیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحشی بربر شجاعت و سخاوت کے پیکر، علم و تدبر کے کامل نمونہ اور صنعت و تجارت میں مہارتِ تامہ کے مالک بن گئے۔ کل جو وحشی درندے تھے فیضانِ تربیت سے معلمِ اخلاق بن گئے۔ فاتح اندلس طارق بن زیاد انہیں قیدیوں میں سے ہیں اسلام

میں قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی اجازت نہیں۔ اسلام کے نزدیک قیدی بیمار ہوتا ہے۔ اس کا علاج ہونا چاہیئے نہ کہ اس کی تذلیل۔

جبر و استحصال سے پاک اسلامی نظام

ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے تو رستم ان کے بوسیدہ لباس اور بدویانہ انداز کو دیکھ کر سخت تعجب میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان لوگوں میں وہ کونسی خصوصیات ہیں جن کے باعث یہ سیلِ رواں کی طرح بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور ہزار سالہ ایرانی اقتدار ان کے سامنے بس ہے۔ حضرت مغیرہ اتمامِ حجت کے لیئے تشریف لے گئے تھے۔ رستم کو مخاطب کر کے فرمایا:

سپہ سالار! ہم تاجر لوگ نہیں ہیں۔ ہم منڈیوں کی تلاش میں نہیں نکلے ہیں نہ ہمارا مقصود دنیا اور دولت دنیا کا حصول ہے ہم تو دین حق کے علم بردار ہیں اور اسی کی دعوت دینا ہمارا نصب العین ہے۔ رستم نے پوچھا: تمہارے دین کی دعوت کیا ہے۔ جناب مغیرہ نے فرمایا، ہمارے دین کی پہلی دعوت غیر اللہ کی خدائی کا انکار اور صرف اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اقرار ہے اور یہ کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ رستم نے کہا: یہ تو اچھی تعلیم ہے۔ مغیرہ نے فرمایا: سپہ سالار شاید تو نے میری بات پر اچھی طرح غور نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو انسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کر صرف اللہ کا بندہ اور اس کا غلام بناتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ سب انسان اولادِ آدم ہیں اس لحاظ سے سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔

اب رستم کو کچھ کچھ اسلام کی حقیقت کا ادراک ہونے لگا تھا۔ اور اس نے محسوس

کرنا شروع کر دیا کہ اسلام ہی درحقیقت اس کی سلطنت اور حاکمیت کے لیے پیام اجل ہے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے مزید وضاحت کے لیے فرمایا: رستم! اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات پر مامور کیا ہے کہ ہم انسانیت کو تنگ دنیا سے نکال کر وسیع دنیا میں لائیں اور ظالمانہ نظام ہائے زندگی کو فنا کر کے دنیا میں منصفانہ نظام حیات برپا کریں۔ یعنی صحیح اسلامی نظام جبر و استحصال سے پاک ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ لاکھوں انسانوں کو رُلا کر ہم ہنستی بستیوں کو اجاڑ کر ہم محفلِ عیش و طرب سجائیں۔ اور انسانیت کے بے جان لاشوں پر ہم اپنے اقتدار کا محل تعمیر کریں۔ جناب مغیرہ اور ربعی بن عامر اٹھ کر چلے آئے اور رستم دیر تک خلا میں گھورتا رہا۔ شاید اسے اپنی موت نظر آ رہی تھی۔

عدل اسلامی کا تقاضا

ہارون رشید کے دربار میں اس کے وزیر اعظم فضل بن الربیع کو جو عزت و وقار اور وجاہت حاصل تھی اس کی مثال تاریخِ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی عدالت میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس میں صرف آزاد انسانوں کی شہادت معتبر تھی غلام کی نہیں۔ مدعی نے گواہوں میں ہارون رشید کے وزیر اعظم فضل بن الربیع کا نام بھی دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قاضی ابو یوسف وزیر اعظم کا نام گواہوں کی فہرست میں دیکھ کر مرعوب ہو جائیں گے۔ مگر قاضی ابو یوسف نے فضل بن الربیع کی شہادت روک دی۔ اور فرمایا کہ میں ان کی شہادت قبول نہیں کروں گا۔ فضل کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ سخت طیش کے عالم میں ہارون رشید کے پاس آیا اور اس سے قاضی ابو یوسف کی شکایت کر دی۔ ہارون کو بھی یہ بات بری لگی کہ اتنی بڑی سلطنت کے وزیر اعظم کی شہادت روک دی جائے۔ اس نے قاضی ابو یوسف سے دریافت کیا کہ آپ نے

فضل بن الربیع کی شہادت کیوں روک دی قاضی صاحب نے فرمایا کہ خلیفہ! ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا تھا کہ میرے سامنے فضل نے آپ سے یہ کہا کہ میں تو آپ کا غلام ہوں۔

فضل کا یہ قول دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اس نے سچ کہا کہ وہ آپ کا غلام ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو اُس مقدمے میں غلام کی گواہی قابلِ قبول نہیں اور اگر اس نے جھوٹ کہا اور واقعتہً وہ آپ کا غلام نہیں تو جھوٹے کی گواہی معتبر نہیں۔ اس لیے میں نے اس کی شہادت کو روک دیا۔ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سن کر ہارون رشید اور فضل بن الربیع دونوں خاموش ہو گئے۔ کہ اسلامی عدالت کا قاضی سوائے شریعتِ اسلامی کے اقتدار کے کسی کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ میں شاہ و گدا اور امیر و فقیر سب برابر ہوتے ہیں۔

ایک لاجواب فیصلہ

فاتح خیبر امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ گھوڑے پر سوار تھے۔ ان کے پیچھے دوسرے گھوڑے پر حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام قنبر جا رہے تھے۔ کہ امیر المومنین کے ہاتھ سے چھوٹ کر ان کی زرہ گر پڑی جسے ایک یہودی نے اٹھا لیا۔ جوں ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو زرہ کے گر جانے کا احساس ہوا آپ نے سواری روک لی۔ یہودی زرہ ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ میری ہے۔ یہودی نے کہا۔ حضرت! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ زرہ تو میری ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کی ہوتی تو آپ کے پاس ہوتی۔ اگر آپ کو میرے اس جواب سے اتفاق نہیں تو قاضی کی عدالت کھلی ہوئی ہے چلیں اس سے اس معاملے کا فیصلہ کرا لیں۔
حضرت علی امیر المومنین کرم اللہ وجہہٗ قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے اور یہودی

کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی شریح نے یہودی سے دریافت کیا۔ اس نے کہا جناب عالی! امیرالمومنین کو دھوکہ ہوا ہے۔ یہ زرہ میری ہے اور میرے قبضے میں ہے۔ قاضی نے مولا علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ زرہ آپ کی ہے۔ امیرالمومنین نے دو گواہ پیش کیے ایک اپنے صاحبزادۂ گرامی سید نا حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو اور دوسرے اپنے غلام قنبر کو۔ قاضی شریح نے کہا امیرالمومنین! اسلامی قانون کی رو سے زیادہ سے زیادہ میں آپ کے غلام قنبر کی شہادت کو قبول کر سکتا ہوں لیکن باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں کی جاتی اس لیے کوئی دوسرا گواہ پیش کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں سنی کہ حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ ان سے بہتر کون گواہ ہو سکتا ہے۔ قاضی شریح نے کہا جناب! یہ حدیث سر آنکھوں پر لیکن قانون کے تقاضے تو پورے کرنے پڑتے ہیں لہٰذا آپ کوئی دوسرا گواہ پیش کریں۔ دوسرا گواہ تھا نہیں اس لیے قاضی شریح نے اسلامی مملکت کے سربراہ کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا اور زرہ اس کے حوالے کر دی۔

یہودی نے سر جھکا کر زرہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے کی اور کہا سرکار! آپ برحق۔ اصل میں تو زرہ آپ ہی کی ہے۔ جس دین کے قاضی ایک غیر مسلم کے حق میں سربراہ مملکت کے خلاف فیصلہ کر سکتے ہیں اس دین سے افضل کون دین ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر اسلام قبول کرتا ہوں۔ یہودی کے اسلام لانے سے حضرت علی اتنے خوش ہوئے کہ وہ زرہ، اپنا گھوڑا اور نو سو درہم اسے بطور انعام دیئے۔

مسجد کے مینار سے اذان بلند ہو رہی تھی۔ مولا علی کرم اللہ وجہہٗ غسل کرا کر اور نیا لباس پہنا کر یہودی کا ہاتھ تھامے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔

عدل اسلامی کا تقاضا

موت جوں جوں قریب آتی جا رہی تھی دل لرز رہا تھا اور زبان پر استغفار کے کلمات جاری تھے لیکن یہ توبہ استغفار کس لیئے کیا انہوں نے کسی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا جس پر وہ شرمسار ہو رہے تھے۔ کیا انہوں نے کسی پر جان بوجھ کر ظلم کیا تھا جس کے بارے میں وہ پریشان تھے اس کا تو سوال ہی نہیں تھا پوری زندگی پاک دامنی کے ساتھ گزاری تھی۔ ماں نے تو دھوبی کی دوکان پر ملازمت دلوا دی تھی کہ مہینے میں دس پانچ روپے کی آمدنی ہو گی اور گھر کا خرچ چلے گا لیکن قسمت فیصلہ کر چکی تھی کہ اس بچے کو تمام مملکت اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بننا ہے۔ چیف جسٹس اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کی نظر بچے پر پڑ گئی۔ امام نے بچے میں جوہر قابل دیکھا۔ گھر کا خرچہ ابو یوسف کے حوالے کیا اور کہا کہ تم میرے یہاں پڑھو۔ لہٰذا امام ابو یوسف کی تمام تر تعلیم و تربیت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ کے زیر سایہ ہوئی۔ اس لیئے کسی فسق و فجور میں مبتلا ہونے کا تو گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تعلیم مکمل ہوئی تو امام کی صحبت میں ذرہ آفتاب بنا۔ اب آفتاب جس کی کرنیں صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی تاباں و درخشاں ہیں اور قیامت تک رہیں گی۔ فقہ میں اجتہاد کے درجے تک پہنچے اور ساری دنیا سے اپنے علم و اجتہاد کا سکہ منوایا۔ امام ہی کی اجازت سے ہارون الرشید کے دورِ خلافت میں پوری مملکت اسلامیہ کے چیف جسٹس بنے کسی بھی لمحے میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ان کے فیصلے آج بھی فقہ حنفی کا انمول سرمایہ ہیں اور قیامت تک حنفیت ان کے احسان سے گرانبار رہے گی۔ اس تمام تقدس، پاکیزگی، عدل گستری، زہد و تقویٰ اور شرافتِ نفس کے باوجود موت کے وقت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ زار و قطار کیوں رو رہے تھے۔ توبہ استغفار کیوں کر رہے تھے۔ یہ ایک سوال تھا جو حاضرین کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ اتنے میں امام نے فرمایا اے میرے اللہ! تو بخوبی جانتا ہے کہ جب سے میں قاضی بنا میں نے مقدمات کے فیصلے کرنے میں وہی رویّہ اختیار کیا جو ایک مسلمان

قاضی کو اختیار کرنا چاہیے میں نے کسی کی حمایت کی نہ کبھی بھی فریقین مقدمہ میں سے کسی ایک طرف کسی قسم کا میلان ظاہر یا باطن میں مجھ سے صادر ہوا۔ البتہ ایک مقدمے میں جس میں ایک عیسائی نے خلیفہ ہارون الرشید پر دعوٰی دائر کیا تھا اگرچہ فیصلہ میں نے عیسائی ہی کے حق میں کیا کیونکہ وہ حق پر تھا۔ میرے دل میں یہ تمنا ضرور تھی کہ کاش ہارون حق پر ہوتا اور میں اس کے حق میں فیصلہ کرتا۔ میرے مالک آج جبکہ میں دنیا سے جا رہا ہوں میں خوف زدہ ہوں کہیں دل کی اس تمنا پر تو میری گرفت نہ کرے۔ میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور اپنی اس تمنا پر جو اگرچہ عملی صورت اختیار نہ کر سکی اظہار ندامت کرتا ہوں۔ مولا مجھے معاف فرما۔ یہ فرمایا اور رونے لگے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور شاید موتی سمجھ کر ملائکہ انہیں چن رہے تھے۔

عدل گستری

ہارون الرشید اگرچہ بہت جلیل القدر عباسی خلیفہ تھا۔ اور اس کے عہد خلافت میں مشرق و مغرب میں اس کی عظمت و جلالت کا ڈنکا بجتا تھا۔ اس کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ روم کا سفیر ایک مرتبہ اس کے دربار میں آیا تو اس کے دربار کی شان دیکھ کر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ تاہم اس کا وزیر فضل ابن ربیع برمکی جود و سخا اور دولت مندی میں کسی سے کم نہ تھا۔

اور مشہور یہ تھا کہ فضل کے دروازے سے کوئی بھی سائل خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا تھا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہارون کے پردے میں فضل ہی حکومت کرتا ہے۔ حکمنامہ فضل لکھ دیتا تھا۔ مجال نہ تھی کہ عمال حکومت میں سے کوئی شخص بال برابر بھی اس سے انحراف کرتا۔ لیکن ایک دن ایسا عجیب واقعہ پیش آیا کہ فضل کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اسے ایسا لگا جیسے کسی نے زناٹے دار طمانچہ اس کے منہ پر مارا ہے۔

انتقام کی آگ میں جلنے لگا۔ اگر اس کی یہ بے عزتی تنہائی میں ہوئی ہوتی تو شاید وہ اسے پی جاتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ لیکن آج وہ برسرِ عدالت رسوا ہوگیا تھا۔

اور زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا۔ ایک مقدمے میں وہ قاضی ابو یوسف کی عدالت میں گواہی کے لیے پیش ہوا فضل ابن ربیع کا عدالت میں آنا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ سارا بغداد امڈ پڑا۔ جب فضل گواہی کے لیے پیش ہوا تو قاضی ابو یوسف نے برسرِ عدالت کہا کہ میں تمہاری گواہی قبول نہیں کروں گا۔ اس نے کہا "کیوں"۔ قاضی ابو یوسف نے کہا اس لیے کہ تم ایک مرتبہ میرے سامنے جھوٹ بول چکے ہو۔ اور شریعت کی رو سے جھوٹے کی گواہی مقبول نہیں ہے۔ یہ سن کر فضل کمرہ عدالت سے باہر آگیا اور سیدھا ہارون الرشید کے پاس جاکر قاضی ابو یوسف کی اس سے شکایت کی۔ ایک دو دنوں کے بعد ایک مرتبہ قاضی ابو یوسف اور فضل برمکی ہارون الرشید کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے، کہ ہارون نے ابو یوسف نے پوچھا "امام! آپ نے فضل کی شہادت کیوں رد کردی؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ مملکت اسلامیہ کا وزیر اعظم ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مملکت میں میرے بعد اسی کا حکم چلتا ہے"۔ ہارون نے جس وقت یہ سوال کیا وہ سخت غصے میں تھا۔ دوسرا شخص ہوتا تو اس کے اوسان خطا ہوگئے ہوتے۔ مگر نہایت بے خوفی سے قاضی ابو یوسف نے فرمایا "امیر المؤمنین! ایک دن میں آپ کی خدمت میں حاضر تھا کہ میرے سامنے فضل نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ اس کی یہ بات دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو واقعتاً وہ آپ کا غلام ہے۔ تو جس مقدمے میں گواہی دینے یہ گئے تھے اس میں غلام کی گواہی معتبر نہیں یا انہوں نے جھوٹ کہا تھا۔ اگر جھوٹ کہا تھا تو جھوٹے کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔

ہارون اور فضل دونوں غصہ بھری نظروں سے قاضی ابو یوسف کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن دونوں بے بس تھے۔ کیونکہ قاضی ابو یوسف مملکت اسلامیہ کی عدلیہ کے سربراہ تھے جو مکمل آزاد ہوتی ہے اور سربراہ مملکت بھی اس کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔

قاضی شریح کا فیصلہ

قاضی شریح کے بیٹے نے سوچا کہ باپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کرنے سے پہلے ان سے مشورہ کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ رات کے وقت جب قاضی شریح فارغ بیٹھے ہوئے تھے بیٹا باپ کے پاس گیا۔ اور عرض کیا "ابا جان! میں فلاں جائیداد پر قابض ہوں۔ اور میرا یہ قبضہ کافی عرصے سے ہے میں چاہتا ہوں کہ اس جائیداد کے مالکانہ حقوق بھی حاصل کر لوں۔ کاغذات دیکھنے کے بعد اگر آپ مجھے مشورہ دیں تو میں مقدمہ دائر کر دوں۔ قاضی شریح نے کاغذات دیکھنے کے بعد مقدمہ دائر کرنے کی اجازت دے دی چنانچہ ان کے بیٹے نے اس جائیداد کے بارے میں ان ہی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔

سماعت شروع ہو گئی۔ تین چار دنوں کی سماعت کے بعد قاضی صاحب نے بیٹے کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور حکم دیا کہ مدعا علیہ فوراً جائیداد پر قبضہ کر لے اور ان کے بیٹے کو بدخل کر دے شام کو جب قاضی صاحب عدالت سے گھر واپس آئے تو بیٹا انتہائی رنجیدہ وملول ان کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ "ابا جان! میں نے تو آپ سے مشورہ کر کے مقدمہ دائر کیا تھا اور آپ نے سارا پانسہ ہی پلٹ دیا اگر آپ نے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں ہرگز مقدمہ دائر نہیں کرتا۔ آپ سے گلہ ہے کہ آپ نے رشتہ

نا کوئی بھی پاس اور لحاظ نہیں کیا۔ قاضی شریح نے فرمایا میرے بیٹے اسلام نے جو نظام عدل ہمیں عطا کیا ہے۔ اس میں اپنے پرائے دوست دشمن اور مومن و کافر کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ اس لئے میں نے وہی فیصلہ کیا جو انصاف کا تقاضہ تھا۔ تمہاری ملکیت اس جائیداد پر ناجائز تھی میں نے اسے ناجائز قرار دے دیا۔ اس طرح میں نے تمہیں ناجائز راستے سے بچا لیا بیٹے نے کہا ابا جان میں نے تو آپ سے پہلے ہی مشورہ کیا تھا اگر آپ مجھے بتا دیتے تو مقدمہ ہی دائر نہ کرتا۔ قاضی شریح نے کہا کہ اگر میں بتا دیتا اور تم مقدمہ دائر نہ کرتے تو تم مسلسل ناجائز قبضہ رکھتے اور بیچارہ مدعا علیہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس طرح حرام کی راہ کھلی رہتی۔ جواب ہمیشہ کے لئے بند ہو چکی ہے بیٹے! تم آگ کے گڑھے میں گر رہے تھے میں نے انگلی تھام کر تمہیں گرنے سے بچا لیا۔

جرأتمند قاضی

خلیفہ الحکم کے چچا سعید الخیر کا ایک مقدمہ قاضی ابن بشیر کی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ سعید الخیر کے وکیل نے ایک دستاویز پیش کی جس پر ایک گواہ کے ساتھ ساتھ خود خلیفہ کی گواہی بھی درج تھی قاضی نے اس گواہ کی گواہی سننے کے بعد دوسرے گواہ خلیفہ الحکم کو عدالت میں طلب کر لیا۔ یہ بات سعید الخیر کو بہت ناگوار گزری اور اس نے خلیفہ کے پاس حاکمہ قاضی کی شکایت کی اور اس سے کہا کہ جو قاضی خلیفہ کو عدالت میں طلب کرے وہ ہرگز ہرگز قاضی بننے کا اہل نہیں ہے۔ اس لئے اس بے ادبی پر اسے معزول کر دے۔

خلیفہ نے اپنے چچا سے کہا کہ آپ اپنے فریق سے معاملات طے کر کے صلح کر لیں۔ خلیفہ کا کام عدالتوں میں جا کر گواہی دینا نہیں ہے مگر اس کا چچا نہیں مانا اور اس سے کہا کہ آپ تحریری شہادت لکھ دیں اور دو علماء کی گواہی اس تحریر پر لکھا کر ہمیں دے دیں۔ میرا خیال ہے کہ قاضی مان جائے گا۔ خلیفہ نے شہادت لکھ کر اس پر گواہی درج کرا کے خلافت کی مہر لگا دی اور دستاویز چچا کے سپرد کر دی کیونکہ مقدمہ ایسا تھا

کہ گواہ کو خود حاضر عدالت ہو کر گواہی دینی تھی اس لئے قاضی نے خلیفہ کی تحریری شہادت کو رد کر دیا اور اصرار کیا کہ خلیفہ خود حاضر عدالت ہو۔ یہ دیکھ کر خلیفہ کا چچا آگ بگولہ ہو گیا اور اس نے آکر خلیفہ کو بھڑکایا اور کہا کہ آج سلطنت کا وقار ختم ہو گیا۔ شاہی خاندان کی عزت خاک میں مل گئی کیونکہ قاضی نے بادشاہ کی شہادت قبول نہیں کی۔ اب اس قاضی کو اپنے عہدے پر باقی رکھنا خود سلطنت کے مفاد میں نہیں ہے الحکم نے جواب دیا چچا جان واقعتہً قاضی کا فیصلہ دیانت پر مبنی ہے اور میں اسی طرح کے قاضی اپنی حکومت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ خود غور فرمائیں کہ جو قاضی انصاف کے تقاضوں کے مقابلے میں بادشاہِ وقت کی پروا نہیں کرتا وہ بھلا کسی امیر کبیر یا جاگیردار یا سرمایہ دار کی کیا پروا کرے گا اس طرح کے قاضی تو سونے میں تولے جانے کے قابل ہیں۔ اور آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں اسے معزول کر دوں۔ خدا کی قسم میں تو اس سے باز پرس کرنے کو بھی تیار نہیں ہوں۔ ایسے قاضی تو میری سلطنت کے آسمان کے چاند اور ستارے ہیں۔ آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ ایک اسلامی حکومت کا سب سے بڑا امتیاز بے لاگ عدل و انصاف ہے۔

باب ۶
صوفیائے کرامؒ

بایزید بسطامیؒ اور ماں کی خدمت

رات کا وقت تھا۔ ماں نے پانی مانگا۔ مٹی کے کوزے میں پانی لے کر ابھی ماں کی چارپائی کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ماں کی آنکھ لگ گئی۔ اب کیا کرتا۔ سوچا کہ ماں کو بیدار کر کے پانی پلا دوں پھر خیال آیا کہ اس کی نیند خراب ہو گی کتنی بے چینی کے بعد تو اس کی آنکھ لگی ہے۔ سردی سخت تھی باہر برف باری ہو رہی تھی۔ میرے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ دل میں آیا کہ بستر میں جا کر سو رہوں مگر پھر خیال آیا کہ شاید ماں دوبارہ پانی مانگے اور میں وقت پر اس کے پاس نہ پہنچ سکوں۔

اسی ادھیڑ بن میں کھڑا رہا۔ سردی اور نیند دونوں کا غلبہ تھا۔ مگر میں نے اپنے نفس پر قابو رکھا۔ ہتھیلی پر پانی کا کوزہ تھا اور میں ماں کی چارپائی کے پاس کھڑا تھا۔ یہاں تک کہ مؤذن نے صبح کی اذان دیدی۔ اذان کی آواز سن کر ماں بیدار ہوئی اور اس نے دیکھا کہ میں پانی لئے کھڑا ہوں۔ کہا بیٹے! تو نے مجھے جگا کیوں نہیں لیا۔ میں نے عرض کیا ماں! تیری طبیعت خراب تھی میں نے سوچا کہ اگر جگا دوں گا تو کہیں تجھے اور زیادہ تکلیف نہ ہو جائے۔ سویا اس لیئے نہیں کہ نہ جانے کب تو پانی مانگے اور میری آنکھ نہ کھلے۔ میرا یہ عمل دیکھ کر ماں بے حد خوش ہوئی اس نے دست دعا دراز کیا۔ بار الٰہی! بایزید نے میرا دل ٹھنڈا کیا ہے تو اس کے قلب کو اپنی معرفت کے انوار سے منور فرمادے۔

سلطان بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہ جانے ماں کی اس دُعا اور میری اس خدمت میں کیا تاثیر تھی کہ چشم زدن میں برسوں کا سفر طے ہو گیا اور میرا قلب معرفت کے انوار سے منور ہو گیا۔

سلطان بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ نے حاضرین سے فرمایا ۔ لوگو! تم مجھے پوچھتے ہو کہ بایزید تجھے معرفت کی یہ دولت کیسے ملی تو سن لو کہ اس کا ایک ہی راستہ ہے اللہ کے حقوق ادا کرو اور اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرو۔ منزل کھنچ کر خود تمہارے سامنے آجائے گی۔ یاد رکھو! اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔

خدمتِ خلق

رات کے وقت جب درویشوں کی آنکھ کھلی اور انہوں نے دیکھا کہ شیخ المشائخ حضرت ابراہیم بن ادہم چولہا پھونک رہے تھے اور راکھ اُڑ اُڑ کر ان کی داڑھی پر پڑ رہی ہے تو وہ بہت حیران ہوئے۔ دوڑے آئے اور کہنے لگے حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "بھائیو! مجھے معاف کر دو مجھ سے تقصیر ہو گئی" یہ اب تو درویشوں کی شرمندگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ مارے شرم کے پانی پانی ہونے لگے۔

یہ کل دس درویش تھے۔ سب کے سب حضرت ابراہیم بن ادہم کے رفیق سفر۔ حضرت نے ان سے طے کر رکھا تھا کہ تم لوگ فکر معاش سے بے پرواہ ہو کر اللہ کے ذکر میں مشغول رہا کرو۔ معاشی ذمے داریاں میرے سر معمول یہ تھا کہ یہ تمام حضرات دن بھر روزہ رکھتے حضرت ابراہیم بن ادہم بھی روزہ رکھتے اور دن بھر جنگل میں لکڑیاں کاٹ کر شام کو بازار میں بیچتے اور جو کچھ ملتا اس سے کھانے پینے کا سامان خرید کر لاتے۔ اور اذان مغرب سے پہلے پہلے افطاری تیار کر کے درویشوں کے سامنے پیش کر دیتے۔ اور ان کے ساتھ خود بھی شریک ہوتے۔ اس دن حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ حسب معمول لکڑیاں لے کر بازار میں پہنچے لیکن کوئی خریدار نہ ملا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ حضرت نے پانی سے روزہ افطار کر لیا اور بازار میں انتظار کرتے رہے۔ عشاء کی نماز کے بعد لکڑیاں فروخت ہوئیں تو حضرت نے جلدی جلدی آٹا خریدا اور قیام گاہ کی طرف تیز تیز قدموں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ادھر اللہ کا کوئی نیک دل بندہ درویشوں کیلئے کھانا لایا تھا جس سے درویشوں نے روزہ افطار کر لیا اور عشا کی نماز پڑھ کر سو رہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور دیکھا کہ درویش سو رہے ہیں تو خیال فرمایا کہ شاید یہ لوگ بھوکے ہی سو رہے ہیں اس لئے انہیں بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور سوچا کہ کھانا تیار کر کے انہیں بیدار کروں گا اتنے میں درویشوں کی آنکھ کھل گئی اور انہیں بہت جلد اپنے اخلاق اور شیخ کے اخلاق کا فرق معلوم ہو گیا کہ انہوں نے

تو پیٹ بھر کر کھا لیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ شیخ کیا کھائیں گے! اور شیخ کا عالم یہ ہے کہ اس بات پر معذرت خواہ ہیں کہ دیر ہو جانے کے سبب شاید درویش بھوکے سو گئے ہیں۔ راہِ طریقت کا سارا کمال اخلاق کی وسعت، خدمتِ خلق اور غم خواری ہمدردی میں ہے۔ نہ کہ اپنے ہی جیسے بندوں کے درمیان میں خدا بن بیٹھنے میں۔

معرفت

مجلس میں شیخِ وقت سلطان العارفین خواجہ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے مریدین کا ہجوم تھا لوگ عرض و معروض کر رہے تھے سلطان بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ہر آدمی کے سوال کے مطابق اس کو تشفی بخش جواب دیتے جا رہے تھے۔ مگر ایک آدمی کونے میں خاموش بیٹھا ہے اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید وہ بھیڑ چھٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ حضرت سلطان نے انکھیوں سے اسے بار بار دیکھا بلکہ ایک مرتبہ تو پوچھ بھی لیا کہ آپ کو کچھ کہنا ہے تو فرمایئے۔ اس نے عرض کیا کہ حضور! تنہائی میں کچھ عرض کروں گا۔ جب تنہائی ہوئی معتقدین اور مریدین رخصت ہو گئے تو حضرت شیخ دوبارہ اجنبی کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا کچھ کہنا ہے تو کہو۔ اس نے عرض کی حضور! مجھے معرفت کا سبق دیجئے۔ شیخ نے کھانا منگا کر اسے کھلایا۔ اجنبی بہت شرمندہ ہوا۔ خیال کیا کہ شاید شیخ نے میرے سوال کا مفہوم نہیں سمجھا اور اسی عالم میں اٹھ کر گھر چلا گیا۔ دوسرے دن پھر آیا اور حسب سابق تنہائی ہونے پر شیخ سے پھر وہی سوال دہرایا، حضور! مجھے معرفت کا سبق دیجئے۔ شیخ نے پھر کھانا منگایا اور اسے کھلا دیا۔ اب کی مرتبہ بھی اجنبی بہت نادم ہوا اور اٹھ کر گھر چلا گیا۔ جب تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا تو اس سے رہا نہ گیا۔ نہایت ادب سے عرض کیا حضرت! میں بہت دور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر معرفت کے سبق کا سوال کرتا ہوں اور آپ مجھے کھانا کھلا دیتے ہیں حالانکہ میں کھانا کھانے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوتا۔ میں تو اس نورِ معرفت کا متلاشی ہوں جو قلب کو گرما دے اور روح کو بالیدگی عطا

کر دے۔ مجھے روحانی غذا چاہیے جسمانی نہیں۔ سلطان نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا میرے بھائی! بُرا نہ ماننا معرفت اسی کا نام ہے کہ بندگان خدا کے سامنے کوئی چیز پیش کی جائے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا جائے۔ دکھے دلوں کو سکون پہنچا، زخموں پر مرہم رکھنا اور بے چین روحوں کو مطمئن کر دینا یہی ہے معرفت کا دروازہ جو بندگانِ خدا کا دکھ نہ سمجھے جو انسانوں پر رحم نہ کرے، جو لوگوں کا غم نہ بانٹے جو حقوق ادا نہ کرے، وہ لاکھ عبادت و ریاضت کرے معرفت تو درکنار معرفت کا دروازہ بھی اس پر نہیں کھل سکتا۔ یہی ہے معرفت اور یہی ہے طریقت۔ جو بندوں کو نہ پہچان سکے وہ خدا کو کیا پہچانے۔

اخلاق کی تلوار

شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب کے دمشق پہنچنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ اسلامی لشکر کے سرداروں کو جب معلوم ہوا کہ شیخ تشریف لائے ہیں تو ان میں سے اکثر شیخ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا کہ حضرت ہماری دعوت قبول فرمائیں۔ کھانا درِ دولت پر پہنچ جائے گا۔ آپ کو تکلیف نہیں کرنی ہوگی۔ دعوت کو قبول کرنا سنّت ہے اس لیے جب شیخ کو اندازہ ہوگیا کہ وجہ حلال سے کھانا تیار ہوگا تو دعوت قبول فرمائی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد شیخ رحمۃ اللہ علیہ اپنے سجادے پر ذکر و عبادت میں مشغول تھے کہ فرنگی قیدی خوان پر خوان سروں پر رکھے آگئے۔ دسترخوان بچھا دیا گیا۔ اور کھانا چُنا جانے لگا۔ قیدی کھانا حوالہ کرنے کے بعد کمرے کے ایک کونے میں زمین پر بیٹھ گئے کہ برتن خالی ہوں گے تو لے کر واپس جائیں گے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دیکھا کہ دسترخوان پر کھانا لگا دیا گیا تو شیخ کو جا کر اطلاع دی۔ حضرت شیخ ضیاء الدین رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ دھو کر تشریف لائے تو قیدیوں کو کونے میں بیٹھا دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ

ہیں۔ بتایا گیا کہ یہ فرنگی قیدی ہیں جنگ میں گرفتار ہوئے تھے۔ اس وقت یہ مسلمان فوجیوں کی خدمت پر مامور ہیں۔ ابھی یہ آپ کا کھانا لے کر آئے ہیں۔ جب برتن خالی ہوں گے تو واپس لے کر جائیں گے۔ شیخ نے فرمایا کہ میرے ساتھی صوفیوں کو بلاؤ۔ صوفی آئے اور دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ ان قیدیوں سے کہو کہ وہ بھی ہمارے ساتھ دسترخوان پر بیٹھیں کیونکہ یہ اسلامی مروّت کے خلاف ہے کہ ہم کھانا کھائیں اور وہ بیٹھے تکتے رہیں۔ کسی نے کہا حضرت! انہیں بعد میں کھلایا جائے گا۔ فرمایا نہیں، یہ ہمارے ساتھ ہمارے دسترخوان پر کھائیں گے۔ ان کا عقیدہ کچھ بھی ہو۔ ان کی حیثیت سے ہمیں سروکار نہیں۔ کفّار مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو سلوک بھی کرتے ہیں کریں۔ ہم تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے امّتی ہیں ہم اخلاق و شرافت کا دامن ہاتھوں سے کیوں چھوڑیں۔ قیدیوں کو بلایا اور اپنے ساتھ بٹھا کر شریکِ طعام کیا یہ اخلاق دیکھ کر قیدیوں کے دلوں میں نورِ ایمان جگمگانے لگا۔ مسلمانوں نے لوہے کی تلوار سے نہیں اخلاق کی تلوار سے اپنے دشمنوں کو شکست دی ہے۔

ظاہر بینی و خود بینی

خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میری یہ عادت تھی کہ میں جس شخص کو بھی دیکھتا اپنے سے بہتر خیال کرتا اور خود کو سب سے کمتر۔ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل تزکیہ نفس کی راہ میں اشد ضروری ہے کیونکہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبّر ہے۔ اور تکبّر ایسی چیز ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی اور شخصیت کو ذلّت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے جب کسی کو دیکھو کہ وہ تکبّر کے مرض میں گرفتار ہو گیا ہے تو یقین کر لو کہ اب اس کا زوال شروع ہو چکا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے زوال کو نہیں روک سکتی۔ عظمت و کبریائی تو صرف مالک الملک اور خالقِ ارض و سما کا حصہ ہے جو کسی کا محتاج نہیں اور جس کے در کے سبھی سوالی ہیں۔

اسی لیئے مشائخ ہمیشہ خود کو حقیر سمجھتے اور دوسروں کو اپنے سے بڑا جاننے کا درس دیتے آئے ہیں۔ خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ ایک حبشی دریا کے کنارے ایک عورت کے ساتھ بیٹھا صراحی میں سے کچھ پی رہا ہے۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ میں لاکھ حقیر اور ناچیز سہی مگر کم از کم میں اس حبشی سے تو بہتر ہوں کہ اس طرح کے گناہ میں ملوث نہیں ہوں یعین اس وقت جب کہ میں یہ سوچ رہا تھا ایک کشتی جس میں سات آدمی سوار تھے دریا میں الٹ گئی اور لوگ ڈوبنے لگے۔ حبشی اٹھا اور اچھل کر دریا میں کود پڑا اور باری باری کر کے چھ آدمیوں کو نکال لایا میں اس کی ہمت و جوانمردی کو دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ ساتواں آدمی غوطے پر غوطے کھا رہا تھا حبشی میری طرف متوجہ ہوا اور کہا: حسن! اس ایک آدمی کو تو تو بچا لا۔ مگر میں کیا کرتا مجھے تو تیرنا نہیں آتا تھا میں حیران رہ گیا جیسے تیسے وہ ساتویں کو بھی کنارے پر کھینچ لایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، حسن اس صراحی میں پانی ہے اور یہ عورت میری ماں ہے میں تو یہاں تیری آزمائش کے لیے بیٹھا تھا۔ حسن! ابھی تک تجھ میں ظاہر بینی اور خود بینی باقی ہے یعنی ابھی تک تو اپنے نفس کی گرفت سے باہر نہیں نکلا۔ یہ کہا اپنی صراحی اٹھائی ماں کو ساتھ لیا اور چلا گیا۔ میں حیران دریا کے کنارے کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا سوچتا رہا کہ واقعتہً میں تو ابھی تذکیۂ نفس کی پہلی منزل پر بھی نہیں پہنچ سکا۔

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست

شہر میں ایسی آگ لگی تھی کہ الامان والحفیظ نخاس اور منڈی کا سارا علاقہ آگ کی لپیٹ میں تھا۔ اس وقت کے بغداد کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہوتا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ، سیاست دان اور فلسفی، تاجر اور جاگیردار شہر میں جمع تھے۔ بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور دار العلوم تھے۔ ساری دنیا سے طالبانِ علم و ہدایت

کھنچے چلے آتے تھے۔ اور شہر تھا کہ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ لوگ بغداد کو عروس البلاد کہتے تھے۔ خلفائے بنو عباسیہ نے اس شہر کو آباد بھی کیا تھا اور اسے ایسا سجایا تھا کہ جب کوئی سیاح باہر سے آتا تو بغداد کی رونق و رنگا رنگی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ بازاروں میں چہل پہل تھی اور کاروبار زور شور سے جاری تھا کہ آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ آگ لگی بھی کہاں، تو منڈی میں اور نہایت تیزی سے پھیلنے لگی۔ دکاندار بدحواسی کے عالم میں اپنی اپنی دکانوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ایک تاجر چلانے لگا "لوگو! میرے مکان میں آگ لگ چکی ہے۔ میں جیسے تیسے تو اپنی بیوی اور بچوں کو نکال لایا ہوں مگر میرے دو نہایت قیمتی غلام مکان میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ خدا کے لیئے میری مدد کرو اور میرے غلاموں کو آگ سے نکال لاؤ۔ اگر کوئی صاحب میری مدد کرینگے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ غلاموں کو نکال کر لانے والے کو دو ہزار اشرفیاں دوں گا۔ دو ہزار اشرفیاں معمولی چیز نہیں تھی لیکن کس کی جان بھاری تھی کہ آگ کا رخ کرتا۔ بڑے بڑے جواں مردوں کا پتا پانی ہو رہا تھا اور شعلے تھے کہ تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ سنا کہ دو غلام آگ میں پھنسے ہوئے ہیں اللہ کا نام لیا اور تاجر کے جلتے ہوئے مکان میں داخل ہو گئے۔ دیکھنے والے سمجھے کہ اب شیخ کی واپسی ناممکن ہے بھلا اتنی آگ میں شیخ سلامت کیسے رہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے کہ شیخ صحیح و سلامت ہیں اور دونوں غلاموں کو نکال لائے ہیں۔ تاجر بے حد خوش ہوا اور حسبِ وعدہ دو ہزار اشرفیاں حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اشرفیاں دیکھ کر حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ ہنس پڑے۔ تاجر سے فرمایا: "اشرفیاں اٹھا لے انہی اشرفیوں سے منہ موڑنے کی وجہ سے تو مجھے یہ مرتبہ ملا ہے کہ آگ میں چلا گیا اور آگ مجھے نہ جلا سکی اب انہیں میں کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ میں ان کے لالچ میں نہیں گیا تھا۔ میں تو دو انسانوں کو ہلاکت سے بچانے گیا تھا کہ طریقت نام ہی خدمت خلق کا ہے۔

حضرت بہلولؒ اور ہارون

ہارون الرشید حج سے واپس آرہا تھا۔ لاؤ لشکر، خدم و حشم کیا کچھ نہیں تھا۔ راستے میں کوفہ پڑتا تھا۔ ایک ہفتے کے لیے کوفہ میں ٹھہر گیا۔ آخر ایک دن بغداد کی طرف روانگی ہوئی۔ شاہی جماعت گزر رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ خلیفہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ناگاہ ایک دیوانہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس، سُرخ سُرخ آنکھیں، الجھے ہوئے بال، گرد آلود داڑھی میلی کچیلی حالت مجمعے کو چیرتا ہوا باہر نکلا۔ عین اسی وقت وہ اونٹنی گزر رہی تھی جس کے ہودج میں خلیفہ سوار تھے اور جس کے گرد زرنگار پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیوانہ سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہی خلیفہ کی اونٹنی ہے۔ آگے بڑھا اور پکارا امیر المؤمنین! ہارون الرشید نے فوراً پہچان لیا کہ یہ عام دیوانوں میں سے نہیں ہے یہ تو وہ بہلول دیوانہ ہے جس کی دیوانگی پر ہزاروں اہلِ عقل و خرد کو قربان کیا جاسکتا ہے یعنی دیوانہ بکار خویش فرزانہ۔

اس نے فوراً ہودج کا پردہ ہٹایا اور کہا لبیک اے بہلول۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ بہلول نے کہا اے خلیفہ! انہی سڑکوں سے سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے واپس آتے ہوئے گزرتے تھے مگر سوائے صہباء اونٹنی کے نہ یہ غرور و نمود تھا نہ یہ نقارے اور شادیانے۔ بادشاہا عاجزی اور خاکساری اختیار کر کہ حج کا سفر خالص عاجزی و خاکساری کا سفر ہے۔ ہارون رونے لگا اور بہلول سے کہا، بہلول کچھ اور نصیحت کرو۔ جناب بہلول نے فرمایا: امیر المؤمنین! مال و جمال خدا کی دو بڑی نعمتیں ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو اللہ کے رستے میں خرچ کرے اور اپنے جمال کو گناہ کے داغ سے محفوظ رکھے تو اس کا نام نیکوکاروں کی فہرست میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اللہ نے تجھے دونوں چیزیں دی ہیں ان کے حقوق ادا کرو۔

ہارون نے بہلول کو اشرفیوں کا توڑا دینا چاہا۔ بہلول نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہارون نے کہا، بہلول! تم اس رقم سے اپنا قرض ادا کر لینا۔ بہلول نے کہا قرض

لے کر قرض ادا کرنا کہاں کی دانائی ہے - امیرالمومنین آپ کیا سمجھتے ہیں ہیں اور آپ دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ آپ کو تو یاد رکھے اور مجھے یاد نہ رکھے ہیں تو صرف اسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤں گا -

حضرت داؤد طائیؒ کا استغناء

حکمران محمد بن قحطبہ اگرچہ تھا حکمران۔ دولت کا انبار قدم کے نیچے، دائیں بائیں خدم و حشم کیا کچھ نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے نہایت ذہین و فطین بیٹا دے رکھا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اسے کسی ایسے استاذ سے تعلیم دلائے جو علم و فضل کے ساتھ ساتھ صاحب تقویٰ بھی ہو اور قرآن و حدیث میں مہارتِ تامہ رکھنے کے باوجود شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتا ہو۔ بھلا ایسا عالم اسے کہاں ملتا - اپنے علاقے میں دورہ کرتا اور علماء کے حالات دریافت کرتا رہتا۔ اتفاقاً ایک دن کوفہ آیا اور لوگوں سے تذکرہ کیا کہ اپنی اولاد کی تعلیم کے لیئے مجھے ایک صاحب تقویٰ باصلاحیت استاد کی ضرورت ہے اور وہ تمام شرائط بیان کیں جو وہ استاذ میں دیکھنا چاہتا تھا - لوگوں نے کہا کہ ان خصوصیات کا حامل کوفہ میں تو ایک ہی آدمی ہے اور وہ ہیں جناب داؤد طائی - اگر وہ اس فرض کو انجام دینے کے لیئے تیار ہو جائیں تو آپ سمجھ لیں کہ آپ کی مشکل آسان ہو گئی - اس نے فوراً غلاموں کو بلایا اور دس ہزار درہم کا ایک توڑا ان کی خدمت میں بھیج دیا کہ میری طرف سے یہ نذر قبول کریں - جناب داؤد طائی نے شکریے کے ساتھ وہ درہم واپس کر دیئے فرمایا کہ محمد بن قحطبہ سے کہنا کہ میں اپنے رب کے دروازے پر سوالی بنا بیٹھا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بندوں کے لیئے کافی ہے - محمد بن قحطبہ یہ جواب سن کر تلملا سا گیا لیکن کر ہی کیا سکتا تھا - دوبارہ اس نے دس دس ہزار کے دو توڑے دو غلاموں کے ہاتھ بھجوائے اور غلاموں سے کہا کہ اگر داؤد یہ توڑے قبول کر لیں تو تم آزاد ہو۔ امید و بیم اور یاس و آس کی ملی جلی کیفیت میں غلام توڑے لے کر روانہ ہوئے۔ اگر داؤد قبول کر لیں تو ان کی غلامی کا تاریک دور ختم ہو جائے گا - دروازہ کھٹکھٹایا اور باریابی کی

اجازت طلب کی۔ چشمِ پُرنم کے ساتھ دس دس ہزار کے دو توڑے داؤد کے قدموں پر رکھ دیئے اور عرض کی حضور! آپ انہیں قبول فرمالیں ہمارے آقا محمد بن قحطبہ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اور ہم سے یہ فرمایا ہے کہ اگر داؤد طائی یہ توڑے قبول کرلیں تو تم آزاد ہو۔ آپ کی قبولیت پر ہماری آزادی موقوف ہے۔ خدا کے لیئے ہمیں ناامید نہ فرمائیں۔ اب فقیرِ غیور پر جلال کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک طرف دو غلاموں کی آزادی کا مسئلہ تھا اور دوسری طرف دنیا اور دولتِ دنیا میں گرفتاری کا۔ فیصلہ کرنے میں داؤد نے ایک لمحے کا توقف نہ کیا اور فرمایا کہ انہیں واپس لے جاؤ۔ کیونکہ اگر میں قبول کرلوں تو تم تو آزاد ہو جاؤ گے اور نہ قبول کروں تو میں دوزخ کی قید و بند سے آزاد ہو جاؤں گا۔ تمہاری آزادی کے لیئے میں اپنی دائمی آزادی قربان نہیں کرسکتا۔

بابا فرید گنج شکرؒ کا پسندیدہ ہدیہ

مجلس کا رعب تو تقریباً تمام ہی حاضرین پر طاری تھا تاہم چونکہ وہ اجنبی تھا اس لیئے وہ ذرا زیادہ ہی مرعوب تھا۔ پند و نصیحت کا دریا بہہ رہا تھا روحانیت کے راز پر راز کھولے جا رہے تھے اور فقرا اپنی جھولی بھر رہے تھے۔ دوسروں کے ساتھ اجنبی بھی ہمہ تن گوش تھا۔ اس نے بہت سے بزرگوں کی صحبت اٹھائی تھی لیکن ایسا کیف و سرور اور ایسی خدا آگاہی و خود آگاہی اسے کبھی بھی نصیب نہ ہوئی تھی آج اسے سمجھ میں آرہا تھا کہ آخر دنیا بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو قطب دوراں کیوں کہتی ہے اور ان کے دادا پیر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں شہبازِ ولایت کا لقب کیوں دیا۔ زبانِ مبارک سے جو کلمات نکل رہے تھے ایسا لگتا کہ پھول جھڑ رہے ہیں جن کی خوشبو سے مشامِ جان معطر ہو رہا تھا۔ بات چونکہ دل سے نکل رہی تھی اس لیئے دلوں میں اترتی چلی جارہی تھی جب بھی قول کے پیچھے عمل کی طاقت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ بات میں ضرور اثر دیتا ہے سلسلۂ

گفتگو جاری تھا کہ خادم نے مہمانوں کو آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے اور دسترخوان پر چن دیا گیا ہے مہمان اٹھ گئے مگر میزبان بیٹھا رہا کیونکہ میزبان نے تو چالیس سال سے سوائے ان دنوں کے جن دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے کوئی دن بھی بلا روزے کے نہ گزارا تھا۔ مجلس برخواست ہو گئی اور اس کے ساتھ اجنبی بھی کھانے کے لیے چلا گیا۔ بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ معمول تھا کہ عموماً عصر کے بعد مجلس برپا فرماتے جس میں باہر سے آئے ہوئے لوگ عرض معروض کرتے۔ تحفے اور ہدایا پیش کرتے۔ اس مجلس میں بھی اجنبی شریک تھا جب بابا صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے اپنی قلبی کیفیات اور روحانی امراض کا تذکرہ کیا۔ بیک جنبش نظر اس کا علاج کر دیا گیا اس کی بیعت قبول کی گئی اور داخل سلسلہ کر لیا گیا۔ اجنبی ایک ہدیہ لایا تھا شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کیلیے اس کے علاقے میں بہت عمدہ قینچیاں تیار ہوتی تھی ایک قینچی بابا صاحب کی خدمت میں پیش کی حضرت نے قینچی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جو اس بات کی دلیل تھی کہ ہدیہ قبول کر لیا گیا۔ پھر اجنبی سے فرمایا بیٹے! یہ قینچی لے جاؤ کہ قینچی کا کام کاٹنا اور جدا کرنا ہے میں تو سوئی دھاگہ چاہتا تھا جو دو جدا جدا کپڑوں کو جوڑ دیتا ہے۔ اللہ والوں کا کام کاٹنا اور جدا کرنا نہیں اللہ والوں کا کام دلوں کو جوڑنا نفرت کے آثار مٹا کر محبت پیدا کرنا اور ملت کے منتشر طبقات کو تسبیح کے دانوں کی طرح خدا کی ڈوری میں پرو دینا یہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام اور یہی ان کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔

برائی کا بدلہ بھلائی

رات کا وقت تھا اور جنگل کا سفر۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا گھٹا ٹوپ تاریکی میں پانچ آدمیوں پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ فقراء و مساکین تھے اور خوش قسمتی سے ان کے شیخ بھی ان کے ساتھ تھے۔ اتنے میں ڈاکوؤں

نے قافلے کو گھیر لیا اور تلاشی لینا شروع کر دی مگر جیل کے گھونسلے میں ماس تھا ڈاکوؤں کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ڈاکو بہت برہم ہوئے کہ آج ہمارا شگون ہی خراب ہو گیا۔ غصے میں آکر انہوں نے درویشوں کی پٹائی شروع کر دی اور جب مارتے مارتے تھک گئے تو انہیں چھوڑ کر الگ بیٹھ گئے۔ ایک طرف زخمی درویش اپنے شیخ کے ساتھ راندۂ درماندہ، غمگین و دل گیر اور دوسری طرف ڈاکو اپنے سردار کے ساتھ غصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ پو پھٹنے لگی اور سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ اسی حالت میں اسی طرح تیمم کر کے درویشوں نے نماز فجر ادا کی اس لیے کہ پانی میسر نہ تھا اور نہ میلوں کے ایریا میں پانی کے پائے جانے کی توقع تھی۔ شیخ جب نماز سے فارغ ہوئے تو زخمی درویشوں نے ان سے درخواست کی حضرت! آپ ان ڈاکوؤں کے لیے بد دعا کیوں نہیں کرتے۔ انہوں نے بے قصور ہم پر ظلم کیا، ہمیں مارا پیٹا اور اذیت پہنچائی۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے۔ ان کی باتیں سن کر شیخ نے دست دعا دراز کیا عرض کی: بارالہا! ان ڈاکوؤں کو دین اور دنیا کی بھلائی نصیب فرما کہ یہ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اور ان کے نام لیوا ہیں۔ اے گمراہوں کو ہدایت دینے والے، بھٹکنے والوں کو راہِ راست پر لانے والے! انہیں راہِ راست پر لگا دے اور اپنے مقبول بندوں کی جماعت میں شامل کر لے۔ شیخ یہ جملے ادا کرتے جا رہے تھے اور آنسو ان کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ زخمی و رنجور دل، قلب کا گداز، نیت کا اخلاص، مسلمانوں کی ہمدردی ایک دعا کی قبولیت کے لیے جتنی چیزیں ضروری ہوتی ہیں سب موجود تھیں، بھلا اللہ تعالیٰ ایسی دعا کو کیسے رد کرتا۔ دعا قبول ہو گئی اور تھوڑی دیر پہلے جو ڈاکو جفا کیش اور ظلم پیشہ تھے اٹھے اور شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر قدموں میں گر گئے۔ سابقہ جرائم سے توبہ کی اور بیعت ہو گئے۔ اخلاق کی تلوار نے لوہے کی تلوار پر فتح حاصل کر لی محبت نے نفرت کو شکست دی۔ اور امتِ مسلمہ کا وہ بگڑا ہوا طبقہ جو کچھ دیر پہلے گناہ کے دلدل میں پھنسا چلا جا رہا تھا توفیق الٰہی کی دستگیری سے باہر نکل آیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ آگے چل کر شیخ

کی دُعا کی بدولت اور ان کے فیضانِ صحبت کے اثر سے ان ڈاکوؤں نے اتنی عبادت و ریاضت کی کہ ابدالوں کی جماعت میں شامل ہو گئے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

عجز و انکساری

ولایت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک سالک اپنے آپ کو سب سے بُرا اور سب سے حقیر نہ سمجھے۔ کسی بری عادت کو ترک کرنے کے لیئے یہ عمل بہت مؤثر ثابت ہو سکتا ہے کہ روزانہ کئی مرتبہ اپنی بری عادت کی برائی کا خیال کر کے بار بار بُرا کہتا رہے۔ اس طرح آدمی میں اپنے عیوب کی دید پیدا ہو جاتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ خاکسار اور منکسر المزاج ہو جاتا ہے جو آدمی دوسروں کے عیب تلاش کرنے میں لگا رہتا ہے وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھنے لگتا ہے اور اس طرح خود بینی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مالک الملک کی بارگاہ بہت اونچی بارگاہ ہے اور اس کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیئے سب سے قیمتی نذرانہ عاجزی ہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو اس کے خزانے میں نہیں ہے۔ اس لیئے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کو جب ان کے شیخ خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ دریا کے کنارے رخصت کرنے لگے تو صرف دو باتوں کی وصیت فرمائی کہ دوسروں کی عیب جوئی نہ کرنا اور خود بین نہ بننا۔ اولیاء اللہ کا یہ معمول تھا کہ وہ ہمیشہ تنہائی میں اپنے نفس کو ذلیل کرتے رہتے تھے جس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ نفس کو خود پسندی اور خود بینی کی قید سے آزاد کرائیں۔ ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے آپ کو دیکھ کر کسی لڑکے نے کہا، یہ دیکھو منافق جا رہا ہے۔ کوئی دنیا دار ہوتا تو لٹھ لے کر اس بچے کے پیچھے دوڑ پڑتا یا اپنے اہالی موالی کو لگا دیتا کہ اس لڑکے

کو سزا دیں اور کچھ نہیں تو غصے میں ضرور آجاتا لیکن حضرت ذوالنون مصری پر ایسی کوئی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ راستے کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے فرمایا: سن لیا تو نے اپنے کانوں سے میں ہزار بار کہتا تھا کہ تو منافق ہے مگر تجھے یقین نہیں آتا تھا اب تو یقین آگیا۔ یہ مسلمانوں کے بچے ہیں اور مسلمانوں کے بچے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ دل میں نفاق کا اندیشہ ہونا ایمان کی علامت ہے۔ ابن ابی ملیکہ نامی ایک بہت بزرگ تابعی گزرے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے تقریباً تیس صحابہ کرام سے ملاقات کی اور سب کو اس حال میں پایا کہ انہیں اپنے اوپر نفاق کا شبہ تھا۔ غرض کہ ایمان خوف و رجا اور امید و بیم کے درمیان ہوتا ہے اور اس کی اصل عاجزی۔ عاجزی جتنی بڑھتی جاتی ہے ایمان میں اتنا ہی استحکام ہوتا جاتا ہے۔

خدمت میں عظمت

ابو علی رباطی رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ رازی کو امیر مان کر بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کے مطابق کہ جب دو آدمی ایک ساتھ سفر کے لیے روانہ ہونا چاہیں تو بہتر ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو امیر بنا لیا جائے۔ چونکہ سفر طویل تھا اور سفر پہ جانے والے دو مسافر تھے ابو علی رباطی اور عبداللہ رازی رحمہما اللہ۔ بو علی رباطی نے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ سنت کے مطابق کسی ایک کو امیر بنا لیا جائے۔ جناب عبداللہ رازی نے فرمایا کہ آپ امیر بن جائیں میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ علی رباطی نے فرمایا کہ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، آپ کا تجربہ بھی زیادہ ہے۔ علم اور تقویٰ کے اعتبار سے بھی آپ ممتاز ہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آپ امیر بنیں اور میں آپ کا حکم مانوں۔ حضرت عبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ٹھیک ہے میں امیر بننے کو تیار ہوں مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو پوری طرح میری اطاعت کرنا ہوگی۔ یہ فرمانے کے بعد انہوں نے ایک بوری لی

اور اس میں میرا سامان ڈال لیا پھر اپنا سامان رکھا اور بوری کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا میں عبداللہ رازی کے مقام اور مرتبے سے بخوبی واقف تھا شرم سے پانی پانی ہو گیا میں نے کہا حضرت آپ یہ کیا کرتے ہیں۔ آپ بوڑھے آدمی ہیں میں جوان ہوں، آپ امیر ہیں میں مامور ہوں۔ آپ میرا سامان پیٹھ پر کیوں اٹھاتے ہیں مجھے دیجیے میں لے چلوں گا۔ عبداللہ رازی نے فرمایا کہ جب آپ نے مجھے امیر مان لیا اور میری اطاعت کا وعدہ کر لیا تو آپ میرے کسی فیصلے میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ جماعت کا سردار جماعت کا خادم ہوتا ہے۔ اس لیے میں تو یہ فرض ادا کروں گا۔ ایسا لگا جیسے میری زبان پر تالے لگ گئے ہوں مجھے خاموش ہونا پڑا۔ اب آگے آگے عبداللہ رازی تھے اور پیچھے پیچھے میں۔ پسینے سے شرابور عبداللہ رازی کو محنت کا پسینہ تھا اور مجھے شرمندگی کا۔ راستے میں ایک جگہ رات آگئی ہم لوگوں نے جنگل میں ایک جگہ پڑاؤ کرنے کا ارادہ کر لیا شومیِ قسمت کہ تھوڑی دیر کے بعد کالے کالے بادل آسمان پر چھا گئے۔ کھانا کھانے اور نمازِ عشاء سے فارغ ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد زبردست بارش ہوئی۔ درخت کی اوٹ میں ہم دونوں بیٹھ گئے لیکن بھلا پتے بارش کو کیا سہارتے۔ میں بھیگنے لگا حضرت عبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گاڑھے کی ایک چادر تھی انہوں نے وہ چادر اوڑھ کر مجھے ڈھانپ لیا۔ اس طرح میں بھیگنے سے بچ گیا اور حضرت عبداللہ رازی رحمۃ اللہ علیہ رات بھر بارش میں بھیگتے رہے۔ میں جب بھی اعتراض کرتا وہ فرماتے چونکہ میں امیر ہوں اور تم نے میری اطاعت کا وعدہ کیا ہے اس لیے تمہیں اعتراض کا حق نہیں۔ اس وقت ابو علی رباطیؒ کو احساس ہوا کہ عبداللہ رازی کو امیر بنا کر وہ تو مشکل میں پھنس گئے۔

دل داری

چشتیہ نظامیہ سلسلے میں مولانا فخر الدین دہلوی نظامیؒ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ نظامیہ کو مستحکم بنانے میں ان کا ہاتھ ہے۔ ان کی خانقاہ دہلی کی مشہور خانقاہوں میں شمار کی جاتی تھی اور تشنگانِ ہدایت دور دراز علاقوں سے حاضرِ خدمت ہو کر فیض یاب ہوتے تھے۔ نہایت متقی، منکسر المزاج، خوفِ خدا رکھنے والے، انسانیت کے ہمدرد اور متبع سنت صوفیا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ علم شریعت و طریقت دونوں میں گہری نظر رکھتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ شریعت کی پابندی کے بغیر راہِ طریقت کھل ہی نہیں سکتی۔ سب کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی میں مضمر ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کثرت سے روزے رکھتے تھے اور اپنے متبعین کو نفل روزوں کی تاکید فرمایا کرتے تھے کیونکہ نفس کی شکست میں روزوں کا بہت دخل ہوتا ہے۔ اُس دن جس دن کا یہ واقعہ ہے شاہ صاحب روزے سے تھے نفلی روزہ۔ ایک بزرگ کی ملاقات کے لیے انہیں جانا تھا۔ ان کے مریدین میں سے چند لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم آپ کے ہمراہ چلنا چاہتے ہیں۔ بزرگ موصوف کو اطلاع دی جا چکی تھی کہ آج مولانا فخر صاحب فلاں وقت آپ سے ملنے تشریف لائیں گے۔ مولانا صاحب کا تشریف لے جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ بجلی کی طرح یہ خبر سارے محلے میں پھیل گئی۔ معمول کے مطابق مولانا بزرگ کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔

پاپیادہ تھے صرف چند ساتھی ہمراہ تھے کہ ایک گلی کی نکڑ پر ایک بڑھیا کھڑی ہوئی تھی۔ مولانا کی انتظار میں چشم براہ اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جب مولانا اس گلی کی نکڑ پر پہنچے تو بڑھیا نے سلام کر کے مولانا کو روک لیا ہمراہی بھی ٹھہر گئے۔ کافی عمر یافتہ بڑھیا تھی۔ اس نے عرض کیا بیٹا! مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم آج ہمارے محلے میں آ رہے ہو میں نے بڑے شوق و ارمان سے تمہارے لیے شربت کا یہ گلاس تیار کیا ہے۔

اسے پی لو گے تو میرا دل ٹھنڈا ہو جائے گا اور میرا ارمان پورا ہو جائے گا۔ میں غریب عورت ہوں مجھ سے یہی کچھ ہو سکا۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری اس مدارات کو نہیں ٹھکراؤ گے' مولانا نے بڑھیا کی باتیں سنیں' گلاس تھاما' زمین پر بیٹھ گئے اور شربت پی لیا۔ بڑھیا خوش ہو گئی' مولانا جب وہاں سے آگے چلے تو ہمراہیوں نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ نے تو نفل روزہ رکھا تھا اور اسے توڑ دیا؟ مولانا نے جواب دیا روزہ توڑنا آسان ہے کیونکہ میں اس کی قضا رکھ سکتا ہوں مگر دل توڑنا بہت بُری بات ہے کہ اس کی کوئی قضا نہیں۔ میں نے بڑھیا کا دل توڑنا گوارا نہیں کیا کہ:

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل خوشتر است

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی دلسوزی

ان کا عزیز بے تکلفی سے خلوت خانے میں داخل ہو گیا' اور چونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ وہ حضرت کا قریب ترین عزیز ہے' اس لیئے کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ ایک دعوت سے کھانا کھا کر واپس آ رہا تھا۔ دعوت میں معمولی لوگ نہیں تھے' شہر کے رؤساء تھے' کھاتے پیتے' مگر ان میں سے کوئی شخص بھی تکلیف و آزار سے خالی نہ تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ سامان آسائش کو آسائش سمجھتے ہیں اس لیئے ساری زندگی سامانِ آسائش کو جمع کرنے میں اور ان کی حفاظت کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ لیکن جب اپنے باطن کی دنیا میں اتر کر دیکھتے ہیں تو خوب سے خوب تر کی آرزو' طمع اور حرص کا غلبہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں بے چینی کا پیدا ہونا لازم ہے۔ حالانکہ اطمینانِ قلب باہر نہیں ہوتا انسان کے اپنے باطن میں ہوتا ہے۔ باطن درست ہو' دل قناعت سے معمور ہو' انسان پر دنیوی مال و متاع کی حقیقت کھلی ہوئی ہو تو وہ حرص و ہوس کی قید سے آزاد' مطمئن و شادکام ہوتا ہے۔ چاہے اس

کے پاس جسمانی آسائش کا کوئی بھی سامان نہ ہو یا بقدرِ ضرورت ہو۔ اس آدمی نے حضرت کو بتایا کہ دعوت کے اختتام کے بعد ہم لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ چند لوگوں نے کہا کہ یارو! ہم لوگ دولت مند اور صاحبِ اقتدار بھی ہیں اور ہمارا گھر خدم و حشم سے بھرا ہوا بھی ہے لیکن جو عافیت اور سکونِ قلب سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کو حاصل ہے اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ بادشاہوں کو بغاوتوں کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ اہلِ ثروت کو چور اور ڈاکوؤں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ اہلِ نعمت زوالِ نعمت کے خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں مگر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو دیکھو کہ ہر فکر و آزار سے آزاد بیٹھے رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ؎

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

اپنے عزیز کی یہ باتیں سن کر حضرت خواجہ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ فرمایا: "بھائی! میں کہاں سکون میں ہوں۔ روزانہ ہزاروں افراد اپنا دکھ درد لے کر میرے پاس آتے ہیں اور دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ سب کا دکھ میں اپنے سینے میں سمیٹ کر دکھی بن جاتا ہوں۔ بھلا وہ دل ہی کیا جو دوسروں کے درد کو محسوس نہ کرے۔ بھائی! طریقت تو نام ہی محبت، ہمدردی، دلجوئی اور خدمتِ خلق کا ہے۔"

تیغ اخلاق

سوار شراب سے بھرا ہوا مٹکا لے کر آرہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ راستے میں کوئی آدمی مل جائے گا تو بیگار میں اسے پکڑ لے گا اور اس طرح وہ مٹکے کے اٹھانے کی مشقت سے بچ جائے گا۔ دیکھا کہ ایک مفلوک الحال گدڑی پوش فقیر مصلّے پر بیٹھا ذکر و اذکار میں مصروف ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کام کے لیے سب سے موزوں

یہی آدمی ہو سکتا ہے۔ نہ روئے گا نہ فریاد کرے گا اور میرا کام انجام پا جائیگا۔ درویش کے قریب گیا اور قریب جاتے ہی اسے ایک زوردار ڈانٹ پلائی یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ اٹھ اور یہ مٹکا سر پر رکھ لے میں جدھر کہتا ہوں اُدھر چل۔ درویش نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ مصلی لپیٹ کر کنارے رکھ دیا اور خاموشی سے مٹکے کو سر پر رکھ لیا اور سوار کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مٹکے سے جو ناگوار بو اُٹھ رہی تھی اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مٹکے میں شراب ہے۔ کہاں وہ تقویٰ اور تقدس کہ سارے حجابات اٹھے ہوئے ہیں اور جسم کے رگ و ریشے میں ذکر الٰہی پیوست ہے۔ ایک لمحہ بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں۔ اولیاء اللہ کے سرتاج اور کہاں سر پر شراب کا مٹکا آگے آگے سوار اور پیچھے پیچھے پا پیادہ چلے جا رہے ہیں۔ شہر کے قریب ایک مکان سے ساز کی آواز آرہی تھی۔ سوار اس مکان کے دروازے پر ٹھہر گیا دروازہ کھلوایا تو ایک طنبورہ نواز ہاتھ میں طنبورہ لیے ہنسی اور ٹھٹول کرتا ہوا باہر آیا اور نہایت گرمجوشی سے سوار سے مصافحہ کیا۔ سوار نے درویش کو حکم دیا کہ شراب کا مٹکا کمرے کے کونے میں رکھ دے۔ مٹکا رکھوا کر سوار نے طنبورہ لے کر بنداقادرویش کے سر پر مار دیا اور کہا یہ ہے تیری مزدوری۔ سر پھٹ چکا تھا اور اس میں سے خون بہہ رہا تھا مگر درویش نے ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ الٹا اس کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے واپس آگیا۔ البتہ درویش کے سر پر طنبورہ مارنے کی وجہ سے اس کا ایک کونا ٹوٹ گیا تھا۔ درویش کو اس کا بہت رنج ہوا کہ میری وجہ سے اس بیچارے کے شوق کی چیز ٹوٹ گئی۔ یہی خیال لیے ہوئے درویش اپنی نشست گاہ پر پہنچا اور سوچنے لگا کہ سوار کے نقصان کی تلافی کس طرح کروں۔ مصلیٰ پڑا ہوا تھا اٹھایا، بازار گیا اور اسے فروخت کر دیا۔ جو پیسے ملے تھے انہیں لے کر سوار کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب سوار باہر نکلا تو اسے وہ رقم حوالے کر دی اور کہا: بھائی تو نے مجھے مارا تیرے ہاتھ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی اس میں سے آدھی رقم تو لے لینا اور آدھی رقم اس آدمی کو دے دینا جس کا یہ طنبورہ تھا کہ وہ اپنے ٹوٹے ہوئے طنبورے

کی مرمت کرالے جو تکلیف تمہیں پہنچی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔
بالکل سیدھے سادھے جملے تھے لیکن برق بن کر خرمن گناہ پر گرے اور سوار کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ دل میں کہنے لگا۔ مولا! میں کتنا کمینہ اور یہ کتنا شریف ہے۔ بابا کا ہاتھ پکڑ لیا کہا کہ حضور! مجھے توبہ کرائیے آپ جیتے میں ہارا۔ سیدنا ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اس گناہ میں لتھڑے ہوئے انسان کا ہاتھ تھام کر اسے سینے سے لگا لیا اور دیکھتے دیکھتے اس کے سینے کو انوارِ معرفت سے منور فرما دیا:

فضیل بن عیاضؒ کی توبہ

جس جگہ قافلے کو پڑاؤ کرنا تھا وہ جگہ بہت بدنام تھی لیکن اس کے سوا کوئی مناسب جگہ میلوں میں موجود نہ تھی کیونکہ وہاں پانی بھی موجود تھا، سرائے بھی تھی اور کھانے پینے کا بھی آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجبوراً سالارِ کارواں نے اسی جگہ پڑاؤ کا فیصلہ کر لیا۔ قافلے کے ایک آدمی کے پاس کافی رقم تھی اور اسے اس بات کا پختہ یقین تھا کہ آج رات ڈاکہ ضرور پڑے گا۔ اس نے سوچا کہ رقم کو اپنے پاس نہ رکھے یا تو کسی جگہ زمین میں دفن کر دے یا پھر آس پاس کے علاقے میں اگر کوئی قابلِ اعتماد آدمی مل جائے تو بطور امانت رقم کو اس کے پاس محفوظ کر دے۔ اس نے ایک تھیلے میں اشرفیاں ڈالیں اور کسی امانت دار آدمی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک نہایت مقدس صورت والا درویش ایک مصلے پر بیٹھا عبادت میں مصروف ہے۔ درویش کا نورانی چہرہ دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا اور اس سے اپنی مشکل بیان کی۔ درویش نے مصلے کا ایک کونا اٹھا دیا اور کہا کہ تجھے جو کچھ رکھنا ہے اس مصلے کے نیچے رکھ دے اور بے فکر ہو جا۔ کل صبح تجھے تیری امانت واپس مل جائے گی۔ مسافر تھیلی مصلے کے نیچے رکھ کر سرائے میں واپس آ گیا۔ اس کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ رات میں ڈاکہ پڑ گیا اور تمام اہلِ کارواں لٹ گئے صبح کو جب وہ اپنی امانت درویش سے لینے واپس گیا تو اس کے تو اوسان خطا

ہو گئے کیونکہ اس نے درویش کو پہچان لیا تھا۔ ان کا یہ درویش رات میں ڈاکہ ڈالنے والی جماعت کا سردار تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ میں تو اس کی ظاہری شکل وصورت سے دھوکہ کھا گیا۔ میری تو ساری رقم ہی ڈوب گئی۔ بھلا ڈاکوؤں کا سردار مجھے میری امانت کیوں لوٹا دے گا۔ اگر میں زیادہ اصرار کروں تو میری جان کے لالے پڑ جائیں گے یہ سوچ کر انتہائی مایوسی کے عالم میں مسافر لوٹنے لگا تو درویش نے اسے بلایا اور کہا کہ بھائی تو اپنی امانت واپس لیتا جا تیری امانت جوں کی توں محفوظ ہے۔ پہلے تو مسافر کو یقین نہیں آیا کہ بھلا چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ لیکن درویش نے حب زیادہ اصرار کیا تو وہ مصلّے کے قریب گیا اور اپنی تھیلی اٹھالی۔ اشرفیاں شمار کیں تو پوری تھیں درویش نے کہا کہ ڈاکہ میرا پیشہ ہے لیکن امانت رکھنے والے کی امانت کی حفاظت کرنا میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ جس وقت درویش یہ بات کہہ رہا تھا تقدیر اس کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کی قسمت پر رشک کر رہی تھی کیونکہ اس کی یہ ادا اللہ تبارک وتعالے کو پسند آگئی کچھ ہی دنوں بعد ڈاکوؤں کا یہ سردار اپنی جماعت کو لے کر ڈاکہ ڈالنے کے لیے جا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ اسے ٹھہرنا پڑا۔ سورج غروب ہو چکا تھا سردار خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ دور سے کسی کی تلاوت کی آواز سنائی دی قاری جس آیت کی تلاوت کر رہا تھا اس کا مفہوم یہ ہے "کہ کیا ایمانداروں کے لیے اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے کانپ جائیں" قرآن کی یہ آیت تیر بن کر سردار کے دل میں پیوست ہو گئی اور واقعۃً اس کا دل کانپ اٹھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا اور کہا میرے مالک! میرا دل تیرے ذکر سے کانپ گیا ہے۔ میں گنہگار ہوں اور اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔ ساتھیوں نے پوچھا تو اس نے اپنی توبہ کا تذکرہ کیا۔ ساتھیوں نے بھی اس کے ساتھ توبہ کی اور اب وہی ڈاکو فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سید الطائفہ اور مشائخ چشت کا سردار۔

شیخ عبدالوہابؒ کا کمالِ حلم

غلام کے ہاتھ سے جب پانی کی صراحی چھوٹ کر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ گرامی شیخ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے جسم پر گر پڑی اور ان کا سارا لباس بھیگ گیا تو غلام پر مارے خوف کے لرزہ طاری ہو گیا اور قریب تھا کہ وہ گر پڑتا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ شیخ عبدالوہابؒ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ وہ اپنے والد کے صحیح جانشین تھے۔

اور ان کی طرف بالکل اسی طرح کا رجوع تھا جیسا کہ ان کے والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا۔ قرآن و سنّت کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ تاہم وہ حنبلی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ والد گرامی کی محبت نے کیمیا کا سا اثر کیا تھا۔ طریقت کا سارا معاملہ صحبت پر موقوف ہے۔ جس طرح خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے اسی طرح اگر کسی کامل کی صحبت میسّر آجائے تو قطرہ گہر اور ذرّہ خورشید بن جاتا ہے۔ کامل بھی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا کامل۔ سنّت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ساری زندگی اللہ تعالےٰ کی یاد میں بسر کر دی۔ دنیا اپنے تمام الوانِ نعمت سجائے خادمانہ انداز میں آپ کے سامنے کھڑی رہی مگر آپ نے کبھی اس کی طرف رخ نہ کیا۔ ہزارہا کافر آپ کے دستِ حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور لاکھوں بندگانِ خدا نے آپ سے رہنمائی حاصل کی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی نگاہِ پاک کو ایسی تاثیر بخشی تھی کہ جس پر ایک مرتبہ شفقت کی نظر ڈالتے اس کی دنیا اور عاقبت سنور جاتی۔ زبان میں ایسی تاثیر تھی کہ جب وعظ فرماتے تو ہیبتِ خدا سے بعض لوگوں کا دم نکل جاتا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے صاحبزادہ گرامی کو آپ سے کیا کچھ نہ ملا ہوگا۔ عالم نزع میں جب شیخ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد بزرگوار سے دریافت فرمایا، حضور! آپ کی آخری وصیت کیا ہے۔ تو شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا صرف ایک بات۔ اللہ کے سوا کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کرنا اور وفات ہو گئی۔ شیخ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے ساری زندگی اپنے والد بزرگوار کی اس وصیت کو حرزِ جان بنائے رکھا۔ غلام کے

ہاتھ سے پانی کی صراحی جب چھوٹ کر گر گئی اور کپڑے تر بتر ہو گئے تو آپ نے غلام کو مسکرا کر دیکھا۔ فرمایا "لرزتے کیوں ہو غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی تم بھی ایک انسان ہو۔ شاید تمہارا مرتبہ مجھ سے افضل ہو۔ شاید انوار و برکات تمہارے پاس زیادہ ہوں"۔ اور شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم تم پر زیادہ ہو اس کے بعد آپکی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ادھر غلام بھی رونے لگا اور دونوں رونے والوں کے آنسو فرشتے موتی سمجھ کر چننے لگے۔

مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ کا توشۂ آخرت

دربار صرف بادشاہوں کے نہیں نہ صرف راجوں مہاراجوں کے ہوتے ہیں بلکہ بعض فقیروں نے بھی دربار لگائے ہیں اور وہ دربار مثالی دربار ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک دربار کچھ عرصہ پہلے گنج مراد آباد میں بھی لگا تھا کہ دنیا کے دکھ کے مارے یا گم کردہ راہ حاضر ہوتے اور مرادیں پاتے۔ کوئی بھی اس دربار سے خالی ہاتھ واپس نہ گیا۔ علم کے متلاشی علم پاتے، ہدایت کے ڈھونڈنے والے راہِ ہدایت سے فیض یاب ہوتے، دولتِ دنیا کے سائل دولت پاتے، بیمار شفا پاتے اور پریشان حال سکون۔ اس دربار کو سجانے والے ایک درویش خود آگاہ، خدامست مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ تھے جن کے زہد و تقویٰ، علم و عمل اور رشد و ہدایت کا تذکرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا حدیث میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے اور طریقت میں شاہ محمد آفاق دہلویؒ کے مرید و خلیفہ۔ ان کے دربار میں امیر غریب، ادنیٰ و اعلیٰ حاکم و محکوم مسلم و غیر مسلم سب کی حاضری ہوتی رہتی تھی اور سب فائز المرام اور کامیاب لوٹتے تھے۔ ایک دن ایک نواب نے بہت قیمتی عبا خدمت میں پیش کی۔ حضرت مولانا نے اس عبا کو بہت پسند فرمایا۔ خادم سے کہا کہ اسے میرے لیے رکھ لو میں یہ کسی کو نہیں دوں گا۔ خادم نے عبا کو اٹھا کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نہایت مفلوک الحال شخص بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے حاضر ہوا اور رو کر حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا۔ اس نے کہا حضرت! میں بہت ہی غریب آدمی ہوں۔ میری دو جوان بچیاں ہیں۔ ان کی شادی کرنی ہے میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ ہر طرف تھپیڑ مارے مگر کچھ بھی نہ بنا۔ آخر میں ہار چھپتا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک نظرِ کرم کا محتاج ہوں۔ خدا کے لیے میری امداد فرمایئے کہ میں اپنے قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مولانا نے فرمایا: بھائی! اس وقت تو میرے پاس سوائے ایک قیمتی عباء کے کچھ نہیں ہے۔ خادم سے عبا لانے کو کہا۔ وہ عباء آپ نے اسے دے دی۔ اسی مجلس میں ایک امیر آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس عبا کو تبرک سمجھ کر ایک ہزار روپے میں اس غریب سے خرید لیا۔ وہ بیچارہ خوشی خوشی ایک ہزار لے کر شکریہ ادا کرتا وہاں سے رخصت ہو گیا۔ خادم نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا۔ حضور! آپ نے تو فرمایا تھا کہ یہ عبا میں اپنے لیے رکھوں گا کسی کو نہیں دوں گا۔ مگر آپ نے اس سائل کو دے دیا۔ مولانا نے ارشاد فرمایا: بے وقوف! میں نے اسے اپنے ہی لیے تو رکھ لیا ہے۔ کیا تو نے قرآن میں نہیں پڑھا ہے کہ "جو بھلائی تم دنیا سے جانے سے پہلے کر جاتے ہو اس کا بہتر بدلہ تم آخرت کی زندگی میں اللہ تعالٰے سے پاؤ گے"۔ وہ عبا میں نے آخرت کے لیے اللہ تعالٰے کے پاس محفوظ کر لی ہے۔

دلوں پر حکومت

ہشام ابن عبدالملک بڑی شان و شوکت کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔ ایک مرتبہ شام کے رؤساء کے ساتھ حج کے لیے گیا۔ حج میں سب سے زیادہ بھیڑ حجرِ اسود پر بوسہ دینے کے وقت اور شیطان کو کنکریاں مارنے کے وقت ہوتی ہے۔ حجاجِ کرام جب خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول رہتے ہیں تو انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ کون امیر ہے کون غریب، کون بادشاہ ہے کون رعایا، کوئی نہیں دیکھتا سب اسی دھکے میں مصروفِ طواف رہتے ہیں۔

ہشام ابن عبدالملک بھی طواف کے دوران تین مرتبہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا لیکن ہجوم کے دباؤ کی وجہ سے حجرِ اسود کے قریب نہ پہنچ سکا اور دھکے کھاتا ہوا بے نیل و مرام واپس چلا آیا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ امام زین العابدین رض صاحبزادۂ گرامی امام حسن شہید کربلا رضی اللہ تعالےٰ عنہما طواف کرتے ہوئے حجرِ اسود کے سامنے پہنچے تو مجمع خود بخود ہٹ گیا۔ امام تشریف لے گئے اور اطمینان سے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ ہشام ابن عبدالملک کے ساتھ جو شامی امرا تھے وہ اس واقعہ پر بہت تلملائے اور ہشام سے پوچھا کہ یہ کون آدمی ہے۔ جسکا لوگوں کے دلوں میں اتنا احترام ہے۔

ہشام حضرت امام زین العابدین رض کو پہچانتا تھا لیکن خفت اور شرمندگی کی وجہ سے کہدیا میں نہیں جانتا یہ کون آدمی ہے۔ اس کے پاس ہی عربی کا مشہور شاعر فرزدق کھڑا ہوا تھا اس نے برجستہ امام زین العابدین رض کی شان میں ایک طویل قصیدہ ہشام ابن عبدالملک کے سامنے پڑھا جس میں یہ واضح کیا کہ امام کی ذات وہ ذات ہے جس کے قدموں کی آہٹ کو مکہ کی پہاڑیاں پہچانتی ہیں۔ اگر تو ان کو نہیں پہچانتا تو نہ پہچان، انہیں عرش و کرسی، لوح و قلم، کعبہ و ربِ کعبہ سب پہچانتے ہیں۔ فرزدق نے جب یہ قصیدہ ہشام ابن عبدالملک کے سامنے پڑھا تو غصے میں سوائے اس کے اس سے کچھ نہ بن پڑا کہ فرزدق کو گرفتار کر کے جیل میں ڈلوا دیا۔ امام زین العابدین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو جب اس بات کی اطلاع ملی کہ ان کی مدح سرائی کی پاداش میں فرزدق کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے تو انہوں نے اشرفیوں کا ایک توڑا بطور انعام فرزدق کے پاس بھیجا۔ فرزدق نے وہ انعام امام رض کے پاس واپس کر دیا۔

اور جواب میں لکھا کہ میں دنیا میں آپ سے انعام نہیں لینا چاہتا۔ حشر کے دن میں اپنا انعام شفاعت کی صورت میں انشاءاللہ آپ کے نانا سے لے لوں گا۔

رضائے الٰہی کی طلب

حضرت عامر ابن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے علمِ دین میں وہ مقام حاصل کیا جو بڑے بڑوں کو نصیب نہ ہو سکا علم جب اپنے شباب کو پہنچا تو معرفت کے دروازے کھل گئے اور عبادت و ریاضت نے اپنا رنگ دکھایا رات بھر عبادت اور دن بھر روزہ یہ تھا ان کا معمول تلاوت کے سوا کسی سے بے ضرورت کلام نہ فرماتے۔ ان خصوصیات نے انہیں اسلام کا راہب قرار دے دیا تھا عبادت و ریاضت کے سوا ان کا ایک اور مشغلہ تھا اور وہ تھا جہاد فی سبیل اللہ۔ مگر میدان جہاد میں جانے سے قبل آپ اپنے مزاج کے مطابق رفیق بھی تلاش کرتے تھے جب رفیق مل جاتے تو ان کے سامنے یہ شرائط پیش کرتے کہ میں تمہارا مؤذن ہوں گا میں ہی تمہاری خدمت گذاری کروں گا اور اس میں کسی قسم کی دخل اندازی یا اعتراض کو برداشت نہیں کروں گا۔ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق تمہارے سارے اخراجات اپنی جیب خاص سے پورے کروں گا جو شخص آپ کی ان شرائط کو منظور کر لیتا اسے اپنا ساتھی بنا کر جہاد میں لے جاتے۔ جہاد میں تشریف لے جاتے تو کچھ دور تک خود سوار ہوتے اور ان کا ساتھی پیدل چلتا اور کچھ دور تک ساتھی گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہوتا اور خود یہ علامۃ الدہر اور علم و حکمت کا مینار سواری کی باگ تھام کر پیدل چلتا۔

نہ اپنی برتری کا خیال ہوتا نہ علمی فوقیت کا صرف ایک چیز پیشِ نظر ہوتی کہ جان جائے، مال جائے، اولاد جائے، گھر لٹے مگر اللہ راضی ہو جائے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کا رب ان سے ضرور بالضرور راضی ہو گیا ہو گا اور یہی مومن کی معراج ہے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے آگ کے الاؤ میں چھلانگ لگائی تھی۔ زکریا علیہ السلام آرے سے چیر دیے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام پھانسی کے تختے تک چلے گئے تھے اور اسی لیے سید المرسلین محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بازارِ طائف میں لہولہان ہوئے تھے۔

امام زین العابدینؓ ـــــ عفو و درگزر

اونچے اور نیچ آدمی کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہ ہے کہ اونچی فطرت کا آدمی جب کسی مرتبے پر پہنچتا ہے تو اس میں عاجزی رحم دلی اور خاکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن نیچ آدمی اونچے مرتبے پر فائز ہو جانے کے بعد اپنی حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے عمل اور زبان سے لوگوں کو ستاتا اور ان کی بد دعائیں سمیٹتا ہے۔ ہشام ابن اسمٰعیل گورنر مدینہ بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مدینہ کا گورنر بننے کے بعد ایسا لگا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ بر سرِ دربار اہل بیت اطہار کو برا بھلا کہتا اور جمعہ کے خطبات میں حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ پر برملا سب و شتم کرتا۔ اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ستانا اور ان پر مظالم کے پہاڑ توڑنا اس کی زندگی کا نصب العین تھا۔ مگر دوسری طرف صبر و ضبط کے پہاڑ کھڑے تھے۔

جن کے آباء و اجداد کبھی بازارِ طائف میں زخمی ہو کر پتھر مارنے والوں کو دعا دیتے تھے، کبھی شعبِ ابی طالب میں قید و بند کی زندگی گزار چکے تھے اور کبھی میدانِ کربلا میں سر کٹا کر اور خیمے جلوا کر بھی جبین بجبیں نہ ہوئے تھے۔ آخر عذابِ الٰہی کا دھارا ہشام ابن اسماعیل پر گرا اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کسی وجہ سے اس سے ناراض ہو گیا اور اسے معزول کر کے حکم دیا کہ اسے مجمعِ عام میں کھڑا کیا جائے۔ اور جس جس کو اس سے تکلیف پہنچی ہے وہ اس سے بدلہ لے۔ ہشام کو سب سے زیادہ بنو ہاشم سے اندیشہ تھا کیونکہ اس وقت اس کو اپنا ایک ایک گناہ یاد آ رہا تھا۔ سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اپنے اہلِ خاندان کو جمع کیا اور فرمایا کہ کوئی شخص ہشام سے تعرض نہ کرے۔ ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ نے عرض کیا: کیوں۔ خدا کی قسم اس نے ہمارے اوپر بہت مظالم ڈھائے ہیں ہم تو اسی وقت کا انتظار کر رہے تھے اور آپ ہمیں انتقام لینے سے منع فرما رہے ہیں۔ امام زین العابدین نے فرمایا: بیٹے! صبر اور عفو و درگزر خاندانِ نبوت کا شیوہ ہے ہم اس کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔ میرے بیٹو! پیالے سے

وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔ کسی حال میں بھی ہمیں اپنا خاندانی کردار نہیں چھوڑنا چاہیے ہشام ابن اسماعیل کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا اور اسے اپنی پستی اور اہلِ بیت اطہار کی بلندی صاف نظر آنے لگی۔

نفس پر قابو پانا

سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ راہِ طریقت پر مستقیم رہتے ہوئے شریعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے کیونکہ شریعت سب سے برتر اور سب پر فائق ہے۔ اصل راستہ قرآن کا راستہ اور اصل پیروی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے۔ جو شخص آپ کے راستے سے منحرف ہو کر راہِ حق تلاش کرنا چاہے اسے ہرگز ہرگز منزل مقصود پر پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کا جو جناب شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے یہی طریق تھا۔ سراپا اخلاص و بندگی۔ ہر ایک کے غم خوار، ہر ایک کے ہمدرد و دردمند۔ اسی لیے سیّد الطائفہ جناب جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے: "ہمارے دور کے صدیق حاتم اصم ہیں۔"

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن ارشاد فرمایا: "نفس کی خواہشات تین ہیں اور انہی پر قابو پا لینا اصل مردانگی ہے۔ ایک لذتِ طعام، دوسری لذتِ کلام اور تیسری لذتِ نظر۔ لذتِ طعام پر قابو پانے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی رزاقیت پر کامل اعتماد پیدا کرے کہ وہی رزاق مطلق ہے۔ کسی انسان کا رزق کسی خاک کے بنے ہوئے انسان کے ہاتھ میں نہیں۔ اور لذتِ کلام کا علاج یہ ہے کہ انسان خود کو سچ کا پابند بنا لے۔ جب بولے سچ بولے۔ تول تول کر بولے۔ ذمہ داری سے کلام کرے۔ اور لذتِ نظر کا علاج یہ ہے کہ اپنی نظر کو نظرِ عبرت بنائے رکھے۔ کیونکہ نظر ایک زہر آلود تیر ہے۔ اس کی حفاظت نہ کرو گے تو یہ گناہ کے اس اندھیرے غار میں گرا دے گی جہاں سے ابھرنا سخت دشوار ہوگا۔ اس کا حل یہ ہے

کہ ہر شے پر عبرت کی نگاہ ڈالو۔ اسوقت تمہاری نگاہ حقیقت رس اور دیدۂ عبرت بن جائے گی اور تم بدنظری سے تعلق رکھنے والے تمام عیبوں اور گناہوں سے خلاصی پا جاؤ گے ہر مرض کو دفع کرنے کے لیے ایک علاج ہوتا ہے اور ایک پرہیز نفس کے امراض کا علاج اللہ کے ذکر سے کیا جاتا ہے اور پرہیز لذتِ طعام، لذتِ کلام اور لذتِ نظر پر قابو پانا ہے۔

ابراہیم بن ادھمؒ

بادبانی جہاز دریا میں محوِ سفر تھا۔ جہاز میں علاقہ کے امراء تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار۔ جہاز کے ہر حصے میں عیش و عشرت کی محفلیں بپا تھیں۔ ہنگامہ آرائی اور شور و غوغا کی وجہ سے جہاز میں بڑی رونق تھی۔ مگر یہ رونق چند دونوں تک رہتی ہے۔ آخر لوگوں میں اکتاہٹ پیدا ہونے لگی۔ امیر الامراء کے درباریوں نے مشورہ کیا کہ جہاز میں اگر کوئی گنوار اور غریب آدمی مل جائے تو اس سے دھول دھپا ہو اور نقل اور مسخرے پن کا لطف بڑھے۔ اس مشورے کے بعد امیر کے درباری جہاز میں پھرنے لگے۔ مگر اس میں تو بڑے بڑے لوگ تھے یا پھر ملاح اور جہازی۔ کوئی غریب آدمی میسّر آتا تو کہاں سے۔ اتفاق سے پھرتے پھراتے جہاز کے زیریں علاقے میں ایک بوڑھا مسکین کمبل پوش نظر آ گیا۔ بس پھر کیا تھا درباریوں کی بن آئی اور اس بوڑھے کو امیر کے دربار میں پکڑ لائے۔ اب کوئی آگے بڑھ کر بوڑھے کو ایک دھول لگا رہا ہے اور دوسرا اس کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹے جا رہا ہے اور بوڑھے کی یہ حالت دیکھ کر سب ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے جا رہے ہیں، مگر سب یہ دیکھ کر حیران تھے کہ بوڑھا بجائے رونے دھونے اور فریاد کرنے کے مسکرائے جا رہا ہے۔ یہ مسکین بوڑھا کون تھا۔ کسی کو پتہ نہیں البتہ اس کی یہ مسکرانے والی کیفیت تعجب انگیز ضرور تھی۔

یہ بوڑھا معمولی آدمی نہیں ہے۔ بلخ کا سابق حکمران ہے جس نے تخت سلطنت پر

لات مار کر درویشی اختیار کر لی۔ حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ دھول دھپے اکھا کر مسکراتے جا رہے ہیں کہ نفس کی تذلیل ہو رہی ہے معرفتِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ نفس ہے جو انسان کی رگ و پے میں خون کے ساتھ جاری ہے۔ یہ ظالم شیطان کے ساتھ سازباز کر کے ہمیشہ انسان کی راہ کھوٹی کرتا ہے۔ حضرت ابراہیم بن ادہم خوش ہیں کہ آج اسے ذلت مل رہی ہے۔ اتنے میں غیرتِ خداوندی کو جوش آیا۔ الہام ہوا کہ ان کی گستاخی تو حد سے بڑھ چکی ہے۔ میری غیرت اپنے دوست کی اس تذلیل کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی کہو تو سب کو غرق کر دوں۔ سیدنا ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا، بارالٰہا! غرق کرنے کی بجائے ان کو آنکھیں ہی نہ دے دیجیے کہ یہ اس خرافات سے باز آجائیں کیونکہ میں تو ڈبو دینے کو کمال نہیں سمجھتا بہا دینا ہی کمال ہے اور یہی میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

ایک آہ کا اجر

جب فجر کی نماز ختم ہو گی۔ تو خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ مسجد سے باہر نکلے دروازے پر ایک شخص ملا اور حضرت خواجہ صاحب سے سوال کیا۔ کیا جماعت ختم ہو گئی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ ہاں اُس آدمی نے کہا ہائے افسوس اور مسجد کے دروازے ہی پر ٹھنڈا سانس لے کر بیٹھ گیا۔ خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار بلند پایہ اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ تصوف کے چودہ خانوادوں کے امام مانے جاتے ہیں۔ بارگاہِ ربوبیت کے رازوں کے جاننے والے خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اُس شخص کی کیفیت کو سمجھ لیا۔ اُس کے پاس آئے اور فرمایا۔ تمہیں جماعت کے فوت ہو جانے کا معلوم ہوتا ہے کہ بہت صدمہ ہوا ہے۔ اس نے کہا جی ہاں! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جماعت کا ثواب اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں ۲۷ گناہ زیادہ ہوتا ہے۔

افسوس کہ آج صبح میری غفلت کی وجہ سے میں اس ثواب سے محروم ہوگیا خواجہ صاحب نے فرمایا: مجھ سے معاملہ کرلو۔ میں اپنا ثواب تمہیں بخشتا ہوں۔ تم اپنی یہ آہ جو تمہارے دل سے بلند ہوئی ہے۔ مجھے دے دو۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ مجھے یہ سودا منظور ہے یہ کہہ کر وہ نماز ادا کرنے مسجد میں چلا گیا۔ اور خواجہ صاحب اپنے گھر واپس آگئے۔ رات میں اُس شخص نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔ اے فلاں تو نے بہت گھاٹے کا سودا کیا۔ تیری آہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تجھے دو رکعت کی بجائے ۲۰۰ رکعت کا ثواب دے دیا تھا۔ اور تو نے وہ آہ حسن بصریؒ کے ہاتھوں فروخت کر دی۔ صبح اُٹھ کر بھاگا بھاگا۔ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُن سے عرض کیا۔ کہ میں اپنا سودا واپس لینا چاہتا ہوں۔ جناب خواجہ نے فرمایا حضرت اب سودا واپس نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ جو تجھے اطلاع ملی ہے۔ وہ مجھے بھی مل چکی ہے۔

سعید بن مسیبؒ کی غیرتِ دینی

تابعین میں حضرت سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ علم حدیث علم فقہ اور علم تفسیر میں وہ ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کسی حکومت کی خوشامد کی نہ کسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس سلسلے میں بہت ساری مشکلات سے دوچار ہوئے۔ مگر اُن کے پائے استقلال میں ذرہ برابر بھی لغزش نہ آئی۔ خلیفہ ولید اموّی کا دَورِ حکومت تھا۔ وہ مسجد نبوی میں مصروفِ عبادت تھے۔ کہ بے پناہ جاہ و جلال کے ساتھ ولید مسجدِ نبوی میں آیا۔

سپاہی آئے۔ اور حضور کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو وہاں سے نکال دیا۔ کوتوال سعید ابن مسیبؒ کے پاس بھی آیا اور اُن سے کہا کہ اُٹھئے خلیفہ آرہے ہیں سعید ابن مُسیبؒ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ فرمایا کہ یہ کون خلیفہ آگیا ہے۔ کہ خانہ خدا سے بندگانِ خدا کو نکلوا رہا ہے؟ جاؤ کہہ دو کہ میں نہیں جاؤں گا۔ کوتوال جانتا تھا۔ کہ یہ آدمی اپنے ارادوں میں

پہاڑ ہے جو کہے گا- اُسے پورا کرے گا- وہ پیٹتا گیا- اتنے میں خلیفہ مسجد کے دروازے پر آ گیا گھبرا کر کوتوال سعید ابن مسیبؒ کے پاس دوڑا ہوا آیا- کہا کہ اچھا آپ بیٹھے رہیں- آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ جب خلیفہ آئیں تو سلام کو اٹھئے گا-

حضرت سعیدؒ چمک کر بولے- خدا کے گھر میں دو کا سلام نہیں ہوتا، اور نہ مسجد میں امتیاز کی ضرورت ہے- مسجد میں بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان کی حیثیت سے آنا چاہیئے- سعیدؒ کے اس جملے کو خلیفہ نے بھی سُن لیا- اُس وقت مدینہ کے گورنر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے- وہ بھی خلیفہ کے ہمراہ تھے- خلیفہ نے ان سے پوچھا- یہ کون ہے- عمر ابن عبدالعزیزؒ حضرت سعید ابن مسیبؒ کو اچھی طرح جانتے تھے- فرمایا یہ سعید ابن مسیبؒ ہیں- آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر نہیں ہوئے کہ شاید ان کی بینائی کمزور ہو گئی ہے- خلیفہ نے کہا کہ میں خود اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا- یہ تو بہت بڑے عالم ہیں- مؤدبانہ حاضر ہوا، سلام کیا اور آپ کی خیریت دریافت کی-

سعید ابن مسیبؒ نے کہا الحمدللہ بخیر ہوں، اور اپنی عبادت میں مشغول ہو گئے- اقتدار آیا اور گذر گیا- اور تاریخ کے صفحات پر سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کا نام آج بھی چمک رہا ہے- اور قیامت تک چمکتا رہے گا-

حضرت جنیدؒ اور ایک چور

رات کا آخری پہر تھا- جناب جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ عبادت میں مصروف تھے کہ گھر میں کچھ کھٹ پٹ کا احساس ہوا اپنے کمرے سے باہر نکل کر دوسرے کمرے میں گئے- تو دیکھا کہ ایک چور سوکھے ہوئے چمڑے کے چند ٹکڑوں کو ایک بہت بڑے گٹھڑ میں باندھ کر لے جانے کی کوشش کر رہا ہے- مگر وہ گٹھڑ اتنا بڑا ہے- کہ اس سے اٹھتا نہیں ہے جناب جنید بغدادیؒ چور کے پاس تشریف لے گئے- اور فرمایا آپ کو کیا پریشانی ہے چور یہ سمجھا کہ شاید یہ بھی میری طرح کا ایک چور ہے- اس نے کہا- یہ گٹھڑ اٹھالو اور جہاں میں

چل رہا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ چلو۔ آہٹ نہ ہو۔ کیونکہ مالک جاگ جائے گا۔۔ تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔۔ اگر یہ گٹھڑ تم میرے ٹھکانے پر پہنچا دو۔ تو اس میں سے تمہیں بھی حصّہ ملے گا۔ جُنید بغدادیؒ نے گٹھڑ اٹھالیا۔ اور چُور کے پیچھے پیچھے چل پڑے یہاں تک کہ اُس کے ٹھکانے پر گٹھڑ پہنچا دیا۔ اب چور سوچنے لگا۔ کہ اس کو تو حصّہ دینا ہو گا۔ جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ آپ پریشان نہ ہوں میں کچھ لوں گا نہیں یہ خدمت تھی جو میں نے انجام دے دی۔ چور بہت خوش ہوا کہ مفت کا ساتھی مل گیا۔ کہ بلا کسی معاوضے کے خدمت انجام دینے پر تیار ہے۔ اس نے کہا جناب کل رات کہاں ملاقات ہو گی؟ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خانقاہ کا پتہ بتا دیا۔ دوسری رات ان کی تلاش میں جب چور آیا اور اس نے جنید بغدادیؒ کو دیکھ کر پہچان لیا۔ تو اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جنیدؒ کا دامن تھاما۔ اور آنسو بہاتے ہوئے توبہ کی چند دنوں کی تربیت کے بعد حضرت جنیدؒ نے اس چُور کو خرقۂ خلافت عطا فرمایا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

امام ابو حنیفہؒ اور احترامِ مدینہ منورہ

ایک دن مدینہ میں غل مچ گیا۔ اور لوگ دیوانہ وار شہر کے باہر کسی کے استقبال کے لئے بڑھنے لگے۔ ہنگامہ دیکھ کر کسی نے پوچھا کون آرہا ہے؟ کہ تم لوگ اس طرح استقبال کے لئے بھاگے جا رہے ہو؟ لوگوں نے کہا "امامِ اعظم سیدنا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تشریف لا رہے ہیں"۔ دو دنوں تک متعدد فقہی مسائل پر مسجد نبوی میں امام صاحب سے سوالات ہوتے رہے اور اپنے جواب سے وہ لوگوں کو مطمئن فرماتے رہے۔ تیسرے دن امام نے رختِ سفر باندھا۔

بڑے بڑے علماء ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے کہ حضور ابھی سیری نہیں ہوئی ہے۔

دو چار دن اور ٹھہر جائیں۔ لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر امام صاحب ٹھہرتے چلے گئے نبوت کا قرب مسجد نبویؐ کی ہمسائیگی اور انوار کی مسلسل بارش نے امام صاحب کے قدموں کو جکڑ رکھا تھا۔ لیکن جب گیارہویں روز روانہ ہونے لگے اور علماء اور عوام نے مزید ٹھہرنے پر اصرار کیا تو امام صاحب ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ بھائیو! مدینہ چھوڑ کر جانے پر کون راضی ہو سکتا ہے مگر اب میں فطری ضرورتوں کے سبب بالکل ہی مجبور ہوں اس لئے مہربانی کر کے مجھے اجازت دے دیجئے بعض لوگوں نے عرض کیا حضور! کیا ضرورت ہے؟ جواب میں فرمایا! بھائیو! میں کہنا نہیں چاہتا تھا مگر جب آپ نے مجبور ہی کر دیا ہے تو چپکے سے آپ کو بتا دوں کہ میں ۱۱ دنوں سے یہاں مقیم ہوں ان ۱۱ دنوں میں صرف سرزمین مدینہ کے ادب کی وجہ سے میں نے رفع حاجت نہیں کیا ہے اب میں برداشت نہیں کر سکتا اس لئے مہربانی کر کے مجھے اجازت دے دیجئے۔

یہ عشق اور یہ ادب ہی تھا جس نے کوفہ کے نعمان کو امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بنا دیا۔

باب

عِلم اور عُلماء

علم کا احترام

خلیفہ مامون رشید اور مشہور محدث یحییٰ ابن اکثم میں بہت گہری دوستی تھی۔ مامون خود بھی بڑا صاحبِ علم تھا اور علماء کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس لیے باوجود چند علمی اختلافات کے علماء اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مامون کا دور علمی ترقی کے اعتبار سے اسلامی تاریخ کا سنہری دور کہا جاسکتا ہے۔

شاہی شان و شوکت تو ایک طرف لیکن جب اہلِ علم سے واسطہ پڑتا تو مامون سراپا عاجزی و انکساری بن جاتا۔ اس کی یہ ادا اس کے دور کے علماء کو بہت پسند تھی۔ اس لیے اکثر علماء اس سے ملتے جلتے تھے اور آزادانہ علمی مسائل پر اس سے گفتگو کرتے تھے۔ یحییٰ ابن اکثم رحمۃ اللہ علیہ سے تو اس کا یارانہ تھا۔

ایک رات یحییٰ ابن اکثمؒ اس کے مہمان ہوئے اور اس نے دوستانہ تعلقات کی بناء پر ان کا بستر اپنے کمرے میں لگوایا۔ رات گئے تک مامون اور یحییٰ ابن اکثم کے درمیان علمی گفتگو ہوتی رہی۔ یک بیک مامون نے یحییٰ ابن اکثم کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھے۔ مامون بہت ذہین آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ان کو کوئی حاجت ہے۔ اس نے پوچھا آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ جناب یحییٰؒ نے فرمایا: خلیفہ! مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ مامون جھٹ اٹھا کر صراحی لایا اور پیالا لاکر جناب یحییٰؒ کو پانی پلایا۔ قاضی یحییٰ ابن اکثمؒ نے کہا امیر المؤمنین! نہ آپ نے کسی خادم کو آواز دی نہ غلام کو پکارا بلکہ اتنے عظیم حکمران ہوتے ہوئے آپ نے خود میرے لیے زحمت اٹھائی کسی خادم کو پکار لیے ہوتے۔ مامون نے جواب دیا جناب! آپ تو بڑے محدث ہیں آپ کو یہ معلوم نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے۔ میں حکمران ہوں یعنی امیر المؤمنین ہوں، زبانی کہنے سے کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ میں یہ بات اپنے عمل سے ثابت نہ کردوں۔ یہ عمل میں نے اس لیے بھی کیا ہے تاکہ لوگ یہ جان لیں کہ قوت و اقتدار، دولت اور شان

وشوکت کتنی بھی ہو مگر علم آگے ہیچ ہے۔ علم چاہے فقیر کے جھونپڑے میں ہو یا بادشاہ کے محل میں ہر حالت اور ہر صورت میں قابلِ احترام ہوتا ہے۔ دولت علم کی بلندی کو پہنچنا تو درکنار اسے چھو بھی نہیں سکتی۔

علم کی عظمت

جامع مسجد دمشق میں فجر کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ کوئی ذکرِ الٰہی میں مشغول تھا تو کوئی تلاوت کلام پاک میں۔ ایک گوشے میں ایک مقدس صورت والے بزرگ تشریف فرما تھے اور ان کے گرد بوڑھوں اور جوانوں کا مجمع تھا۔ حدیث بیان کر رہے تھے اور زبان سے نکلی ہوئی ہر بات سامعین کے دلوں میں اترتی جا رہی تھی، کیونکہ ان کی یہ باتیں خالی خالی نہ تھیں بلکہ قول کے پیچھے عمل کی قوت اور نیت کا خلوص تھا۔ قول وہی جاندار ہوتا ہے جس میں اخلاص ہو اور کہنے والے کے قول وعمل میں تضاد نہ ہو۔ یہاں پر جو شخص حدیث بیان کر رہا ہے کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ آغوشِ نبوت کا تربیت یافتہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی معنوں میں تابع فرمان ہے۔

یہ جناب ابو درداؓ ہیں، جنہوں نے برسوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اختیار کی اور سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے تھے۔ ابو درداؓ کا بیان جاری تھا کہ ایک شخص نے آکر ان سے عرض کیا: "ابو درداؓ! میں شہرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم یعنی شہر مدینہ سے صرف یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ کے پاس کوئی حدیث ہے جسے آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں اور میں کسی دوسرے کام سے نہیں آیا ہوں" حضرت ابو الدرداؓ نے فرمایا: "مبارک ہو! کہ تم نے صرف دین کی طلب میں سفر کیا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص علمِ دین حاصل کرنے کے لیے سفر کرتا ہے، اللہ تعالٰی اسے جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلاتا ہے اور طالب علم کی رضا حاصل کرنے کے لیے فرشتے اپنے پر اس کے قدموں کے

نیچے بچھا دیتے ہیں۔ آسمان و زمین کی تمام چیزیں یہاں تک کہ مچھلیاں پانی کے اندر عالم دین کے لیے دعائے مغفرت کرتی ہیں۔ اجنبی! سن لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت ستاروں پر اور علماء نبیوں کے وارث اور جانشین ہیں۔ نبیوں کی میراث سونا اور چاندی، درہم و دینار نہیں ہیں ان کی وراثت صرف علم ہے۔ لہٰذا جس نے نبیوں کی وراثت یعنی علم کو اٹھا لیا سمجھ لو کہ اس نے پورا حصہ پایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا علم عطا کرتا ہے" مشکوٰۃ شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " رات میں ایک گھڑی علم دین کا پڑھنا پڑھانا رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے اور ایک عالم دین شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے"

شوقِ علم

علامہ سید شریف کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک عجیب شوق پیدا ہوا کہ وہ شرح مطالع خود اس کے مصنف کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑھیں۔ شرح مطالع کے مصنف اس وقت ہرات میں مقیم تھے اور سید شریف خراسان میں۔ اس زمانے میں سوائے پیدل سفر کرنے، یا معمولی سواری پر سوار ہو کر چلنے کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا خراسان اور ہرات کے درمیان کا بیشتر حصہ پہاڑی اور دشوار گزار راستوں پر مشتمل تھا مگر جذب و شوق کی فراوانی اور طلب و جستجو کی کشمکش سید شریف کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتی تھی سامان سفر پیٹھ پر لادا اور کشاں کشاں روانہ ہوئے۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے جب آپ خراسان پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شرح مطالع کے مصنف اس قدر ضعیف ہو چکے ہیں کہ ان کا دماغ تقریباً ماؤف ہو گیا ہے۔ اس کے

باوجود سید شریف نے ان سے ملاقات کی ان کے شوق کو دیکھ کر شرح مطالع کے مصنّف نے اس اولوالعزم طالب علم کو اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس جانے کا مشورہ دیا جو اس وقت قاہرہ میں مقیم تھے خراسان سے ہرات اور پھر ہرات سے قاہرہ ہزاروں میل کے سفر کا چکر تھا لیکن علم کے شوق نے سید شریف کو پست ہمت نہ ہونے دیا اور وہ وہاں سے پاپیادہ مصر روانہ ہو گئے اور قاہرہ میں مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرضِ مدعا کی مبارک شاہ نے ان کے ذوقِ علمی کو دیکھکر اپنی شاگردی میں قبول کر لیا۔ اس طرح خراسان کے اُفق پر جھلملاتا ہوا ایک تارہ اپنے شوق، عشق اور لگن کی بدولت اسلام کے افقِ علمی پر ایک ماہِ تمام بن کر نمودار ہوا جس کی چمک دمک کو گردشِ زمانہ اور انقلابِ روزگار کبھی بھی متاثر نہ کر سکے گا۔ آج کل کے طالب علموں میں وہ شوقِ علم اور طلب و جستجو کا وہ مادہ کہاں ہے۔

علم کی تعظیم

ہارون رشید کی مجلس میں اکثر اس دور کے علماء شریک ہوتے تھے۔ کسی طمع یا لالچ کے لیے نہیں نہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر بلکہ ان کے پیشِ نظر یہ بات ہوتی تھی کہ اگر کبھی خلیفہ شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹنے لگے تو اسے ٹوک دیں تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ اور خلقِ خدا گمراہی کے دلدل میں پھنسنے کے بجائے صحیح راستے پر قائم رہے۔ بادشاہ کا قرب شریعت میں مفاد طلبی کی غرض سے پسندیدہ نہیں ہے لیکن اگر نیت نیک ہو اور اہل علم اس خیال سے ان کے قریب رہیں کہ موقع بموقع انہیں صائب مشورہ دیتے رہیں تو چونکہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔

اس لیے ایک غیر مستحسن فعل بھی مستحسن ہے۔ ہارون رشید بھی علمی ذوق کا حامل تھا اور اگر اس کے کسی نظریہ یا عمل پر کوئی تنقید کی جاتی اور شرعی دلیل سے اس کو قائل کر دیا جاتا تو بلا کسی جھجھک کے وہ سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ اس کی اسی خوبی کی وجہ سے حضرت ابو معاذ

حذیہ جیسے جلیل القدر عالم بھی اس کی مجلسوں میں شریک ہو جایا کرتے۔ ابومعاویہ نابینا تھے۔
ایک رات ہارون رشید سے ان کی گفتگو کسی قدر طویل ہو گئی یہاں تک کہ کھانے کا وقت
ہو گیا۔ دسترخوان بچھایا گیا اور خلیفہ نے جناب ابومعاویہ کو اپنے ساتھ دسترخوان پر بٹھایا۔
چلمچی لائی گئی اور کھانے سے پہلے ابومعاویہ کا ہاتھ دھلایا گیا۔ جب کھانا ختم ہوا تو ان
کا ہاتھ دوبارہ دھلایا گیا۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا اور محل کے دروازے پر
سواری کھڑی ہو گئی تو خلیفہ ہارون رشید نے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے جناب
ابومعاویہ سے دریافت کیا حضرت! آپ کو معلوم ہے کہ آج آپ کے ہاتھ کس
نے دھلائے ہیں۔ ابومعاویہ نے فرمایا مجھے کیا خبر میں تو نابینا آدمی ہوں۔ ہارون رشید
نے کہا حضرت! آج یہ فرض میں نے انجام دیا ہے محض یہ واضح کرنے کے لیے کہ
امارت و خلافت اپنی جگہ لیکن علم کی فضیلت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں
ہے۔ اتنی بڑی حکومت کا والی ہونے کے باوجود میں خود کو آپ کے سامنے ہیچ
سمجھتا ہوں۔ میں نے آپ کی تعظیم نہیں کی بلکہ آپ کے علم کی تعظیم کی ہے۔

علم کا وقار

کوئی دوسرا عالم ہوتا تو خوشی سے پھولا نہ سماتا کیونکہ اس کے دروازے پر آنے
والا کوئی معمولی آدمی نہ تھا حاکم بخارا خالد ابن احمد کا وزیر تھا۔ وہ حاکم بخارا کا ایک خاص
پیغام لے کر امام بخاریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔
حاکم بخارا نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ امام صاحبؒ اس کے محل میں تشریف
لا کر حاکم کے دونوں بیٹوں کو حدیث و تاریخ پڑھا دیا کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ حاکم ہی تھا
مفت میں تو یہ خدمت نہ لیتا۔ گراں قدر نذرانہ دیتا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا! "حاکم سے
میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اگر اس کے لڑکے علم حاصل کرنا چاہیں تو انہیں مدرسہ بھیج دیا کریں
میں انشاء اللہ حدیث پڑھا دیا کروں گا۔ لیکن حدیث کے علم کو دولت کے دروازے

پر لے جا کر رسوا کرنے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔"

امام کا جواب سن کر وزیر گھبرا گیا کیونکہ وہ اس طرح کا جواب سننے کا عادی نہ تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس وقت تک اس کی ملاقات کسی عالم ربّانی سے ہوئی ہی نہ تھی۔ وزیر نے امامؒ کا یہ پیغام خالد ابن احمد کو پہنچا دیا۔ خالد ابن احمد امامؒ کا جواب سن کر سخت برہم ہوا۔

علم نے دولت کو ایسی ٹھیس پہنچائی تھی کہ اس کا غرور مٹی میں مل گیا تھا چند دنوں کے بعد اس نے دوبارہ وزیر کو بھیجا اور امامؒ صاحب کو پیغام دیا کہ "ٹھیک ہے میں اپنے بچوں کو آپ کے مدرسے میں بھیج دونگا۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔ وہ یہ کہ میرے بچے جس وقت آپ سے تعلیم حاصل کریں گے اس وقت عام بچے کلاس میں موجود نہیں ہوں گے۔ کیونکہ میں یہ گوارا نہیں کرتا کہ میرے بچے عام بچوں کے ساتھ مل کر بیٹھیں۔ یہ میری حیثیت اور میری شان کے خلاف ہے۔" امام بخاریؒ نے فرمایا: "علم اور خاص کر علمِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث ہے۔ میں اس علم کی تقسیم میں کوئی تخصیص پیدا کر کے خود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رسوا کرنا نہیں چاہتا۔ آپؐ کے دربار میں غلام بھی ہوتے اور آقا بھی، عام لوگ بھی ہوتے اور سردار بھی، امیر بھی ہوتے اور غریب بھی، آپؐ کا فیض سب کے لیے تھا۔ میں آپؐ کے علم کو خاص امیرِ بخارا کے لڑکوں کے لیے کیسے مخصوص کر سکتا ہوں!" یہ جواب سن کر خالد ابن احمد کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اس نے غصّے میں آ کر امام بخاریؒ کو بخارا سے شہر بدر کر دیا۔ امام بخاریؒ اپنا گھر بار چھوڑ کر بخارا سے نکل گئے اور مسافرت میں وفات پا گئے مگر دین کے علم کو رسوا نہ ہونے دیا اور اس کے وقار کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ ان کا طریقہ قیامت تک آنے والے علمائے دین کے لیے نمونۂ عمل قرار پایا۔

تعلیمِ دین

اس دن مجمع بھی زیادہ تھا اور دور دور سے قبائل کے لوگ مدینہ منورّہ آئے ہوئے تھے۔ تقریباً مسجد نبوی بھری ہوئی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے مسلمانوں کی ایک جماعت کی تعریف کی پھر فرمایا ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ پیدا نہیں کرتے نہ انہیں دین کی تعلیم دیتے ہیں نہ دین نہ جاننے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں۔ نہ بری باتوں سے روکتے ہیں نہ ان کی طرف توجہ دیتے ہیں اور ایسا کیوں ہے کہ کچھ لوگ اپنے پڑوسیوں سے دین نہیں سیکھتے نہ دین نہ جاننے کے عبرتناک نتائج معلوم کرتے ہیں۔ خدا کی قسم لوگوں پر لازم ہے کہ پڑوسیوں کو دین کی تعلیم دیں ان کے اندر دینی سمجھ پیدا کریں انہیں نصیحت کریں اچھی باتیں بتائیں اور بری باتوں سے روکیں۔ پڑوسیوں پر بھی لازم ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھیں اور ان کے وعظ و نصیحت کو قبول کریں ورنہ میں انہیں جلد سزا دوں گا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چند کلمات ارشاد فرمائے اور ممبر سے اتر آئے۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا اور کافی دیر کے بعد سامعین میں سے چند افراد اٹھے اور انہوں نے سوال کیا۔ سرکار ابھی جو آپ نے ارشاد فرمایا ہے یہ کون لوگ ہیں جن کے خلاف آپ نے یہ باتیں فرمائی ہیں۔ آپ تو خاموش رہے لیکن دوسرے لوگوں نے بتایا کہ آپ کا روئے سخن قبیلہ اشعر کی طرف تھا کیونکہ یہ لوگ دین کی سمجھ رکھتے ہیں مگر ان کے پڑوس میں چشموں پر اُجڈ گنوار لوگ رہتے ہیں۔ ان کا فرض تھا کہ ان کو دینی تعلیم دیتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ قبیلہ اشعر کے لوگوں کو جب اس تقریر کی اطلاع ملی تو وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہم سے کیا قصور سرزد ہوا کہ آپ نے ہم پر خفگی کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ نے بتایا تم لوگوں کو چاہیے کہ اپنے پڑوسیوں کو دین کی تعلیم دو۔ انہیں وعظ و نصیحت کرو۔ نیکی کا حکم دو اور بری باتوں سے روکو اور ان پڑوسیوں کا بھی فرض ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کو قبول کریں اور اپنے اندر دینی سمجھ پیدا کریں۔ قبیلہ اشعر

کے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک کیا تعلیم و تربیت بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ تو ارشاد ہوا ہاں یہ بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ تو ان حضرات نے کہا سرکار ہم کو ایک سال کی مہلت دیجئے۔ اس مہلت میں ہم اپنے پڑوسیوں کے اندر دینی سمجھ پیدا کریں گے اور انہیں احکام الہٰی سے آگاہ کریں گے۔ یہ وعدہ کر کے جب قبیلہ اشعر کے لوگ روانہ ہو رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر بشاشت کے انوار دمک رہے تھے۔

فقرِ مستغنی

اموی خلیفہ کو جب حالتِ طواف میں اطلاع دی گئی کہ امت کے نامور محدث اور فقیہ حضرت عمر بن الخطاب کے پوتے جناب سالم بن عبداللہ اس وقت حرم شریف میں موجود ہیں تو چونکہ وہ انکی بہت شہرت سن چکا تھا اس لیے اس نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ طواف سے فارغ ہو کر وہ ضرور ان سے شرفِ ملاقات حاصل کرے گا طواف کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی بے حد متاثر ہوا۔ کہنے لگا ابن عبداللہ! اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو ارشاد فرمایئے۔ حضرت سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا خلیفہ! اللہ کے گھر میں اللہ کے سوا کسی اور سے مانگنا شرم کی بات ہے۔ جواب ایسا تھا کہ خلیفہ کو خاموش ہو جانا پڑا مگر ہشام بھی نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا، حرم شریف سے باہر نکل آیا اور دروازے کے قریب بیٹھ کر حضرت سالم بن عبداللہ کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حضرت سالم حرم شریف سے باہر نکلے تو وہ دوبارہ ان سے ملا اور انتہائی عقیدت و محبت کا اظہار کرتا رہا جب وہ ان سے رخصت ہونے لگا تو پھر اس نے عرض کیا جناب! اب تو آپ حرم سے باہر تشریف لا چکے ہیں اب جو کچھ آپ کو درکار ہو مجھ سے طلب فرمائیں۔ سالم نے جواب دیا میں تم سے کیا طلب کروں ۔ آخرت کی چیز مانگوں یا دنیا کی۔ ہشام نے کہا میں تو دنیا دار

حکمران ہوں آخرت کی چیز بھلا میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں البتہ اگر آپ دنیا کی کوئی چیز طلب فرمائیں تو میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

اب عمر بن الخطاب کے پوتے جناب سالم بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ فرمایا خلیفہ! دنیا تو میں نے دنیا کے مالک حقیقی اللہ جل جلالہٗ سے بھی کبھی نہیں مانگی پھر تم سے کیا مانگوں۔ تم تو اس کے مالک بھی نہیں ہو۔ سالم بن عبداللہؒ کی آواز میں وہ بے نیازی اور استغنا تھا کہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک ان کا جواب سن کر مبہوت ہو گیا۔ فقر غیورؒ نے جابر سلطان کو شکست دے دی۔ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے اور جس کا اللہ ہے اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی سے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے آدمی کو دیتا ہے نجات

ابنِ سیرینؒ کے خلاف مقدمہ

محمد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا شمار زبردست علماء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے علم کو کبھی بھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ اپنی روزی کے لئے۔ انہوں نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا تھا۔ لیکن حلال و حرام کی تمیز کے ساتھ مجال نہیں کہ کبھی بھی تجارت میں فریب کریں۔ وہ اکثر لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ کہ لوگو حلال روزی کمایا کرو کیونکہ خدا کی طرف سے تمہارے لئے حلال روزی مقدر ہو چکی ہے۔ اگر تم نے حرام کے ذریعے اُسے حاصل کیا تو بھی اُس سے زیادہ نہیں ملے گی۔ جو تمہارے مقدر میں ہے۔ وہ مقدمے معاملے سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لئے کہ وہ ایک علمی آدمی تھے۔ اور قناعت پسند طبیعت کے مالک تھے۔ روزی حاصل ہونے کے بعد وہ بازار میں ٹکتے نہیں تھے وہ مسجد میں آکر حدیث کے درس میں مصروف ہو جاتے۔ لوگوں کو اُن کی عادتوں کا علم تھا۔ اس لئے ایک شخص نے قاضی شہر کی عدالت میں دو درہم کا جھوٹا مقدمہ دائر

کر دیا۔ تو چونکہ وہ جانتا تھا۔ کہ ابن سیرینؒ عدالت سے بہت بھاگتے ہیں۔ اس لئے وہ مجھے دو درہم دے دیں گے۔ اس لئے اس نے خود آکر ابن سیرینؒ کو بتا دیا کہ میں نے تمہارے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ اُس وقت تو ابن سیرینؒ رحمۃ اللہ علیہ خاموش رہ گئے جب قاضی نے سمن بھیجا۔ تو حضرت ابن سیرینؒ حاضر ہو گئے۔ قاضی نے دعوے کی سماعت کی شہادت سُنی۔ اور حضرت ابن سیرینؒ سے پوچھا۔ کہ آپ اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ قانون کے مطابق قاضی نے ابن سیرینؒ سے کہا آپ قسم اٹھائیں گے؟ ابن سیرینؒ قسم اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مدعی کا خیال تھا۔ کہ یہ حلف نہیں اُٹھائیں گے اور دو درہم ادا کر دیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور لوگوں کو سخت تعجب ہوا۔ کسی نے کہا۔ ابن سیرینؒ آپ دو درہم کے لئے حلف اٹھاتے ہیں؟ ابن سیرینؒ نے جواب دیا۔ میں جان بوجھ کر ایک شخص کو جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ حرام نہیں کھلا سکتا۔ مُدعی خوفِ خدا سے لرز اٹھا۔ اور اس نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔

حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ مسکراتے ہوئے عدالت سے باہر آئے۔ اور مدعی کو بلا کر دو درہم دینے لگے۔ مُدعی نے روتے ہوئے معافی مانگ لی۔ درہم لینے سے انکار کر دیا اس لئے کہ اُسے اب حقیقت کا چہرہ نظر آ چکا تھا۔

حمّاد بن مسلمؒ کی غیرت ایمانی

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد حماد ابن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کو کون نہیں جانتا۔ اتنے بڑے امام کے اُستاد ہونے کے ناطے ساری دُنیا میں مشہور ہیں۔ کونے کونے میں اُن کے علم کا ڈنکا بجتا تھا۔ اور لوگ اُنہیں اُستاد وقت کہا کرتے تھے۔ شعبہ اور مسعر جیسے عُلماء نے انہی کے متعلقہ درس میں تعلیم پائی تھی۔ حمادؒ نے علم کو ذریعہ

معاش نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اُن کا پیشہ تجارت تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مالی اعتبار سے بہت مستحکم تھے۔ کاروبار سے فرصت ملنے کے بعد اپنے مدرسے میں آکر بیٹھ جاتے اور طلبہ کو علمِ دین کی تعلیم دیتے۔ جب ان کی شہرت ہر طرف پھیل گئی تو دُور دُور سے علم کے پیاسے سفر کر کے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اُمراء اور حُکام میں بھی اُن کی بڑی عزت تھی ایک دِن ایک شخص آیا اور اس نے اُن سے درخواست کی کہ کُوفہ کے گورنر ابن زیاد کے نام ایک سفارشی چِٹھی لِکھ دیں تاکہ وہ اسے ملازمت پر رکھ لے۔

جناب حمادؒ اس کی خواہش سُن کر پریشان ہو گئے۔ کیوں کہ وہ ابن زیاد کو سخت ناپسند تھے۔ انہوں نے اس شخص سے دریافت کیا کہ اگر تمہیں ملازمت مِل جائے۔ تو اس خدمت سے تمہیں کس قدر مالی فائدہ پہنچے گا۔ اس نے کہا ہزار درہم یہ سن کر جناب حماد ابن مسلمؒ اُٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔ اور پانچ ہزار درہم لا کر اس کے حوالے کر دیئے اور فرمایا یہ لے جا اور اپنی ضرورت پوری کر آئندہ جب کبھی ضرورت پڑے تو میرے پاس آجانا میں ابن زیاد کے نام سفارشی چِٹھی دے کر اپنی آبرو ریزی نہیں کرانا چاہتا۔ جس شخص کو میں اللہ کے دین کا دشمن سمجھتا ہوں، اُسے میں مخاطب کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

باب ۸

جہاد اور شہادت

شہیدِ وفا

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آپ کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت ان کے بدن پر صرف ایک چادر تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور ایک جگہ تو اس پر چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی حالت دیکھی تو آپ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور ایک لمحے کے لیے مصعب بن عمیر کا ماضی نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ وہی مصعب بن عمیر ہے جو کم از کم دو سو درہم کا لباس پہنا کرتا تھا اور ہر وقت خوشبو میں بسا رہتا۔ مکہ کی جس گلی سے گزر جاتا دیر تک وہ گلی معطر رہتی لیکن ابتدائے اسلام میں گھر والوں سے چھپ کر مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہوتے ہی دل کی دنیا منقلب ہو گئی۔ والدین چونکہ اسلام کے سخت دشمن تھے اس لیے جب سُنا کہ کچھ لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں تو دھن دولت جائداد اور مکان سب پر لات مار کر حبشہ چلے گئے پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور نہایت تنگی اور ترشی میں زندگی گزارنے لگے۔ مگر خوش تھے کہ دولتِ دنیا ہاتھ سے چلی گئی، دولتِ ایمان تو نصیب ہو گئی۔ اس دولت سے بڑھ کر کون سی دولت ہو سکتی ہے ہر دولت کو زوال ہے مگر ایمان کی دولت ابدی دولت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ایسی محبت تھی کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ معرکۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پرچم اسلام ان کے حوالے کیا۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور کفار نے دیکھا کہ مسلمان چڑھے چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے بڑھ کر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے اس بازو کو کاٹ دیا جس میں جھنڈا تھا۔ مصعب نے دیکھا کہ علم گر جائے گا تلوار پھینک دی اور دوسرے ہاتھ سے علم کو تھام لیا۔ ایک کافر نے ان کی دوسری کلائی بھی

کاٹ دی۔ جناب مصعب نے پرچم کو دانتوں سے تھام لیا اور کٹے ہوئے بازوؤں سے اس کو سہارا دیا۔ ایک کافر نے تیر مارا اور وہ گرنے ہی والے تھے کہ ایک مسلمان آگے بڑھا اور پرچم کو سنبھال لیا۔ اب مصعب منزل پر پہنچ چکے تھے۔ دم نکل رہا تھا مگر خوش تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ پرچم زمین پر گرنے نہ دیا۔ شام کو شہدا کی لاشیں اکٹھی کی گئیں تو ان میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی بھی لاش تھی۔ ایک چادر ان کے بدن پر تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ سر چھپایا جاتا تو پیر کھل جاتے اور پیر چھپائے جاتے تو سر کھل جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سر چھپا دو اور پیروں پر گھاس ڈال دو۔ شہید وفا کا جب اس شان سے جنازہ اٹھا تو کتنی ہی آنکھیں تھیں جو بہہ رہی تھیں کہاں وہ نازونعم اور زرق برق لباس اور کہاں یہ حال کہ پورا کفن بھی میسر نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ معشوق حقیقی کو اپنے عاشق کی یہی سج دھج پسند ہے۔

بے مثل قربانی

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے یعنی وہ دس حضرات جنہیں ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی جا چکی تھی۔ ان کا ایک ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوتا جب وہ دیکھتے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے جلیل القدر صحابی اور خلیفہ راشد کبھی کبھی ان کا وہ شل ہاتھ چوم لیا کرتے ہیں۔ ایک دن کسی نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے ان کے ہاتھ کے شل ہو جانے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب زخمی ہو گئے اور آپ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے تو کافروں کے ایک دستہ نے موقع غنیمت جان کر آپ پر ہجوم کرنا شروع کیا۔ اس وقت سوائے میرے آپ کے پاس کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔ تیر تھے

مینہہ کی طرح برس رہے تھے۔ میرے پاس سپر تھی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کھڑا ہو گیا اور آنے والے تیروں کو اس سپر پر روکنے لگا۔ اتفاقاً میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سپر زمین پر گر گئی۔ یہ لمحہ نازک ترین لمحہ تھا۔ اگر میں جھک کر اٹھاتا تو ہو سکتا تھا کہ کوئی تیر جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کر دیتا۔ فیصلہ کرنے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ ہوئی۔ میں نے سپر نہیں اٹھائی اور سپر کی بجائے آنے والے تیروں کو اپنے اسی ہاتھ پر روکنا شروع کر دیا۔ ہر تیر آکر میری ہتھیلی کو زخمی کر جاتا۔ خون کا فوارہ میرے ہاتھ سے چھوٹ رہا تھا مگر میں آنے والے تیروں کو ہتھیلی پر لیتا رہا یہاں تک کہ دوسرے صحابہ کرام آ گئے اور انہوں نے محاذ سنبھال لیا۔ اب جو میں نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا تو وہ بالکل گوشت کے ایک لوتھڑے کے مانند تھی۔ اکثر رگیں کٹ چکی تھیں میں نے پروا نہ کی اور آج وہ ہاتھ شل ہو چکا ہے۔ اب لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ کیوں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ جیسے عظیم المرتبت صحابی حضرت طلحہؓ کے اس شل ہاتھ کو کبھی کبھی چوم لیا کرتے تھے۔ ہاتھ شل کرایا، ہتھیلی زخمی کرائی۔ مگر آفرین ہے عشرہ مبشرہ کے ایک فرد سیدنا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ پر کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی نہ ہونے دیا۔ یہی وہ بابرکت ہستیاں تھیں جنہوں نے اپنا خون دے کر جنت خریدی تھی۔

جہاد فی سبیل اللہ

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ تمام اعمال میں سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔ ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک! اگر میں اللہ کے راستے میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں اگر

تو اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے اور جنگ سے تیرا مقصود صرف اللہ تعالےٰ کی رضا ہو صبر کے ساتھ فریضہ جہاد انجام دینے والا ہو میدان جہاد چھوڑ کر بھاگنے والا نہ ہو تو بیشک تیرے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ سائل کو آپ کی یہ بات اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ اس نے عرض کیا حضور! آپ اس بات کو دوبارہ ارشاد فرمائیں آپ نے ارشاد فرمایا ہاں بیشک اگر تو اللہ کے راستے میں شہادت پائے اس حالت میں کہ تو صبر کرنے والا ہو اور محض اللہ کی رضا تلاش کرنے والا آگے بڑھنے والا ہو اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے والا نہ ہو تو سوائے قرض کے تیرے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے، یہ بات مجھ سے جبرئیل نے بتائی ہے۔ مسلم شریف میں ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ احد کا معرکہ گرم تھا کفر اسلام سے اور اسلام کفر سے ٹکرا رہا تھا کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک! اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو کہاں جاؤں گا؟ ارشاد ہوا جنت میں۔ جس وقت اس نے یہ سوال کیا تھا اس وقت وہ کھجوریں کھا رہا تھا اور چند کھجوریں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جواب سننے کے بعد اس پر ایسا جذبہ طاری ہوا کہ تمام کھجوریں پھینک دیں تلوار اٹھائی اور لشکر کفار میں گھس گئے۔ کشتوں کے پشتے لگا دیئے یہاں تک کہ مقام شہادت پر فائز ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک پر یہی وہ غیر متزلزل ایمان تھا جس نے عرب کی غیر منظم اور منتشر بھیڑ کو ایسی قوت بخش دی تھی کہ پہاڑ انکے آگے سرنگوں اور سمندر پایاب ہو گئے۔ ان کا وجود خرمن باطل کے لئے برق سوزاں اور ان کے قدم زمین کو دہلا دینے والے تھے۔ وہ ابر رحمت بن کر خدا کی مظلوم بستیوں پر برسے اور جدھر سے گزرے لوگوں کو مالا مال کرتے چلے گئے۔ کان لگا کر سنو تو آج بھی صحراؤں اور وادیوں میں ان کی اذانیں گونج رہی ہیں اور چشم فلک دوبارہ ان عربی شہسواروں کا جلوہ دیکھنے کی منتظر ہے۔

میں بازی جیت گیا

اسلام کی تاریخ میں بیر معونہ کا واقعہ اس اعتبار سے بہت ہی دردناک ہے کہ کفار نے خود کو مسلمان ظاہر کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہم قرآن سیکھنا چاہتے ہیں چند قاریوں کو ہمارے علاقے میں بھیج دیجئے اور پھر انہوں نے غریب الوطنی میں لیجا کر دھوکے سے انہیں شہید کر دیا۔ جبار سلمی انہیں میں کا ایک شخص تھا۔ اس کا بیان ہے کہ میں اس وقت حیران ہو گیا جب تاک کر نیزہ میں نے ایک قاری کو مارا اور وہ سینے کے آر پار ہو گیا خون کا فوارہ قاری کے سینے سے ابل پڑا۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گرتے وقت اس نے ایک ایسا جملہ کہا کہ میں مبہوت ہو گیا۔ وہ نہ چیخا نہ چلایا نہ رویا دھویا نیزہ کھانے کے بعد مسکراتے ہوئے صرف اتنا کہا "خدا کی قسم میں تو بازی جیت گیا" مرنے والا تو مر گیا لیکن میں سوچنے لگا کہ قتل ہونے کے بعد تو آدمی بازی ہار جاتا ہے یہ کیسا آدمی ہے کہ مر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں جیت گیا۔ شہید کے اس ایک جملے نے میرے جسم پر لرزہ طاری کر دیا میں نے اپنے ایک دوست سے اس واقعے کا تذکرہ کیا۔ اس نے کہا تم جانتے نہیں ہو یہ مسلمان ہیں یہ وہ قوم ہے جو موت سے اس طرح کھیلتی ہے جس طرح بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ راہ خدا میں شہادت کو یہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتے ہیں یہ ایک نیا فکر اور نئی سوچ تھی۔ کیوں کہ میں آج تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ میدان جنگ میں مرنا ناکامی اور دشمن پر غالب آجانا کامیابی ہے۔ میرے احساسات کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔ نہ مجھے کھانا اچھا لگتا تھا نہ پینا۔ نہ نیند آتی نہ چین وسکون۔ جوں جوں غور کرتا شہید کے الفاظ کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا "خدا کی قسم میں تو بازی جیت گیا"۔ آخر یہ بازی کون سی ہے جو جان دے کر جیتی جاتی ہے۔ موت کے بعد تو کارخانہ حیات درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سانس ٹوٹتے ہی سارے رشتے ٹوٹ

جاتے ہیں۔ لیکن یہ مرنے والا کہہ گیا" کہ خدا کی قسم میں تو بازی جیت گیا"جبار سلمی کا بیان ہے کہ شہید کا یہ جملہ مجھے کشاں کشاں دربار نبوت میں لے آیا۔ ایک مجرم کی طرح آقا کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ دست مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کیا" کہ مجھے بھی کلمہ پڑھا کر وہ سبق سکھا دیں کہ میں بھی جان دے کر یہ سمجھنے لگوں کہ میں تو بازی جیت گیا۔" آپ کی نگاہ فیض اثر نے میرے قلب و نظر کو اس طرح مسحور کیا کہ چند ہی دنوں کے بعد میں بھی یہ سمجھنے لگا کہ صحیح معنوں میں بازی وہی جیتا ہے جو راہ خدا میں پہلے جان ہارتا ہے۔

انعامِ ربّانی

ایک سوال تھا جو اکثر حضرات ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نوجوان صحابہ کرام سے پوچھا کرتے مگر لوگ حیران رہ جاتے اور کسی کی سمجھ میں جواب نہیں آتا یہ کوئی پہیلی نہیں تھی بلکہ ایک حقیقت تھی۔ قدرت خداوندی اور رحمت الٰہی کا ایک معجزہ۔ کہ نوازنے والا جسے چاہے نواز دے۔ پل بھر میں قسمت بدل کر رکھ دے اور معمولی سی بات پر عمر بھر کی عبادت کو ضائع فرما دے۔ ایک دن ایک نوجوان صحابی نے حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کر ہی لیا حضرت! آپ ایک مرتبہ اپنا سوال دہرائیں پھر خود ہی اس کے جواب سے ہمیں آگاہ فرمائیں ہم نے تو بار ہا اپنا ذہن دوڑایا مگر آپ کے سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آتا جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "سوال بہت معمولی اور مختصر سا ہے لو اس لو۔ سوال یہ ہے کہ" وہ کون شخص ہے جو جنت میں پہنچ گیا اور ساری زندگی میں ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھی؟ حسب سابق نوجوان صحابہ حیران رہ گئے کیوں کہ نماز تو فرض عین ہے اور بالغ ہونے کے بعد کسی بھی حالت میں معاف نہیں۔ تندرست ہو تو وضو کر کے نماز پڑھو۔ مجبوری ہو تو تیمم کر لو اور نماز ادا کرو۔ کھڑے ہو کر پڑھ سکتے ہو تو کھڑے ہو کر پڑھو اگر عذر

شدید ہے اور کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر ہی سہی نماز پڑھو بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو رکوع سجدہ نہیں کر سکتے تو اشاروں سے ارکان نماز ادا کر لو۔ جو بھی کرو لیکن نماز کسی حالت میں معاف نہیں۔ اور آپ فرما رہے ہیں کہ ایک شخص نے ساری زندگی میں ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھی اور وہ جنت میں پہنچ گیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ نے فرمایا ہاں! ہاں وہ عمرو بن ثابتؓ تھے اصیرم کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے تمام اہل قبیلہ مسلمان ہو چکے تھے مگر وہ ساری زندگی اسلام سے منحرف ہی رہے۔ عین احد کی لڑائی کے دن اسلام دل میں اتر آیا اور جوش و جذبے میں بھرے تلوار سنبھالی اور میدان احد میں چلے آئے خوب قتال کیا یہاں تک کہ زخمی ہو کر گر پڑے جب لوگوں نے دیکھا کہ اصیرم ہیں اور جان لبوں پر ہے تو پوچھا "اصیرم! تم یہاں اسلام کی حمایت میں لڑنے آئے تھے یا خاندانی عصبیت کے تحت جنگ پر آمادہ ہوئے تھے۔ فرمایا لوگو! میں اسلام کی حمایت میں آیا تھا یک بیک ایمان کا نور میرے دل میں داخل ہوا اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر میں نے اسلام کی حمایت میں کفار سے جنگ کی ہے۔ یہ کلام ختم ہوا۔ کلمہ پڑھا اور جان جانِ آفریں کو سپرد کر دی جناب ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ وہ جنتی قرار پائے حالانکہ انہوں نے ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھی۔

شوقِ شہادت

جب بیر معونہ کے وفد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہمارے یہاں اکثر لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور وہ دین قرآن کی تعلیم سے محروم ہیں آپ مہربانی فرمائیں۔ صحابہ کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمارے علاقہ میں قرآن کی تعلیم کے لیے بھیج دیں تو آپؐ نے ان کی درخواست کو رد کرنا گوارہ نہ فرمایا اور سترؓ، صحابہؓ کرام

جن میں سے اکثر یا تو پورے قرآن کے حافظ تھے یا قرآن کے اکثر حصے انہیں یاد تھے محض تبلیغ دین کی خاطر بیر معونہ روانہ کرنے کا فیصلہ فرمایا منذر بن عمر رضی اللہ عنہ کو داعیان حق کے اس قافلے کا سردار بنایا اور انہیں بیر معونہ کی طرف روانہ کر دیا بیر معونہ والے بہت بڑے غدار و مکار تھے انہوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے سازش کا یہ جال بچھایا تھا جس سے یہ ستر، صحابہ کرامؓ بے خبر تھے۔ ان کے سامنے ایک عظیم مقصد تھا قرآن کی تعلیم دینا اور گم کردہ راہ انسانیت تک اللہ کا پیغام پہنچانا۔ منزلوں پر منزلیں قطع کرتا حق کے داعیوں کا یہ قافلہ جب بیر معونہ پہنچا تو نہایت مشاق تیر اندازوں نے تیروں سے ان کا استقبال کیا۔

ادھر ایک پورا قبیلہ تھا اور ادھر بے خبر نہتے مبلغین اسلام جلد ہی میدان میں لاشیں ہی لاشیں بکھر گئیں۔ قافلے کا ہر فرد سوائے سردار قافلہ منذر ابن عمرو کے جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ موت کا بھیانک سناٹا فضائے بسیط پر چھایا ہوا تھا شہیدوں کے خون کو دیکھ کر شاید آج سورج بھی زیادہ سُرخ ہو رہا تھا۔ یہ وہ شہیدان وفا تھے جو صرف اور صرف اللہ کا پیغام پہنچانے اور قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے محض اللہ کی رضا کی خاطر گھر سے نکلے تھے اور سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ ان بے گور و کفن لاشوں کے درمیان غمزدہ منذر بن عمرو کھڑا تھا کہ قبیلے کی طرف سے آواز آئی سردار اگر تم ہم سے زندگی کی بھیک مانگو تو ہم تمہیں زندہ چھوڑ سکتے ہیں۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو تمہارے دوسرے ساتھیوں کا ہوا۔ جان کس کو پیاری نہیں ہوتی کوئی دوسرا ہوتا تو ستر، لاشوں کے درمیان جب کہ موت اس کے سامنے کھڑی تھی زندگی کی پیشکش پا کر ان ظالموں سے زندگی کی بھیک مانگ لیتا۔ لیکن حضرت منذر ابن عمرو انصاریؓ کا اس پیشکش کو سن کر چہرہ تمتما اٹھا فرمایا ظالمو! میں تم سے زندگی نہیں موت طلب کرتا ہوں۔ جو ایک مومن کی زندگی کی سب سے حسین آرزو ہوتی ہے۔

راضی برضا

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ روایتی علم زیادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے انوار سے ان کے قلب کو اس طرح روشن کر دیا تھا کہ ان کے دور کے عرب و عجم کے بڑے بڑے علماء ان کی جوتیاں اٹھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اور مشرق و مغرب میں آج بھی لاکھوں علماء ان کے سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ فیض کا دریا بہہ رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک بہتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیدار دل اور حکیمانہ نظر عطا فرمائی تھی۔ وہ ایک لمحے میں حقیقت تک پہنچ جاتے تھے۔ برصغیر سے ہجرت کرنے کے بعد مکہ معظمہ میں انہوں نے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ ان کی مجلس مجلس عرفان سمجھی جاتی تھی۔ ایک دن ان کی خدمت میں ان کا ایک خادم حاضر ہوا۔ بہت کمزور زار و نزار اور آکر مصافحہ کرنے کے بعد آپ کے قریب بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور خیریت سے دریافت کی وہ بہت رنجیدہ اور غمگین تھا۔

بہت سے علماء اس وقت مجلس میں موجود تھے۔ خادم نے اس بات پر حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بہت افسوس کا اظہار کیا کہ اس مرتبہ بیماری کی وجہ سے حرم شریف میں حاضر ہونا نصیب نہ ہوا۔ ناچار میں نے اپنی قیام گاہ ہی میں نماز ادا کی یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ حاجی صاحب رحمۃ اللہ ان علماء کی طرف متوجہ ہوئے جو طریقت میں بلند مقام پر فائز تھے اور فرمایا یہ بیچارا عارف نہیں ہے یعنی اس کو ابھی تک صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوئی ہے ورنہ اس بات پر کبھی افسوس نہ کرتا کہ مرض کی وجہ سے حرم شریف میں حاضر ہو کر نماز پڑھنے کا موقع نصیب نہ ہوا۔ کیوں کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے قرب کا حصول ہے اس کے لیئے جس طرح حرم کی نماز ایک طریقہ ہے اس طرح مرض بھی ایک طریقہ ہے۔ بندے کو یہ حق بھلا کہاں حاصل ہو سکتا ہے کہ خود

اپنے لئے کوئی طریقہ معیّن کرے یہ تو رب کے اختیار میں ہے کہ وہ کس طرح بندے کو اپنے قریب کرنا چاہتا ہے طبیب کی تجویز مریض کی تجویز سے ہزار درجہ بہتر ہے

خودداری

اگرچہ بنوامیہ اور بنو عباسیہ نے لاکھوں جتن کیے تھے کہ اس اثر و اقتدار اور دلوں پر حکمرانی کا خاتمہ کر دیں جو آل فاطمہ کو مسلمانوں پر حاصل تھی لیکن ان کی ہر آرزو نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اور آل فاطمہ عام مسلمانوں کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق اور ذاتی زہد و تقویٰ کے سبب عوام کی بے پناہ عزت و عقیدت کے مالک تھے۔ ان کی مقبولیت کو دیکھ کر جو سمجھدار قسم کے خلفاء تھے وہ کوشش کرتے تھے کہ کسی طرح ان کی ہمدردی حاصل کر کے عوام پر یہ جتلائیں گے کہ وہ آلِ فاطمہ کے دشمن نہیں بلکہ محسن ہیں۔ خلیفہ منصور عباسی اسی ذہن کا آدمی تھا اس نے ایک دن امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کو اپنے دربار میں طلب کیا امام جعفر صادقؓ دربار خلافت سے دور ہی رہتے تھے وہ اپنے نانا کی میراث علم دین اور روحانیت کے مسند نشین تھے اور دین کے علم میں انہیں ایسی مہارت حاصل تھی کہ امام ابو حنیفہؒ جیسے امام بھی اس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ انہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی شاگردی حاصل ہوئی ہے۔ روحانیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے سینے سے انوار کے چشمے پھوٹتے تھے اور اس دور کے صوفیاء طویل سفر طے کر کے خدمت میں حاضر ہوتے اور فیض یاب ہوتے تھے۔

اگرچہ دربار میں جانا طبیعت کو سخت ناگوار تھا تاہم اس خیال سے کہ منصور حاکم وقت ہے امام تشریف لے گئے خلیفہ نے بڑی آؤ بھگت کی۔ تخت سے اٹھ کھڑا ہوا اور محل کے دروازے پر آ کر آپ کا استقبال کیا پھر آپ کو اپنے ساتھ لے جا کر تخت پر بٹھایا، چند مسائل دریافت کیے اور نہایت عزت و احترام سے

آپ کو رخصت کیا رخصتی کے وقت اس نے ادب سے عرض کیا "امام اگر آپ کسی خواہش کا اظہار فرمائیں تو اس کی تعمیل میں مجھے بڑی خوشی حاصل ہو گی"۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے دوبارہ اپنے دربار میں طلب نہ فرمائیں یہ جواب سُن کر منصور اور اہل دربار پر سناٹا چھا گیا اور امام جا چکے تھے

جذبہ جہاد

سنہ ۷۱۱ عیسوی میں طارق بن زیاد کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر موسیٰ بن نصیر نے اُسے اسپین پر لشکر کشی کے لئے منتخب کیا اور صرف سات ہزار کا لشکر دے کر اسے روانہ کیا یہ سات ہزار کا لشکر چار بادبانی کشتیوں پر سوار ہو کر آبنائے طارق کو عبور کر گیا۔ نوجوان سپہ سالار جب سپین کے ساحل پر اترا تو اس نے جو پہلا حکم دیا وہ یہ تھا کہ تمام کشتیوں کو جلا دو لشکر کے تجربہ کار سردار یہ حکم سُن کر گھبرا گئے کیوں کہ جنگ کے دو رُخ ہوتے ہیں کبھی لشکر کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام سرداروں نے جن میں زیادہ تر بوڑھے اور تجربہ کار سردار تھے طارق سے احتجاج کیا اور کہا کہ تیرا فیصلہ غیر دانش مندانہ ہے فرض کرو ہم ہار گئے اور ہمیں واپس جانا پڑا تو کشتیوں کے جل جانے کی صورت میں ہم کس طرح واپس جائیں گے۔ آگے دشمن کا ملک ہے پیچھے سمندر اور ہم اپنے وطن سے ہزاروں میل کے فاصلے پر اس وقت ہیں۔ نوجوان طارق تجربہ کار اور جہاندیدہ سرداروں کی یہ بات سُن کر ہنستا اپنا ہاتھ تلوار پر مارا اور کہا معزز سردارو! ہم یہاں اس لئے نہیں آئے کہ بھاگ کر وطن کو لوٹ جائیں ہمارے آنے کے صرف دو ہی مقاصد ہیں اول اسپین کی فتح تاکہ خدا کی زمین عدل و انصاف سے بھر جائے اور انسانیت کے وہ مظلوم طبقے جو صدیوں سے ظلم و استحصال کے نشانہ بنے ہوئے ہیں نجات پا جائیں۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہمیں کفار کے ہاتھوں شکست ہو جائے تو اس سرزمین پر ہم اپنے خون کے

قطرے ٹپکا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ معزز سردار وا پا در کھو کر ہمارا وطن اب یہی سرزمین ہے اس لئے کہ یہ ملک ہمارے خدا کا ملک ہے اور ہم اس کے بندے ہیں اس کے احکام کو اس کی زمین پر نافذ کرنا ہمارا فرض منصبی ہے اور ہمیں بہر صورت اپنے اس فرض کو ادا کرنا ہے لہذا واپس جانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے سرداروں نے دیکھا کہ کشتیاں جل رہی ہیں۔ طارق کی اس تقریر نے تذبذب کی حالت کو استقامت میں بدل دیا۔ فوج کے حوصلے بلند ہو گئے اور کامیابی کے ساتھ آگے ہی بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ سات ہزار کی اس فوج نے اسپین میں ایک ایسی حکومت کی بنیاد رکھی جس کی عظمت کا پھریرا ۸ سو برس تک لہراتا رہا۔ جہاد اسلام کی تقدیر ہے اور اس نے ماضی میں مسلمانوں کو عزت و سربلندی عطا کی تھی۔ جب سے یہ جذبہ کمزور پڑ گیا شوکت اسلام بھی مضمحل ہو گئی۔

جذبۂ شہادت

ان کا دم لبوں پر تھا اور کچھ ہی دیر میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف سفر کرنے والے تھے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ حاضرین نے سمجھا کہ شاید یہ آنسو موت کے خیال سے بہہ رہے ہیں موت ہے بھی عزیزوں سے جدا کرنے والی زندگی بھر کے رشتوں کو توڑ دینے والی موت کا بھیانک چہرہ دیکھ کر بڑے بڑوں کا پتّا پانی ہو جاتا ہے کسی نے کہہ بھی دیا کہ حضرت شاید موت کے خیال سے رو رہے ہیں فرمایا کہ نہیں بلکہ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ جس آرزو کو میں نے اپنے سینے میں مدتوں پالا پہاڑ اور دریا نہیں دیکھے اور بڑے بڑے لشکروں کی پرواہ نہ کی وہ آرزو پوری نہ ہو سکی میرے جسم پر بالشت بھر بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں تلوار یا تیر کا زخم نہ لگا ہو میں نے کبھی بھی میدان جہاد سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے میرے اعزہ و اقارب نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ خانہ بربادی اور غریب الوطنی کی بیشمار مصیبتیں میں نے صرف اسلام کی

بلندی کی خاطر خندہ پیشانی سے جھیلیں خطرناک سے خطرناک موقعوں پر میرے پائے ثبات میں لرزش نہ آئی یہ آرزو مدت سے میرے گوشۂ قلب میں پرورش پارہی تھی کہ میں میدان کارزار میں اللہ کا نام بلند کرتے ہوئے جام شہادت نوش کروں تاکہ حشر کے میدان میں سرخرو ہو کر اپنے مولا کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل بن سکوں مگر افسوس کہ میری حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور میں آج بستر علالت پر پڑا دم توڑ رہا ہوں شہادت کی لذت کا احساس ہر آدمی کو نہیں ہوتا یہ ان سے پوچھو جو میدان جہاد میں سرتن کی بازی کھیلتے ہیں اور اپنے عظیم مقصد کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ اپنے مالک کے حضور پیش کرتے ہیں۔ سوال کرنے والے! یہ آنسو موت کے خوف اور عزیزوں سے جدائی کے آنسو نہیں ہیں یہ شکست آرزو کے آنسو ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ جملے ادا فرمائے اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں موندلیں۔

اُمِّ عمارہؓ کی جاں نثاری

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معمولی سی غلطی کے باعث غزوہ احد کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور حضرات صحابہ کی بہت بڑی جماعت شہید ہوگئی۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی زخمی ہوئے اور آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اُحد پہاڑ کی ایک چٹان پر آپ زخمی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کفار کی نگاہ آپ پر پڑی تو انہوں نے جتھہ بنا کر آپ پر حملہ شروع کیا تیر برسنے لگے اور جاں نثار تیروں کو کبھی سپر پر اور کبھی اپنے سینوں پر روکنے لگے سینوں سے خون کے فوارے چھوٹتے مگر زبان پر اف بھی نہ تھی کہ آج وہ اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ انجام دے رہے تھے ہر شخص مضطرب تھا کہ کہیں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے ورنہ حشر کے دن خدا کو کیا منہ دکھائے گا عام مسلمان جنگ میں مصروف تھے صرف چند جان نثار آپ کے قریب تھے ان میں ایک خاتون ام عمارہؓ بھی تھی۔ رسولؐ پر جان دینے کے لئے تیار اور سربکف

عین اسی حالت میں کفار کی فوج کا ایک دستہ ابن قمیہ کی سرکردگی میں حملہ آور ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا۔ ابن قمیہ نے آپ پر تلوار کا وار کیا یہ بات بھلا ام عمارہؓ کیسے برداشت کر سکتی تھیں ڈھال لے کر آگے بڑھیں اور اس کا وار روک لیا ابن قمیہ حیران تھا کہ ایک عورت ہو کر اتنی دلیر اور جری کہ فوج کے ایک مکمل دستے سے تن تنہا لڑنے کے لئے تیار ہے۔ مگر ابن قمیہ کو اس کا اندازہ نہ تھا کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قسم کی آگ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے دلوں میں لگا رکھی ہے۔ اُم عمارہ رضی اللہ عنہا جذبہ عشق سے سرشار ایک پورے دستے سے نبرد آزما تھیں کہ دیگر صحابہ آن پہنچے حضرت ام عمارہؓ نے ابن قمیہ پر تلوار کا بھرپور وار کیا مگر وہ دوہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لئے بچ گیا ورنہ دو ٹکڑے ہو جاتا پلٹتے ہوئے ابن قمیہ نے وار کیا اور ام عمارہؓ کی پشت مبارک لہولہان ہو گئی شہداء اُحد کے خون کے ساتھ ایک مسلمان عورت کا خون بھی شامل ہو گیا۔ ام عمارہؓ سخت زخمی تھیں مگر خوش تھیں کہ انہوں نے اپنا فرض بکمال احسن و خوبی ادا کر دیا ہے

قوتِ ایمانی

طارق ابن زیاد کے ہاتھوں پے در پے شکستوں کے بعد عیسائی سپہ سالار نے شاہ اسپین کو خط لکھا کہ میں نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اب اگر آپ اپنے اقتدار کی بقا چاہتے ہیں، تو بنفس نفیس آپ میدان میں اتریں ورنہ مسلمانوں کی یلغار کا ہم ہرگز ہرگز مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ شاہ اسپین راڈرک نے ایک لاکھ کا لشکر جرار تیار کیا۔ اس کے مقابلے میں طارق ابن زیاد کے پاس صرف بارہ ہزار آدمی تھے۔ رمضان المبارک کا پاک مہینہ ختم ہونے میں ابھی دو دن باقی تھے کہ طارق اپنی فوج لیکر مقابلے پر آ گیا۔ طارق کے چہرے پر عزم و اعتماد کا نور جھلملا رہا تھا۔ اور وہی اعتماد اس کے سپاہیوں کے چہروں سے بھی جھلک رہا تھا بارہ ہزار کی

فوج ایک لاکھ کے ٹڈی دل کے ساتھ صف آرا تھی مگر ایمان کی قوت ان کے دلوں میں کسی قسم کی کمزوری آنے نہیں دے رہی تھی۔ مسلمان جانتے تھے کہ موت برحق ہے جو وقت مقررہ ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔

مقررہ وقت سے پہلے موت آ نہیں سکتی ان کا ایمان تھا کہ سب سے زیادہ عزت کی موت شہادت کی موت ہے۔ جو موت ہونے کے باوجود حیات ابدی کا پیغام ہے۔ اس لئے جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ شاہ راڈرک کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے کہ یہ انسان نہیں بلکہ دیو یا فرشتے ہیں۔ پانچ شوال ۹۲ ہجری کا دن اسلام کی تاریخ میں ناقابل فراموش دن ہے کہ اس دن بارہ ہزار کے قلیل لشکر نے ایک لاکھ کی کثیر فوج کو ایسی شکست فاش دی کہ شاہ اسپین کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ جب اطمینان کی فضا قائم ہوئی تو دیکھنے والوں نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا کہ اس کا گھوڑا اور جوتے دریا کے کنارے پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ شرم کے مارے دریا میں ڈوب مرا تھا۔ اور موجوں نے اس کی لاش کو دور لے جا کر اسے انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ میدان جنگ میں سپاہی نہیں لڑتے ایمان و یقین لڑتا ہے۔

عظیم قربانی

بنوامیہ کے خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ خلافت میں اہل مکہ نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور عبدالملک ابن مروان کو خلیفہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ اس نے خلافت مسلمانوں کے مشورے سے حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس لئے خلیفہ بن بیٹھا تھا کہ اس کے باپ نے اس کو اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا اسی رسم کے خلاف سیدنا امام حسینؓ رضی اللہ عنہ نے احتجاج کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں معرکہ کربلا بپا ہوا۔ اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بہتر ساتھیوں کے ساتھ

جام شہادت نوش کیا۔

عبداللہ ابن زبیرؓ اسی سنت کو تازہ کر رہے تھے عبدالملک ابن مروان نے ایک لشکرِ جرار دے کر حجاج ابن یوسف کو مکہ مکرمہ روانہ کیا۔ حجاج ابن یوسف نے مکہ معظمہ کا محاصرہ کیا اور انتہائی بے دردی سے حرم کی حرمت کو پامال کیا مگر حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ ڈٹے رہے محاصرہ سخت ہونے کی وجہ سے اہل مکہ بھوکوں مرنے لگے اور اکثر کی ہمت ٹوٹ گئی جناب عبداللہ ابن زبیرؓ نے جب یہ دیکھا تو تنہا میدان کارزار میں اترنے کا ارادہ کیا کہ میدان میں جانے سے قبل اپنی والدہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے آخری ملاقات کرنے کے لئے تشریف لائے۔ حضرت اسماءؓ کی عمر اس وقت سو سال سے زیادہ ہو چکی تھی آنکھیں بینائی سے محروم تھیں عبداللہ ابن زبیرؓ نے اپنی والدہ سے عرض کیا ماں! اکثر لوگ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں جو باقی ہیں وہ نڈھال ہیں۔ دشمن کی طرف سے عزت افزائی سرخروئی اور حکومت و ثروت کی پیش کش ہو رہی ہے۔ اب آپ جو حکم دیں۔ یہ ماں کوئی معمولی ماں نہ تھیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں فرمایا! بیٹا تم مجھ سے بہتر جانتے ہو جو لوگ حق پر ہوتے ہیں ان کا بہت کم ساتھ دیا جاتا ہے۔ جب تم خود حق پر ہو اور لوگوں کو حق کی طرف بلاتے ہو تو ان کے ساتھ چھوڑنے کا تمہیں کوئی رنج نہیں ہونا چاہیئے جاؤ ورنہ کرو اللہ کے لئے آگے بڑھو اور اللہ کی راہ میں اصولوں کی خاطر اپنا سر کٹا کر اللہ کو راضی کرو۔ یہ موقع روز روز نہیں ملا کرتا۔ تمہارے خون سے اسلام کے درخت کی آبیاری ہوگی۔ بیٹے نے مقدس ماں کے ہر ہر حرف پر پورا عمل کیا اس طرح اسلام کی تاریخ میں ایک درخشندہ باب کا اضافہ ہوا۔

شہید وفا

اسلام قبول کرنے کے بعد عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایسا لگا جیسے کہ ان کے سارے

بدن میں خون کے ساتھ حرارت ایمانی موجزن ہوگئی۔ ان کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اہل وطن بھی اس نور و حرارت سے مستفید ہوں۔ جلدی جلدی طائف پہنچے اور لوگوں کو دعوت اسلام دینے لگے۔ وہی طائف جہاں اس ابر رحمت پر پتھروں کی بارش کی گئی تھی جو سارے عالم پر ایسا جھوم جھوم کر برسا کہ دلوں کی سوکھی کھیتیاں ہری کر گیا۔ بھلا وہ ظالم عروہؓ کو کیسے معاف کرتے انہوں نے جناب عروہؓ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا حضرت عروہؓ کو اس منصوبے کی اطلاع بھی ملی مگر عاشق انجام کو نہیں سوچتا اس کا کام تو پروانے کی طرح شمع پر نثار ہونا ہوتا ہے نثار ہوگیا تو سمجھو کہ بازی جیت گیا۔ فجر کا وقت تھا ابھی پو پھٹے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ عروہؓ ایک پہاڑی پر چڑھ کر اذان دینے لگے۔ بندہ مومن جب اذان دینے لگتا ہے تو شبستان وجود لرزنے لگتا ہے بنو مالک کے ایک کافر نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ جناب عروہؓ کے سینے میں پیوست ہوگیا عروہؓ خون میں نہا گئے اور گر پڑے۔ اہل قبیلہ کو اطلاع ہوئی تو اگرچہ وہ مسلمان نہ تھے مگر خاندانی عصبیت کی بنیاد پر سینکڑوں ہتھیار سجا سجا کر آ گئے اور قسمیں کھانے لگے کہ عروہؓ کے خون کے بدلے جب تک بنو مالک کے دس سرداروں کو قتل نہ کریں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ شہید وفا حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دم لبوں پر تھا یہ کیفیت دیکھ کر تڑپ اٹھے طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ عروہؓ نے اپنے اہل قبیلہ سے کہا کہ "لوگو! میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے جنگ وجدل برپا ہو میں نے تو تبلیغ اسلام باہمی اصلاح کے لئے کی تھی گواہ رہنا کہ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ کہ مومن امن کا پیام بر اور عفو و درگزر کی صفات کا حامل ہوتا ہے۔ بنو مالک کو عروہؓ کی اس وصیت کا علم ہوا تو سر جھکے ہوئے تھے ندامت اور پشیمانی سے کہ انہوں نے اپنی بدبختی سے کتنا قیمتی ہیرا گنوا دیا۔

دو انصاری بچوں کا جذبۂ جہاد

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجاہدین کی صف میں کھڑے ہونے کے بعد جب میں نے دائیں بائیں جانب نظر کی تو کسی قدر مایوس ہوا کہ میری دونوں جانب انصار کے دو کم عمر بچے کھڑے تھے میں سوچنے لگا کہ ان بچوں سے کیا بنے گا؟ تگڑے جوان ہوتے تو وہ اس معرکے میں میرے کام آتے یہ بچے میرے کس کام کے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ فرماتے ہیں کہ ابھی میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ جنگ شروع ہوگئی۔ پہلی اور آخری فیصلہ کن جنگ۔ جسے تاریخ میں غزوہ بدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسی جنگ جس میں نہتے لوگوں کا قریش کے سورماؤں سے مقابلہ تھا۔ ایک طرف بے سروسامانی دوسری طرف تمام مادی ذرائع و وسائل۔ ایک طرف تین سو تیرہ فاقہ کش و گلیم پوش لوگ اور دوسری طرف ایسے ایسے صاحب ثروت کہ ان کا ایک ایک آدمی ایک ہزار کے لشکر کا تنہا میزبان بن سکتا تھا۔ ایک جماعت کو اپنی تعداد وہ سامان رسد اسلحہ اور آزمودہ کاری پر ناز تھا۔ ہر فرد طاقت کے نشے میں چور اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا اور دوسری جماعت کا سارا سرمایہ اور سارا اثاثہ صرف ایمان و یقین تھا۔ سیدنا علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کے پاؤں دہکتے ہوئے ریگستان میں چلتے وقت جلنے لگے کہ پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو جواب ملا علی! جوتے نہیں تو کیا ہوا؟ پاؤں میں چیتھڑے لپیٹ لو۔ اور شیر خدا نے تعمیل ارشاد کی۔

جنگ زور و شور سے جاری تھی کہ جناب عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے ان دو نو عمر انصاری بچوں نے سوال کیا چچا جان! آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟ بچوں کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ کہا ہم نے سنا کہ وہ ہمارے سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے خدائے واحد و لایزال کی قسم اگر آج وہ ہمیں مل گیا تو یا وہ نہیں یا ہم نہیں۔ اتفاقاً گھوڑے پر سوار اور لوہے میں غرق ابوجہل...

لشکر کفار میں دوڑ بھاگ کرتا ہوا نظر آ گیا میں نے بچوں سے کہا۔ وہ ہے ابوجہل اتنا سننا تھا کہ دونوں بچے باز کی طرح اس پر جھپٹ پڑے ایک نے گھوڑے پر حملہ کیا اور ابوجہل گھوڑے سے گر پڑا اور دوسرے نے تلوار کا ایسا وار اس کی ٹانگ پر کیا کہ پھر ابوجہل اٹھ نہ سکا۔ آخر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جا کر اس کا سر تن سے جدا کیا۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے یہ حال دیکھا تو پلٹ کر آیا اور ایک لڑکے کا ہاتھ کاٹ دیا۔ ہاتھ کٹ گیا مگر دونوں شہباز معاذ بن عمرا اور معوذ بن عفرا رضی اللہ عنہما خوشی سے سرشار تھے کہ انہوں نے ایک سخت گستاخ زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہے اسلامی تاریخ آج ایسے ہی ستاروں پر کمند ڈالنے والے جوانوں کی منتظر ہے۔

؎ محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

شوقِ شہادت و جہاد

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا اس اعتبار سے بڑی خوش نصیب خاتون تھیں کہ اکثر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دن کے کھانے کے بعد ان کے مکان پر تشریف لیجاتے اور قیلولہ فرماتے۔ ایک دن عین دوپہر کے وقت آپ قیلولہ فرما رہے تھے کہ یک بیک اٹھ کر بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے ام حرامؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کس بات پر مسکرا رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ام حرامؓ! مجھے ابھی دکھایا گیا ہے کہ میری امت کے کچھ لوگ جہاد کی نیت سے سمندر میں سفر کر رہے ہیں اور وہ اس طرح سوار ہیں گویا وہ بادشاہ ہوں اور تخت پر بیٹھے ہوئے ہوں۔ حضرت ام حرامؓ کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ وہ لوگ تو یقیناً بلند مرتبہ مجاہدین اسلام ہوں گے جو اسلام کا ڈنکا بجانے کے لیے سمندر کا طویل سفر کریں گے۔ ان کا مرتبہ تو بہت ہی عظیم ہوگا۔ عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک آپ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس مقدس جماعت میں شامل ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا کہ "تم بھی ان میں شامل ہو گی" اور پھر لیٹ رہے تھوڑی دیر کے بعد آپ حسب سابق اٹھ بیٹھے اور اسی طرح مسکرانے لگے۔ اس مرتبہ پھر ام حرام رضی اللہ عنہا نے مسکرانے کی وجہ دریافت کی۔

تو آپ نے وہی بات فرمائی۔ ام حرام رضی اللہ عنہا نے پھر آپ سے درخواست کہ دعا فرمادیں کہ میں اس مقدس جماعت میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کروں آپ نے ارشاد فرمایا ام حرام! تم پہلی جماعت میں شامل ہو گی۔

وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں شام کے حاکم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جزائر قبرص پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے انہیں اجازت دیدی۔ صادق و مصدوق خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی پیش گوئی بھلا کیوں کر پوری نہ ہوتی جب لشکر روانہ ہونے لگا تو اپنے شوہر حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا بھی اس لشکر میں شامل تھیں۔ جب بادبانی کشتی پر ام حرام رضی اللہ عنہا سوار ہو رہی تھیں تو کوئی کسی خیال میں تھا کوئی کسی خیال میں ام حرام رضی اللہ عنہا کی آنکھوں کے سامنے اس دوپہر کا منظر تھا جب قیلولہ سے بیدار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا مسکرا کر اس سفر کی پیشگوئی فرما رہے تھے اور آپ نے ام حرام رضی اللہ عنہا کو اس جنگ میں شرکت کی بشارت دی تھی۔ قبرص سے واپسی کے وقت ام حرام رضی اللہ عنہا خچر پر سوار ہونے لگیں تو وہ اتنے زور سے بدکا کہ وہ گر پڑیں اور گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے سبب وفات پاگئیں اس طرح یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی کہ "ام حرام رضی اللہ عنہا تم پہلی جماعت میں شامل ہو گی۔"

جہاد بالسیف والقلم

ہلاکو خاں کا پڑپوتا قازان جس طرح بربریت قتل و غارت گری اور ظلم و عدوان میں ضرب المثل تھا اسی طرح جواں مردی شجاعت حق گوئی و بے باکی میں امام ابن تیمیہ

رحمۃ اللہ علیہ ضرب المثل تھے بڑے بڑے ظالم و جابر بادشاہوں کے سامنے کلمۂ حق
بلند کرنا اور مظلوم انسانیت کو ظلم سے چھٹکارا دلانا امام کے کردار کا لازمی حصہ تھا۔ وہ صرف
قلم کے دھنی نہیں تھے تلوار کے بھی دھنی تھے وہ قلم سے جہاد کرنے کے ساتھ ساتھ تلوار
اور زبان سے بھی جہاد کرنا جانتے تھے چنانچہ ۶۹۹ھ میں جب کہ ان کی عمر صرف اٹھارہ برس
تھی قازان نے شام پر حملہ کیا مصر کا بادشاہ سلطان ناصر اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھا
لیکن اسے شکست ہوئی اور قازان نے مصر پر قابض ہو کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا
دی۔ جب مصر میں قتل عام اور غارت گری کا بازار گرم تھا تو انیس سالہ ابن تیمیہ بے دھڑک
قازان کے دربار میں چلے گئے اور اپنی گفتگو کے سحر سے اس کو اس طرح مسحور کیا کہ امن و
امان کا حکم نامہ لے کر ہی لوٹے۔ ۷۵۳ھ میں تاتاریوں نے پھر بڑے ساز و سامان کے
نوّے ہزار کا لشکر لے کر دوبارہ شام پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا شام میں مزاحمت کی قوت
نہ تھی مصر کا حکمران سلطان ناصر پہلی شکست کی وجہ سے ہمت ہار بیٹھا تھا لیکن کوئی
دوسرا چارہ کار بھی نہ تھا کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی کہ سلطان ناصر کے پاس جنگ کا پیغام لیکر
جائے اس موقع پر بھی امام ابن تیمیہؒ نے اس بات کا بیڑا اٹھایا اور مصر پہنچ گئے۔ سلطان
ناصر کو حالات سے باخبر کیا اور اس سے درخواست کی کہ آپ میدان میں نکلیں اور
شام کے کمزور مسلمانوں کو مکمل تباہی و بربادی سے بچانے کی کوشش کریں۔ سلطان ناصر
نے جب سنا کہ قازان نوے ہزار کا لشکر لیکر آرہا ہے تو وہ اور اس کے سردار دل چھوڑ گئے
اور انہوں نے کہا کہ اتنے بڑے لشکر جرار کا ہم کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں! اتنا سننا تھا کہ ایسا
لگا۔ جیسے امام ابن تیمیہؒ کی زبان سے کلمات نہیں شعلے برس رہے ہیں۔ فرمایا سلطان جنگ
بدر کے موقع پر کثرت تعداد کس کی تھی؟ کیا تجھے یاد نہیں کہ صرف ۳۱۳ مسلمان جانبازوں
نے قلت تعداد کے باوجود کفار کی کثیر جمعیت پر غلبہ حاصل کر لیا تھا سلطان! اس وقت
اسلام اور مسلمانوں پر وقت آن پڑا ہے اگر تم اسلام کی نصرت و حمایت کے لئے نہیں
اٹھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کھڑا کرے گا۔ امام کے اس جملے نے سلطان
ناصر اور اس کے ساتھیوں کی رگ مردہ میں حیات تازہ دوڑا دی اور سلطان ناصر نے

تیار کر کے شام کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تاتاریوں سے زبردست مقابلہ ہوا۔ اگرچہ مسلمان تعداد کے لحاظ سے کم تھے مگر چونکہ امام ابن تیمیہؒ بنفس نفیس جنگ میں شریک تھے۔ اور جنگ کرتے کرتے لوگوں کو ثابت قدمی کی تلقین فرماتے جاتے تھے اس لئے گھمسان کی لڑائی کے بعد اسلامی افواج کو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی اور تاتاری برباد ہو گئے۔ دنیا نے ایک مرتبہ پھر اپنی جاگتی آنکھوں سے بدر کا منظر دیکھ لیا۔ نصرتِ خداوندی اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جو تعداد اور تلوار پر بھروسہ کرنے کی بجائے صرف ذاتِ حق وحدہٗ لا شریک پر بھروسہ کرے۔

شہادت کی عظمت

اسلام قبول کرنے کے بعد جب سے وہ اپنے گاؤں میں واپس آئے تھے ان کا صرف ایک مشغلہ تھا نماز پڑھنا اور چراگاہ میں بکریاں چرانا، خاموش طبع صرف اللہ اللہ کرنا اور حلال روزی طلب کرنا۔ ایک دن نہ جانے دل میں کیا آئی کہ ایک ہی رسی میں اپنی تمام بکریوں کو باندھا بھتیجے کو ساتھ لیا اور دیارِ محبوب یعنی شہر مدینہ کی طرف چل پڑے۔ شوق رہبر و رہنما تھا اور منزلوں پہ منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ آخر کار جس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ عاشق رسول حضرت وہب بن قابوسؓ مدینہ میں داخل ہوتے مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شہر پر سناٹا چھایا ہوا ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد میں تشریف لے گئے ہیں عاشق کو چین کہاں؟ بکریوں کو اسی جگہ چھوڑ چھاڑ وہبؓ سیدھے احد کی طرف چل پڑے۔ معرکۂ کارزار گرم تھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو چکے تھے۔ کفار کا ایک جتھہ سرکار پر حملہ آور تھا کہ وہب بن قابوسؓ پہنچ گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جوان کو منتشر کر دے جنت میں میرا ساتھی ہوگا۔ اتنا سننا تھا کہ لگا جیسے وہب بن قابوسؓ کے ہاتھوں میں ہڈی کی جگہ برقِ تپاں بھر دی گئی ہو۔ تیزی سے تلوار چلانے لگے یہاں تک کہ حملہ آور جماعت پسپا ہو گئی۔ دوسری

مرتبہ پھر وہ جماعت ہجوم کر کے آئی اور دوسری مرتبہ بھی وہبؓ کی تلوار کی کاٹ کے سامنے اسے پسپا ہونا پڑا۔

ابوسفیان نے للکارا کہ یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے تو اس کی للکار سن کر تیسری مرتبہ بھی کفار کے لشکر کا ایک دستہ ہجوم کر کے آیا۔ مگر اس مرتبہ بھی حضرت وہب بن قابوسؓ کے مقابلے کی تاب نہ لاتے ہوئے اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہبؓ کو جنت کی بشارت دی تو وہ دیوانہ وار کفار کے جمگھٹے میں گھس گئے اور جلد ہی مقام شہادت پر فائز ہوئے۔

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے وہبؓ جیسی بہادری اور جاں بپاری کسی لڑائی میں نہیں دیکھی۔ ان کے شہید ہونے کے بعد ان کی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما رہے تھے "وہبؓ میں تم سے راضی ہوں، اللہ تم سے راضی ہو۔ اگرچہ سرکار خود زخمی تھے مگر آپ نے اپنے دستِ مبارک سے وہبؓ کو دفن فرمایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے:۔

مجھے کسی عمل پر بھی اتنا رشک نہ آیا جتنا کہ وہبؓ کے عمل پر آیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میں اسی طرح کا نامہ اعمال لیکر پہنچوں جس طرح کا نامہ اعمال وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ لیکر دنیا سے گئے۔

بیٹے کی شہادت پر مسرّت

آرمینیا کی جنگ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو بیک وقت دِل ہلا دینے والا بھی ہے اور فخر سے سر بلند کرنے والا بھی لڑائی ختم ہو گئی مگر محاذ سے عبدالرحمٰن ابن غنمؓ کا بیٹا واپس نہیں آیا نہ خیموں میں دیوانہ وار سپاہیوں کے ہمراہ باپ اپنے بیٹے کو ڈھونڈتا رہا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد باپ نے دیکھا کہ زخموں سے چُور اس کا بیٹا میدان کے ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے چیخ نکل گئی اور جلدی سے بیٹے کو اٹھایا انتہائی حسین اور کڑیل جوان

خون میں ڈوبا ہوا تھا صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور باپ رونے لگا۔ بیٹے کا دم لبوں پر تھا مگر اس کے باوجود بیٹے نے باپ سے کہا، باباجان! آپ غم نہ کیجئے اس لئے کہ میری یہ موت بہت مقدس موت ہے شہادت کی موت قسمت والوں کو ملتی ہے آپ کا بیٹا دین کے راستے میں سُرخرو ہو کر دنیا سے جا رہا ہے۔

کل قیامت کے دن خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہایت خوشی سے آپ کا استقبال کریں گے۔ یہ باتیں سُن کر حضرت عبدالرحمٰن ابن غنم رضی اللہ وتعالیٰ عنہ نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ موذن نے ظہر کی اذان دی اور اللہ اکبر کا کلمہ سنتے ہی بیٹے نے باپ کی آغوش میں دم توڑ دیا۔ ظہر کی نماز کے بعد اسی خون آلود کپڑے میں کفنا کر عبدالرحمٰن ابن غنمؓ نے بیٹے کو سپردِ خاک کر دیا۔ بیٹے کو دفن کرنے کے بعد باپ نے سرمہ لگایا کنگھا کیا منہ ہاتھ دھویا اور صرف اتنا کہا بیٹے تجھے تیری شہادت مبارک ہو سارا اسلامی لشکر اس کڑیل جوان کی شہادت پر غمزدہ تھا لیکن باپ مسکراتا ہوا حضرت ایاض رضی اللہ عنہ کے خیمے میں جب داخل ہوا تو جناب ایاضؓ نے پوچھا عبدالرحمٰنؓ یہ تو خوشی کا موقع نہیں ہے مگر تم بہت پُرمسرت نظر آ رہے ہو۔ جناب عبدالرحمٰن ابن غنمؓ نے فرمایا، ایاضؓ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جس کا لڑکا مر جائے اور وہ اسے بہت عزیز رکھتا ہو تو ایسی صورت میں اس کا غزوہ سب سے بہتر غزوہ ہوتا ہے۔ اور اس کا اجر مکمل مغفرت کے سوا کچھ نہیں۔ ایاضؓ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میرا بیٹا اپنے ساتھ ساتھ میری مغفرت کا بھی انتظام کر گیا۔ یہ جدائی تو عارضی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد باپ بیٹا دونوں جنت میں جمع ہوں گے۔ ہم ہونگے اور خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

باب ۹

اوصاف و اخلاق

عفو و درگزر

اس کے منہ میں جو آرہا تھا بس غصے میں بکے چلا جا رہا تھا۔ غصہ دراصل ایسی ہی چیز ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آدمی ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ آدمیت کی یہ شرط اولیں ہے کہ آدمی عیش کی حالت میں یادِ خدا سے اور طیش کی حالت میں خوفِ خدا سے بیگانہ نہ ہو۔ اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے اور کس سے ہم کلام ہے۔ زبان تھی کہ قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ الزام تراشی۔ بہتان طرازی، یاوہ گوئی غرضیکہ کیا کچھ نہ تھا۔ مگر مخاطب سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک چپ ہزار چپ۔ صدیقؓ کو برا بھلا کہنا اور وہ بھی دربارِ نبوّت میں معمولی بات نہ تھی۔ مگر سیّدنا صدیقِ اکبرؓ رضی اللہ عنہ خاموشی سے سن رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خاموش بیٹھے تھے۔ آخر برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جب وہ آدمی حد سے بڑھنے لگا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا اور انہوں نے بھی جواباً سخت اور تند لہجے میں جواب دینا شروع کیا۔ اس میں شک نہیں کہ صدیقؓ کا لہجہ تند تھا مگر تہذیب کے دائرے میں تھا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جواب ترکی بہ ترکی تھا۔

یہ دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مجلس سے اٹھ کر چل دیے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ مزاج شناسِ نبوّت تھے سمجھ گئے کہ ضرور مجھ سے کوئی نامناسب رویّہ ظاہر ہو گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اٹھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چل پڑے۔ دریافت کیا، سرکار! جب تک وہ مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا آپ مجلس میں تشریف فرما رہے اور جب میں نے جواب دینا شروع کیا تو آپؐ اٹھ کر چلے آئے۔ آخر بات کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ابوبکرؓ! جب تک وہ شخص تمہیں برا بھلا کہہ رہا تھا اور تم خاموش تھے میں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ تمہاری طرف سے جواب دے رہا ہے اور جب تم نے بھی وہی انداز اختیار کر لیا جو اس کا تھا تو فرشتہ وہاں سے چلا گیا اور مجلس میں شیطان آکر بیٹھ گیا۔ تم خود بتاؤ کہ جس مجلس میں شیطان بیٹھا ہو بھلا میں وہاں کیسے

ٹھہر سکتا ہوں اس لیے میں بھی اٹھ کر چلا آیا۔ ابوبکرؓ! یاد رکھنا اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرے اور مظلوم اسے معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن مظلوم کی مدد کر کے اسے عزّت والا اور ظالم کو ذلیل کر کے رہتا ہے۔

اہلِ حاجت کی خبر گیری

رات کے وقت کسی آدمی نے حضرت قیس بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہر چند کہ بیوی منع کر رہی تھی کہ فوراً دروازہ نہ کھولنا مگر وہ اللہ کا بندہ کہاں ماننے والا تھا۔ اٹھے اور دروازہ کھول کر دیکھا تو ان کے ایک دوست کھڑے تھے۔ انہیں باہری کمرے میں بٹھایا اور خیریت دریافت کی۔ دوست کچھ پریشان پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ قیس بن سعدؓ سمجھ گئے کہ کوئی نہ کوئی افتاد پڑی ہے کہ یہ میرے پاس آیا ہے۔ دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے کہ آپ کچھ بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں؟ اب تو مارے شرم کے دوست کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا ہے ایک رنگ جا رہا ہے۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا حضرت! مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے وقت آ کے آپ کو تکلیف دی۔ مگر بات ہی کچھ ایسی تھی کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کے چار سو درہم میرے اوپر قرض ہیں میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ کل صبح ادا کر دوں گا مجھے امید تھی کہ ایک جگہ سے مجھے یہ رقم مل جائے گی مگر کوئی صورت نہ بن سکی۔ رات زیادہ ہو گئی۔ میں نے خیال کیا کہ کل وعدہ خلافی ہو جائے گی۔ اس لیے سوچا کہ آپ ہی کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے۔ تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ قیسؓ اٹھ کر گھر میں تشریف لائے۔ صندوق کھولا اور چار سو درہم دوست کے حوالے کر دیے دوست کی آنکھوں سے احسان مندی کے آنسو چھلکنے لگے اور وہ شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔ مگر قیس بن سعدؓ زار و قطار روتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی نے جو یہ حال دیکھا تو بہت پریشان ہوئی۔ کہا کہ وہ اگر رقم دینا تم پر اتنا ہی شاق تھا تو تم نے پیسے کیوں

دیے؟ اور دے دیے تو اب روتے کیوں ہو؟ حضرت قیس بن سعدؓ نے فرمایا۔
"نیک بخت! رونا اس لیے نہیں ہوں کہ میں نے اپنے پیسے اسے دے دیے رونا اس لیے ہوں کہ میں نے اپنے دوست کے حال سے اتنی غفلت کیوں برتی کہ اسے پیسوں کے لیے میرے پاس آنا پڑا مجھے خود اس کی خبر گیری کرنا چاہیے تھی۔ وہ دوست ہی کیا جو اپنے دوست کی خبر گیری نہ کرے۔

جانور اور پرندے بھی قابلِ رحم

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سارے کے سارے عادل، لائق احترام اور منارۂ نور ہیں تاہم وہ صحابہ کرام جو شرف صحابیت کے ساتھ ساتھ علم وفقہ میں بھی دسترس رکھتے تھے وہ تو نہایت ہی لائق تکریم اور قابلِ تقلید تھے۔ خود صحابہ کرام ان کا بے حد ادب کرتے تھے صحابہ کے بعد تابعین کی جو جماعت آئی اس نے تو ان کی پیروی ہی کو سب کچھ سمجھا کہ وہ مزاج شناس شریعت تھے ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ بن بشر و عبیداللہ بن بشر رضی اللہ عنہما اپنے مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے کہ کچھ لوگ آئے اور ان سے سوال کیا "حضرات! یہ تو بتائیں کہ ایک شخص اپنے گھوڑے پر سوار ہے اور اسے بار بار کوڑا مارتا ہے اس کے بارے میں آپ حضرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت سنی ہے"؟ دونوں بھائی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ کافی دیر تک غور کرنے کے بعد انہوں نے جواب دیا "نہیں۔ ہم نے اس بارے میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہیں سنی ہے"۔
اتنے میں اندر سے ایک خاتون کی آواز آئی تم کیسی باتیں کہتے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں فرمایا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ یعنی زمین کے جانور اور ہوا میں اڑنے والی چڑیاں بھی تمہاری ہی طرح ایک امت ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان

بحیثیت انسان کے قابلِ رحم ہے اسی طرح زمین پر چلنے پھرنے والے جانور اور ہوا میں اڑنے والی چڑیاں بھی قابلِ رحم ہیں اور کسی کو اجازت نہیں کہ ان پر ظلم و زیادتی کرے" خاتون کی آواز سن کر دونوں صحابیوں نے سر جھکا دیئے اور سوال کرنے والوں سے کہا "حضرات! یہ ہماری بڑی بہن ہیں۔ جو فرما رہی ہیں حق ہے قرآن فہمی میں یہ ہم سب سے بہت آگے ہیں۔"

اسی طرح کی ماؤں نے عبداللہ بن زبیر، خالد بن ولید، انس بن مالک اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے اسلام کے سپوتوں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا تھا۔ قرآن و سنت کے سانچے میں خود ڈھلی ہوئی تھیں اور اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں قرآن و سنت کا ترجمان بنایا تھا۔

فضیلتِ توبہ

ڈاکوؤں کی کل تعداد سات تھی۔ ان کے سردار کا نام ابراہیم تھا۔ پروگرام تھا کہ آج رات قریب کے گاؤں میں ڈاکہ ڈالا جائے گا۔ ساتھی ہتھیار تیز کر رہے تھے۔ سردار نے سوچا کہ درخت کی چھاؤں میں تھوڑی دیر آرام کر لے۔ نیند کا غلبہ ہو رہا تھا کہ ابراہیم نے ایک ایسا تماشا دیکھا کہ اس کی نیند غائب ہو گئی اور وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک انگور کا سرسبز درخت ہے اور دوسرا کیکر کا خشک۔ اور ایک بلبل انگور کے درخت سے ایک دانہ اپنی چونچ میں دبا کر لاتا ہے اور کیکر کے درخت کے ایک سوراخ میں ڈال کر چلا آتا ہے۔ اسے سخت حیرت ہوئی اٹھ کر کیکر کے درخت کے قریب گیا اور سوراخ کے پاس جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک اندھا سانپ منہ کھولے سوراخ میں بیٹھا ہے اور بلبل اس کے منہ میں دانہ ڈال ڈال کر آ رہا ہے۔ اس نے ساتھیوں کو بلا کر یہ ماجرا دکھایا اور کہنے لگا۔ "ساتھیو! جس اللہ جل شانہٗ نے ایک اندھے سانپ کی روزی کا ایسا انتظام فرمایا ہے بھلا وہ ہماری روزی کا بندوبست نہیں کرے گا۔

پھر کیا ضروری ہے کہ ہم روزی کے لیے ڈاکہ ماریں، قتل و غارت کریں۔ کیوں نہ اس رزاق مطلق کی روزی رسانی پر بھروسہ کر کے ہم لوگ ڈاکہ زنی سے توبہ کر لیں"۔ ابراہیم نے کہا کلمہ پڑھا اور صدقِ دل سے توبہ کر لی۔ ندامت کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے جنہیں فرشتے شاید موتی سمجھ کر چن رہے تھے۔ ساتھی ڈاکوؤں نے کہا "سردار ڈاکہ زنی میں تم ہمارے سردار تھے تو توبہ میں بھی ہم تمہیں اپنا سردار تسلیم کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا کرو کہ وہ ہماری توبہ بھی قبول کر لے"۔ فیصلہ ہوا اور سب نے مل کر لوٹ کا سامان مالکوں کو لوٹا دیا اور مالک نہ ملنے پر خیرات کر دیا۔ ابراہیم کے ساتھ تمام ڈاکوؤں نے فیصلہ کیا کہ حج کا زمانہ ہے احرام باندھو اور ایک ساتھ چل کر خانۂ کعبہ میں رب کعبہ کے حضور اپنی توبہ کا اقرار کریں۔ راستے میں ایک عورت ملی وہ اس جماعت کو تلاش کر رہی تھی جس میں ابراہیم ہو۔ چونکہ سردار کا نام بھی ابراہیم تھا اس نے بڑھیا سے کہا کہ ابراہیم تو میرا ہی نام ہے۔ عورت نے کہا بیٹے میں دو دنوں سے تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہوں۔ دو دنوں سے تیرے لیے میں کھانا پکا کر تجھے ڈھونڈنے نکلتی ہوں خدا کا شکر ہے تو آج مل گیا۔ بات یہ ہے کہ پرسوں رات میرے بیٹے ابراہیم کی وفات ہو گئی میں بہت رو رہی تھی اور روتے روتے سو گئی تھی کہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا بڑھیا تجھے اپنے ابراہیم کی جدائی کا بہت صدمہ ہے انتظار کر میرا ابراہیم آ رہا ہے اس کی خاطر تیرا صدمہ دور ہو جائے گا بیٹا میرے گھر میں کھانا کھا لے۔ میرے ابراہیم کے کپڑے بھی لے لے کر تو سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا لاڈلا ابراہیم ہے۔ ابراہیم مالک کے آگے سر بسجود تھا کہ نوازنے والے! میں نہیں جانتا تھا کہ توبہ کے بعد تو اپنے بندوں کو اس طرح نوازتا ہے۔

بیوہ کی امداد کا ثمرہ

اس کے پاس تو صرف تین یتیم بچیاں ان کے تاریک مقدر اور خود اس کے اپنے

ماتھے پر بیوگی کا داغ تھا. شوہر کو مرے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے تاہم
شوہر بہت غربت کی حالت میں مرا تھا اس لیے جلد ہی فقر و فاقہ کا سلسلہ شروع ہو گیا.
خاندانی اعتبار سے وہ علوی تھی یعنی سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد. کس سے
دستِ سوال دراز کرتی۔ فاقے پہ فاقے سوچا کہ چلو قاضی شہر کے پاس اس سے امداد
کی درخواست کرے قاضی نے معذرت کر دی کہ دفتر کے اوقات ختم ہو گئے ہیں اس
لیے آپ کل آئیں. نہایت متفکر واپس آئی یعنی ایک رات اور بھی فاقوں کے ساتھ
گزارنی پڑے گی یتیم بچیوں نے صبر کا سل سینے پر رکھ لیا اور انتہائی بے چینی سے بھوک
کے عالم میں رات ڈھلنے اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ دوسرے
دن بھی ماں قاضی شہر کے پاس گئی اور شام کو نامراد لوٹی اور جب تیسرے دن بھی
قاضی نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکلوا دیا تو وہ یہ عہد کرتی ہوئی واپس لوٹی کہ اب
میں کسی کے دروازے پر نہیں جاؤں گی مر جاؤں گی لیکن کسی کے آگے دستِ سوال
دراز نہ کروں گی. بھوک کی وجہ سے بچیاں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں آنکھوں میں گڑھے
پڑ گئے تھے اب تو آنسو بھی خشک ہو گئے تھے قاضی سے ناامیدی کے بعد کوئی دروازہ ایسا
نہ تھا جہاں سے مراد مل جاتی۔ یاس کی گھٹا ٹوپ تاریکی دماغ پر چھا گئی نہ بیٹیوں کو نیند
آتی تھی نہ ماں کو سب نے ایک بوریا بچھایا اور مالک الملک کے سامنے بھیک کا
ہاتھ پھیلا دیا. ایسی عاجزی ایسی لجاجت اور ایسے کرب و اضطراب کے ساتھ کہ شاید
تھوڑی دیر کے لیے عرشِ الٰہی بھی کانپ گیا ہوگا. پڑوس میں سیدوک نامی ایک
نصرانی رہتا تھا اس نے بھی رونے کی آواز سنی اس کے گھر میں فراغت تھی تھوڑا کھانے
پینے کا سامان لیا کچھ پیسے لیے اور بیوہ کا دروازہ کھٹکھٹایا. کہا کہ بہن! آپ یہ قبول کرلیں
ایک پڑوسی کا پڑوسی پر جو حق ہوتا ہے اس کے تحت لایا ہوں بیوہ نے سامان قبول
کرلیا۔ پکایا کھایا اور بچیوں کے ساتھ پڑ کر سو گئی۔ اسی رات قاضی نے خواب میں دیکھا
کہ میدانِ حشر بپا ہے ایک فرشتہ اسے پکڑ کر ایک محل کے پاس لے گیا اور قاضی کو دکھلا
کر یہ کہا کہ پہلے یہ محل تیرے لیے بنا تھا اور اب یہ سیدوک نامی نصرانی کو دے دیا گیا

کہ اس نے اپنی بیوہ پڑوسن کی مدد کی تھی جسے تو نے دھتکار دیا تھا، سیدوک کو جب قاضی کے اس خواب کی اطلاع ملی تو اس نے سوچا کہ اعمال تو میرے اسلامی ہیں اقرار کر کے مسلمان کیوں نہ ہو جاؤں اس طرح وہ قاضی کے محل کا وارث بھی بن گیا۔

طلبِ حلال

امام اوزاعیؒ گرمی کے زمانے میں کسی ضرورت سے بازار جا رہے تھے۔ دور سے ایک بوڑھا نظر آیا پسینے میں شرابور، چہرہ سرخ، آنکھیں چڑھی ہوئی، لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر، کمر جھکی ہوئی، اوزاعیؒ کو بہت ترس آیا دل میں سوچنے لگے کہ اس بوڑھے کی مدد کرنی چاہیے کمزور کی مدد کرنا تو باعثِ اجر و ثواب ہے پھر وہ مسلمان ہی کیا جو کسی پر رحم نہ کھائے اور مسلمان کے دکھ درد میں اس کے کام نہ آئے اسلام کی یہی تو تعلیم تھی جس نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا اور دیکھتے دیکھتے اونٹوں کے گلہ بان قوموں کی تقدیر کے مالک بن گئے باہمی اخوت، مروت اور محبت۔ ایک آدمی تکلیف میں پڑ گیا تو سب بے چین و پریشان بالکل ایک بدن کے اعضاء کی طرح۔ ایسا لگا جیسے رحم کے جذبات نے اوزاعی کے قدموں کو جکڑ لیا درخت کی چھاؤں میں امام کھڑے ہو گئے اس ارادے سے کہ لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر لادے ہانپتا کانپتا جب بوڑھا ان کے پاس سے گزرے گا تو اسے روک کر اس کی مدد کرنے کے لیے اس سے اجازت طلب کریں گے لیکن جب بوڑھا قریب آیا اور امام اوزاعی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تو وہ حیران رہ گئے کہ یہ بوڑھا کوئی معمولی لکڑہارا نہیں ہے بلکہ بلخ کے سابق حکمران سید الطائفہ سلسلۂ طریقت کا نامور ولی حضرت سیدنا ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کپڑے پسینے میں تر بتر، پاؤں گرد و غبار میں اٹے ہوئے جب اوزاعیؒ کے قریب پہنچے تو ادب سے امام نے خواجہ ابراہیمؒ بن ادھمؒ کو سلام کیا اور عرض کیا حضرت! آپ کیوں یہ تکلیف اٹھا رہے ہیں ماشاء اللہ آپ کے خادم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں اور سب آپ پر جان چھڑکتے ہیں اور سب کے ہوتے

ہوئے آپ لکڑی کا گٹھا کمر پر لاد کر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ابراہیم بن ادہمؒ نے درخت کے سائے میں گٹھا اتار کے رکھ دیا اور فرمایا!

اوزاعیؒ! مجھے یہ بات معتبر ذرائع سے معلوم ہوئی ہے کہ جو آدمی حق حلال کی روزی کمانے میں محنت کشی اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے۔ اوزاعیؒ! مجھے محنت کر کے حلال روزی کمانے دو کہ خدا کی رضا کے سوا میرا کوئی مقصود نہیں۔ کوئی مطلوب نہیں۔

جسم و روح کے تقاضے

اللہ تعالےٰ کی بے شمار مخلوقات میں انسان ایک عجیب و غریب مخلوقات ہے جسمانی پہلو سے دیکھو تو انسان ایک مادہ ہے کیونکہ مادی اجسام کی طرح اس کا جسم پیدا ہوتا، پلتا بڑھتا، نشو و نما پاتا اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان صرف جسم ہی تو نام نہیں ہے اس میں اور ایک اور چیز بھی تو پائی جاتی ہے جو اتنی لطیف اور پیچیدہ ہے کہ اس کی حقیقت کا ادراک ہی نہیں کیا جا سکتا مگر اصل میں حکمران وہی ہے۔ وہ ہے تو حیات ہے۔ انسان دیکھتا، سنتا، چلتا پھرتا، بولتا اور سوچتا ہے نکل گئی تو یہ جسم مٹی کے ایک ڈھیر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بیٹا اپنے باپ کو اور باپ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں منوں مٹی کے ڈھیر میں دبا دیتا ہے، اس لیے کہ انسانی وجود کا اصل جوہر تو اس کی روح ہے۔ روح رخصت ہو گئی تو سب کچھ رخصت ہو گیا۔ آنکھیں موجود ہیں مگر آدمی دیکھ نہیں سکتا۔ پاؤں ہیں مگر چل نہیں سکتا۔ روح کے نکل جانے کے بعد تو انسان اپنے چہرے پر بیٹھی ہوئی مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتا۔ غرضیکہ انسان دو چیزوں سے عبارت ہے جسم کثیف اور روح لطیف جسم انسان کا تعلق زمین سے جوڑنا چاہتا ہے اور روح اسے بلندیوں پر فائز دیکھنا چاہتی ہے۔ مادہ پرستوں نے روح کے تقاضوں کو فراموش کر کے صرف دنیوی اور جسمانی مفادات کی تکمیل ہی کو سب کچھ سمجھا نتیجہ یہ

نکلا کہ انسان اپنے بلند و بالا مرتبے سے گر کر نرا حیوان بن گیا خواہشات کا غلام نفس کا پرستار۔ لالچی اور خونخوار بھیڑیا۔ بعض ادیان ▪ مذاہب کے ماننے والے انسانی فطرت سے نا واقف ہونے کی وجہ سے روح کو ترقی دینے کے لیے جسم کو تکلیف دینے کے درپے ہو گئے اسلام نے جسم کے تقاضوں کو فراموش کیا نہ روح کے مطالبات کو پس پشت ڈالا۔ بلکہ اسلام تو نام ہی ہے روح اور جسم دونوں کے حقوق ادا کرنے کا۔ دونوں کو سنوارنے دونوں کو سجانے اور دونوں کو مہذب بنانے کا۔ اس دین کی تعلیمات میں اتنا توازن اور اعتدال ہے کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ سچا مسلمان نہ راہب گوشہ گیر ہوتا ہے نہ درہم و دینار کا دنیا دار پجاری۔ وہ رزم حیات میں حصہ ضرور لیتا ہے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی حق اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

کئی سال سے مرید پیر کی خانقاہ میں مقیم تھا اور شیخ کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا اسے تلاش تھی اس راہ کی جو اسے منزلِ مراد پر پہنچا دے روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور چھانوں کے بچے کھچے سالن پر اس کا گزارہ تھا۔ وقت اسی طرح گزار رہا تھا کم بولنا، کم کھانا اور کم سونا اس کا معمول تھا مگر چہرے پر شکن نہ تھی نہ دل میں کوئی گلہ یہ راہ تو عیش و عشرت کی راہ نہیں بہت کچھ کھونے کے بعد آدمی کچھ پاتا ہے۔ ملا علی قاریؒ نے منزلات شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ ایک دن علاقے کے بڑے بڑے اولیاء اللہ کی جماعت شیخ سے ملاقات کے لیے آئی شیخ نے نہایت ادب و احترام سے ان کا استقبال کیا اور مرید سے کہا کہ تم ان حضرات کی سواریوں کی باگ تھام لو اور ان کے چارے پانی کا انتظام کرو مرید بیچارہ جانوروں کی خدمت میں لگ گیا انہیں چارہ پانی دینے کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت بھی کیے جا رہا تھا اور دل میں سوچے جا رہا تھا کہ کیا اتنے دنوں

تک شیخ کی خدمت میں رہتے اور طویل مسافری اختیاری کرنے کے باوجود میں اسی قابل رہ گیا ہوں کہ انسان تو انسان جانوروں کی خدمت کرتا رہوں ایک خیال تھا جو دل میں آیا اور گزر گیا مگر اس خیال نے مرید کو فرض کی ادائیگی سے غافل نہیں کیا دو تین دنوں تک اولیاء اللہ کی یہ جماعت شیخ کے پاس ٹھہری رہی اس کے بعد رخصت ہو گئی۔ ان بزرگوں کے تشریف لے جانے کے بعد مرید شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا شیخ نے فرمایا بیٹے! تم نے اکابر اولیاء اللہ کی سواریوں کی خدمت بڑے خلوص سے انجام دی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں عنقریب ایسے دن بھی آنے والے ہیں جب تمہارے دروازے پر ایسے ہی بزرگوں کی سواریاں آیا کریں گی اور تمہارے مریدین اسی طرح ان بزرگوں کی سواریوں کی خدمت کریں گے جس طرح تم آج کر رہے ہو۔ ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ زیادہ دن نہیں گزرے کہ وہ مرید جو اکابر کی سواریوں کی خدمت کرتا تھا اپنے وقت کا شیخ بنا اور پیش گوئی کے مطابق اس کے دروازے پر بھی بزرگانِ دین کی سواریاں اترنے لگیں اور اس کے سینکڑوں خادم ان سواریوں کی خدمت میں مشغول رہتے۔ یہ راستہ تو خدمت ہی کا راستہ ہے جو خدمت کرتا ہے وہی مخدوم بنتا ہے جو پامال ہوتا ہے آگے چل کر سزاوارِ عظمت وفضیلت قرار پاتا ہے۔ جو جھکتا نہیں کبھی نہیں اٹھتا۔ عاجزی اور انکساری ہی آدمی کو بڑا بناتی ہے یہی سنت کا درس ہے اور یہی فضیلت کا راستہ۔

قناعت

جب دین سیکھنے کے لیے تیرہ افراد پر مشتمل یمن سے ایک وفد آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوش ہوئے ان کی خوب خاطر تواضع فرمائی اور جب بامراد و کامیاب ہو کر وہ واپس جانے لگے تو آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو تحائف دو۔ تحائف لے کر جب وہ لوگ چلنے لگے تو آپ نے ان سے دریافت

فرمایا "تمہارا کوئی ساتھی محروم تو نہیں رہا؟" انہوں نے جواب دیا "حضور! ایک لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کی نگرانی کے لیے چھوڑ آئے ہیں" آپ نے ارشاد فرمایا "اُسے بھیج دو۔" لڑکا سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا "یارسول اللہ صلی اللہ علیک آپ نے اہلِ قافلہ کی حاجتیں پوری کر دی ہیں میری بھی ایک حاجت پوری فرما دیں" آپ نے دریافت فرمایا "تیری حاجت کیا ہے؟ لڑکا بولا "سرکار! میری حاجت قافلے والوں کی سی نہیں ہے. خدا کی قسم میں صرف اس لیے آیا تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے میری مغفرت کے لیے دعا فرما دیں اور دعا فرمائیں کہ وہ میرے دل کو غنی کر دے آپ نے اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا "اللہ! اس کی مغفرت فرما اس پر رحم فرما اور اس کے دل کو غنی کر دے" اس کے بعد آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو بھی تحائف دے دو. تحفے لے کر لڑکا چلا گیا۔ کافی دنوں کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر یمن کا وہی وفد منیٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا تو آپ نے ان سے اس لڑکے کے بارے میں دریافت فرمایا۔ لوگوں نے بتلایا کہ حضور اس جیسا آدمی تو ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے. اگر لوگ بیٹھ کر دنیا کی دولت بانٹ رہے ہوں تو وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ وہ ہے اور یادِ خدا۔ اس کی زندگی میں تو انقلاب آچکا ہے. آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ اس کی موت بھی اسی یکسوئی کے عالم میں واقع ہوگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب یمن میں ارتداد کا فتنہ اٹھا تو یمن کے اکثر علاقوں کے لوگ اس طوفان میں بہہ گئے مگر وہ لڑکا جو اب تنومند جوان تھا صراطِ مستقیم پر قائم رہا اور اپنی قوم کو نصیحت کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی قوم کا ایک فرد بھی مرتد نہ ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق جب اس کی موت کا وقت آیا تو مسکراتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم ــ چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

سات مہلکات

روایتِ حدیث کے لحاظ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو جو امتیاز حاصل تھا اس کے سبب اکثر و بیشتر ان کے گرد صحابہ کرام اور تابعین کا ایک جم غفیر جمع رہتا تھا۔ ایک دن وہ تشریف فرما تھے اور ان کے گرد بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے فرمایا لوگو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات گناہوں کو ہلاک کرنے والے گناہ یعنی کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے اور ان سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

۱ ایک شرک یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی کو شریک کرنا۔ دوسرے جادو کرنا تیسرے کسی بے قصور آدمی کو ناحق قتل کرنا چوتھے سود کھانا پانچویں یتیم کا مال کھانا چھٹے میدانِ جہاد سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا اور ساتویں کسی پاک دامن عورت پر تہمت لگانا۔

شرک تو بدترین گناہ ہے جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس گناہ کو چاہے بخش دے گا لیکن شرک کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کیونکہ یہ تو انتہائی کمینہ پن کی بات ہے کہ انسان تمام نعمتیں اللہ اللہ تعالیٰ سے حاصل کرے اور شکریہ دوسروں کا ادا کرے اور سمجھے کہ فلاں شخص یا فلاں دیوتا نے مجھے یہ نعمت دی ہے جادو بھی اسی لیے حرام ہے کہ جادوگر شیطانی قوتوں کو استعمال کر کے اپنے مقاصد پورے کرتا ہے ان سے مدد مانگتا اور ان کی دہائی دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ سخت ناپسند فرماتا ہے۔ قتل کرنا بھی بدترین گناہ ہے اس لیے کہ انسانی زندگی اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو شخص اس نعمت کو زائل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ بیک وقت انسان اور خدا کا مجرم ہے۔

سود لینے کو تو اللہ تعالےٰ نے خدا و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان جنگ کے برابر قرار دیا ہے ظاہر ہے کہ کون مسلمان اس بات کو برداشت کر سکتا ہے کہ وہ اللہ اور

اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانِ جنگ کرے۔ یہی حال یتیم کے مال کا ہے کہ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ یتیم کا مال کھانا اپنے پیٹ میں آگ بھرنے کے مترادف ہے۔ جہاد افضل ترین عبادت ہے کہ اللہ کی راہ میں مارے گئے تو شہادت کا مرتبہ ملا اور کامیاب و فتح یاب ہوئے تو غازی بنے لہٰذا ایمان کا یہ اولین تقاضا ہے کہ میدانِ جنگ میں جہاں حق و باطل کا معرکہ بپا ہو مومن سیسہ پلائی ہوئی دیوار کیطرح صف بستہ رہیں اور پیٹھ نہ پھیریں۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا بھی بدترین قسم کا گناہ ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔

انہیں مصلحتوں کے تحت مذکورہ سات گناہوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلاکت میں ڈالنے والے گناہ قرار دیا ہے اللہ ہر مسلمان کو ان سے محفوظ رکھے۔

ذکرِ خدا

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا جناب سعید ابن مسیب نے ساری زندگی ایک وقت بھی نماز باجماعت نہیں چھوڑی۔ واقعہ حرہ جس میں یزید کے لشکر نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا تین دنوں تک مسجد نبوی میں اذان ہوئی نہ جماعت اس موقع پر بھی جناب سعید ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ دیوانہ بن کر مسجد نبوی میں مقیم رہے اور آستانۂ نبوت کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ معرفتِ خداوندی کا نور جس دل میں جلوہ فگن ہو جاتا ہے باطل کی قوت کا کوئی رعب اسے متاثر نہیں کر سکتا۔

سعید ابن مسیب نے دنیا اور دولتِ دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ تو دنیا اپنے نعمتوں کے خوان سجائے ایک حقیر لونڈی کی طرح ان کی بارگاہ میں کھڑی رہتی تھی۔ یہ لوگ ہیں جنہوں نے باقی کو فانی پہ ترجیح دی اور پروانے کی طرح اس شمع پر جلنا گوارا کیا جو صبح کو خاموش ہو جانے والی تھی بلکہ خود کو اس حسنِ لازوال کی جستجو میں فنا کر دیا۔

کی محبت ہی کا نام ایمان اور اطاعت کا نام اسلام ہے حضرت سعید بن مسیبؓ فرماتے ہیں " تو اس تھوڑی سی دنیا پر جو تجھے دین کی سلامتی کے ساتھ حاصل ہو اسی طرح راضی رہ جس طرح کہ بعض بدنصیب اپنا دین دے کر بہت سی دنیا حاصل کر لینے پر خوش ہیں۔ یاد رکھ کہ وہ فقر جو دین کی سلامتی کے ساتھ ہو وہ اس غنا سے بدرجہا بہتر ہے جو غفلت کے ساتھ اور دین کو ہاتھ سے دے کر حاصل ہو۔ وہ فقیر جس کا دین سلامت ہے اس کا دل تمام تفکرات سے خالی ہوتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے تو اسے قناعت والا اور باوقار پاتا ہے اور جو شخص اپنا دین بیچ کر دنیا کماتا ہے چاہے وہ کتنا ہی خزانہ جمع کیوں نہ کر لے جب بھی اپنے دل کی طرف دیکھتا ہے تو اسے تفکرات میں گھرا ہوا پاتا ہے اور ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں۔

جناب سعید ابن مسیبؓ ایک مرتبہ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا کہ مجھے ایسا حلال بتایئے جس میں حرام کا شائبہ نہ ہو اور ایسے حرام سے خبردار فرمایئے جس میں حلال نہ ہو۔ فرمایا اللہ کا ذکر وہ حلال ہے جس میں حرام کا شائبہ نہیں۔ اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے جس میں حلال کا شائبہ نہیں۔ میرے دوست! خدا کی یاد اور اس کے کام میں لگے رہو۔ وہ تمہارے تمام مسائل کا کفیل ہو جائے گا اور دوسروں کی یاد اور ان کی رضا کی طلب سے دست کش ہو جاؤ معرفت کا دروازہ تم پر کھل جائے گا۔ مولا کریم سخی ہے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو ہر مشکل میں اسی کو پکارو ہر دکھ میں اسی کو یاد کرو طمع کرو تو اس سے ڈرو تو اس کی نافرمانی سے ڈرو۔ وہ راضی تو جگ راضی۔ وہ ناراض تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری مشکل کو آسان نہیں کر سکتی۔"

دکھ بانٹنا ــــ سب سے بڑی عبادت

جنازہ حاضر تھا اور اس کے ساتھ اس کے ورثاء اور دوسرے بہت سارے حضرات بھی موجود تھے۔ انتظار تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائیں، تو نمازِ جنازہ کے بعد لوگ میت کو اس کی آخری منزل تک پہنچا دیں۔ اتنے میں آپ نمودار ہوئے بالکل اسی طرح جس طرح بدلی پھٹ جائے اور چاند نکل آئے، لوگوں نے جلدی جلدی جنازہ کو قبلہ کی طرف رکھ دیا اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ جنازہ کی نماز پڑھا دیں حسبِ عادت آپؐ نے دریافت فرمایا "اس میت پر کوئی قرض تو نہیں ہے؟ لوگوں نے عرض کیا، میت مقروض ہے، آپؐ نے فرمایا "اس نے ترکے میں کوئی ایسی چیز چھوڑی ہے جس سے قرض ادا کیا جا سکے؟" لوگوں نے کہا "نہیں"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا "تم لوگ اس کی نمازِ جنازہ ادا کر لو، میں نہیں پڑھا سکتا"۔ نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار میت کے لیے بدنصیبی کی بات تھی۔ کیونکہ یہ نماز پڑھانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، رحمۃ للعالمینؐ تھے شفیعِ محشر تھے محبوبِ داور تھے۔ ایسے تھے کہ جس کے جنازے کی نماز پڑھا دیں اس کی مغفرت یقینی تھی۔ حاضرین پر سناٹا چھا گیا اور میت کے ورثاء غم واندوہ کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے میت کا بیٹا بہت غریب آدمی تھا۔ اس میں اس بات کی طاقت نہیں تھی کہ وہ قرض کے اتنے بڑے بار کو اٹھا لیتا۔ اپنی محرومی کے تصور سے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور قطراتِ اشک ٹپ ٹپ زمین پر گرنے لگے۔ اس کے قریب ہی شیرِ خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے تھے اس کا یہ حال دیکھ کر حضرت علی مرتضیٰؓ سے رہا نہ گیا۔ عرض کی "یا رسول اللہؐ! ازراہِ کرم اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں۔ اس کے سارے قرض کی ذمہ داری میں اٹھاتا ہوں۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ خدا کے لیے اس میت کو اپنی دعائے مغفرت سے محروم نہ فرمائیں"۔ تب آپ آگے بڑھے اور آپؐ نے نماز پڑھا دی۔ اس کے بعد

جنابِ علیؓ کی طرف رخ کر کے ارشاد فرمایا "اے علیؓ! اللہ تجھے جہنم کی آگ سے بچائے اور اسی طرح تیری بھی جان بخشی ہو جس طرح تو نے اپنے اس مسلمان بھائی کے قرض کی ذمہ داری اٹھا کر اس کی جان چھڑائی ہے۔ مومن کا دکھ بانٹ لینا اور یاس و حرماں کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کی دست گیری کرنا بہت بڑی عبادت ہے عبادت صرف چند مخصوص طریقوں سے چند فرائض اور واجبات کو ادا کر دینا ہی نہیں ہے سب سے بڑی عبادت دکھی دل کو سکھ پہنچانا گرتے ہوؤں کو سنبھال دینا اور کسی کے بوجھ کو اتار دینا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قرض لینے کے بعد جو آدمی قرض کو ادا کرنے کی نیت رکھے اللہ تعالیٰ اس کے قرض کی ادائیگی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ شاید حضرت علیؓ کی طرف سے قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اٹھانا اسی کی قدرتِ کاملہ کا کوئی مظاہرہ ہو گا۔

غیبت کی مذمت

خواب اتنا بھیانک تھا کہ جناب میمون رحمۃ اللہ علیہ ڈر کر جاگ گئے۔ طہارت کی حالت میں سوئے تھے اور سونے سے پہلے کے جتنے معمولات ہوتے ہیں انہوں نے ان تمام کو پورا کیا تھا تین مرتبہ آیت الکرسی بھی پڑھی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سونے سے پہلے کی دعا منقول ہے وہ بھی پڑھی تھی دائیں کروٹ بھی سوئے تھے اور سوتے وقت سنت کے مطابق اپنا داہنا رخسارہ داہنی ہتھیلی پر بھی رکھا تھا پھر آخر اتنا بھیانک خواب کیوں دیکھا۔ لیکن جناب میمون رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ کا یہ خاص فضل ہوا کہ خواب ہی میں انہیں بتا دیا گیا کہ یہ خواب ان کے کس عمل کی وجہ سے دکھایا گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر نظرِ کرم رکھتا ہے ان کی نگرانی بھی کڑی کرتا ہے تاکہ وہ آخرت کے مواخذے سے بچ جائیں اور فوراً اپنی غلطی پر متنبہ ہو

جائیں جناب میمونؒ اپنے دور کے بہترین عالم اور عظیم محدث تھے۔ تقویٰ اور پارسائی ان کے خمیر میں شامل تھی نہایت احتیاط سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فرائض تو فرائض نوافل کی بھی پابندی کرتے تھے اور اکل حلال کے معاملے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک حبشی کی لاش پڑی ہوئی ہے اور کوئی کہنے والا ان سے کہہ رہا ہے کہ چھری اٹھاؤ اور اس کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھاؤ میمونؒ نے کہا بندۂ خدا! تم کیا باؤلے ہو گئے ہو میں مرے ہوئے انسان کا گوشت کھاؤں گا۔ اس نے کہا ہاں تمہیں کھانا پڑے گا۔ کیونکہ آج دن میں تم نے فلاں شخص کے حبشی غلام کی غیبت کی۔ میمونؒ نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور فرمایا اللہ کے بندے تو کیسی بات مجھ سے کہتا ہے میں نے تو اس حبشی غلام کے متعلق کوئی اچھی یا بری بات کی ہی نہیں۔ یہ تو ایک تہمت ہے جو تو مجھ پر لگا رہا ہے اس شخص نے کہا کہ ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو کہ تم نے اس حبشی غلام کے بارے میں کچھ نہیں کہا لیکن تم نے اس کی غیبت تو سنی ہے اور تم نے اس غیبت کرنے والے کو منع نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس پر راضی رہے ہے۔ یہ سب کچھ جو تمہیں دکھایا جا رہا ہے اس غیبت کے سننے کی وجہ سے ہے۔ حضرت میمون رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھل گئی جسم پسینے سے شرابور تھا عہد کیا کہ آئندہ نہ کبھی غیبت کروں گا اور نہ کبھی سنوں گا۔ اس واقعے کے بعد سے ان کا معمول بن گیا تھا کہ کسی کو اپنی مجلس میں غیبت نہیں کرنے دیتے تھے نہ خود کبھی غیبت کیا کرتے تھے۔

چونکہ قلب سلیم تھا اور حق کو قبول کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا اس لیے صرف ایک خواب نے جناب میمون رحمۃ اللہ علیہ کو اس طرح چونکایا کہ ساری زندگی راہِ مستقیم پر قائم رہے۔

ایمان کی حقیقت

ایمان کا سب سے پہلا اثر جو ایک مومن کا دل قبول کرتا ہے وہ حسد اور بغض سے بیزاری ہے اس لیے کہ نورِ ایمان سے منوّر سینے میں بدی و بدخواہی کی تاریکی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے مومن ہر حال میں نہ صرف مومن کا بلکہ سارے عالم انسانیت کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ کسی کو دولت یا عزت دے تو اس کی عزت و دولت دیکھ کر مومن کو خوشی حاصل ہوتی ہے کیونکہ اگر کسی کو خوشحال اور کامران دیکھ کر حسد کرے تو کس بنیاد پر حسد کرے کیا وہ خدا کی تقسیم پر اعتراض کر سکتا ہے؟ خواجہ حسن بصریؒ نے فرمایا ہے کہ "اے ابنِ آدم! تو اپنے بھائی سے حسد کیوں کرتا ہے۔ اللہ نے جو کچھ اسے دیا ہے اگر وہ اس کا فضل و کرم ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو نوازنا چاہتا ہے اور اگر وہ اللہ کا فضل و کرم نہیں تو لازماً وہ ایک نہ ایک دن جہنم کا ایندھن بنے گا تو اس کے اس انجام پر تجھے حسد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حسد اصل میں کسی اچھے حال میں رہنے والے انسان کی تباہی کی آرزو کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ عمل وہی آدمی کر سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ نعمت والے کو نعمت اللہ نہیں دیتا اور اگر وہ یہ جانتا ہے کہ نعمت دینا اور نعمت چھین لینا، عزت دینا اور ذلت کے گڑھے میں گرا دینا یہ صرف اور صرف اللہ کا کام ہے تو بندہ کبھی بھی کسی پر حسد نہیں کرے گا۔

اہلِ ایمان کو انتقام پر قادر ہونے کے باوجود معاف کر دینے میں جو لذت محسوس ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر شخص کو نہیں ہوتا، اس کا صحیح اندازہ انہیں کو ہوتا ہے جن کی نظر میں بغض رکھنا اللہ کی رحمت سے دور ہونے کے برابر ہو۔ ایمان کی ساری حقیقت محبت ہے اللہ کے ساتھ محبت اور اسی حوالے سے اللہ کے بندوں کے ساتھ محبت۔ محبت ہے تو ایمان ہے محبت نہیں ایمان نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری حیاتِ طیبہ میں محبت ہی کا درس دیا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک

دوسرے کے خون کے پیاسے آنِ واحد میں شیر و شکر ہو جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت و کردار کی ڈیسمی۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے قلب و نظر کو اس طرح گرمایا کہ انہوں نے ماضی کی تمام تلخیاں فراموش کر دیں ہمیشہ اپنے آرام پر اپنے مسلمان بھائی کے آرام کو ترجیح دی۔ خود پیاسا مرجانا گوارہ کیا لیکن یہ پسند نہ کیا کہ قریب سے العطش العطش کی آواز آئے اور وہ خود پانی پی لیں۔ یہ ایثار و محبت کی جو داستانیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں یہی درحقیقت ہماری تاریخ کے عنوان ہیں اور ایسا آئینہ ہیں جن میں ہم اپنا چہرہ دیکھ کر خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہم ایمان کی کس منزل میں ہیں۔

قرض کی معافی

جب امامؒ کو اطلاع ملی، کہ ان کا فلاں دوست بیمار ہے تو ایک لمحے کا انتظار کیے بغیر عیادت کے لیے چل پڑے اور جاتے نہیں تو کرتے کیا۔ کوئی معمولی آدمی تو تھے نہیں کہ سنت و شریعت کو نظر انداز کر دیتے ساری زندگی شریعت کی تبلیغ اور اتباع سنت میں بسر کی تھی۔ امامؒ جانتے تھے کہ بیمار کی عیادت میں بے حد ثواب ہے یہاں تک کہ جب تک آدمی بیمار کے پاس بیٹھا رہتا ہے ہزارہا فرشتے عیادت کرنے والے کے لیے دعاءِ مغفرت کرتے رہتے ہیں۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان پر مسلمان کے حقوق کو بیان کرتے ہوئے یہ حق بتایا ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار پڑے تو اس کے بھائی کو چاہیے کہ اس کی بیمار پرسی کی جائے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ امامؒ ابو حنیفہ جیسے صاحب علم و فضل اس کی اہمیت سے ناواقف ہوتے۔ لہٰذا جونہی انہیں معلوم ہوا چل پڑے۔ راستے میں ایک شخص ملا۔ امام صاحبؒ نے اس کو دیکھا اور پہچان لیا مگر اس آدمی نے نظریں چرالیں اور کترا کر ساتھ والی گلی میں چلا گیا۔ امام ابو حنیفہؒ کو سخت تعجب ہوا، یہ تو میرا شناسا ہے، برسوں میرے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے آخر اسے کیا ہو گیا کہ آج مجھے دیکھ کر کترا کر نکل گیا۔ خیال فرمایا کہ ہو سکتا ہے میرے کسی رویے یا میری کسی بات سے اس کی دل آزاری ہوئی ہو

اور اس نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہو۔ اپنے حافظے پر زور دیا مگر ایسی کوئی بات ذہن میں نہ آئی، امامؒ نے سوچا کہ کیوں نہ میں پہل کروں اور اپنے اس دوست سے معافی مانگ لوں۔ روٹھا ہوا ہے تو منالوں جس گلی میں وہ مڑا تھا اس میں امام رحمۃ اللہ علیہ بھی مڑ گئے جا کے دیکھا کہ وہ ایک دکان پر کھڑا ہے اور امامؒ سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتا۔ قریب گئے اور اسے سلام کیا فرمایا "میرے بھائی! یہ تو بتا کہ ایسا کون سا غلط برتاؤ میں نے تیرے ساتھ کر دیا کہ تو مجھ سے ملنا نہیں چاہتا اور مجھے دیکھ کر تو نے راستہ کاٹ لیا" امامؒ کا سوال سن کر اس شخص کی آنکھوں سے آنسو آ گئے کہا کہ "امامؒ۔ آپ کیسی بات فرماتے ہیں بھلا میں آپ سے ناراض ہو سکتا ہوں، میرے جسم کا بال بال آپ کے احسان میں بندھا ہوا ہے۔ آپ نے ہر آڑے وقت میں میری دستگیری فرمائی ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آپ کے دس ہزار درہم مجھ پر قرض ہیں جنہیں میں آج تک ادا نہ کر سکا۔ اس شرم سے آنکھ برابر نہیں ہوتی اور میں آپ سے کترا کر نکل گیا تھا" امام ابوحنیفہؒ یہ جواب سن کر ہنسنے لگے فرمایا "میرے بھائی مومن کی محبت کے سامنے دس ہزار درہم کی کیا وقعت ہے میں نے وہ سب معاف کر دیا مجھ سے محبت کا رشتہ نہ توڑ کہ تیرے دل میں ایمان کا نور ہے میں تو اس نور کی قدر کرتا ہوں"۔

آدابِ دُعا

اگر دعا کے آداب و شرائط کا پوری طرح لحاظ رکھا جائے تو دعا مومن کا ناقابلِ شکست ہتھیار ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عمل بالکل چھوڑ دیا جائے اور صرف دُعا ہی پر اکتفا کر لیا جائے۔ جتنے ممکن اور مفید اسباب ہیں سب اختیار کیجئے عمل اور کوشش کے تمام ذرائع پوری تندہی سے استعمال کیجئے اور پھر اللہ تعالیٰ کے آگے دستِ دعا دراز کیجئے اور یقین رکھیے کہ وہی ہے جو عمل کا ثمرہ دے سکتا اور کوشش کو نتیجہ خیز بنا سکتا ہے۔ دعا کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی کا ظاہری جسم پاک اور صاف ہو اس کے

پیٹ میں نہ حرام غذا ہو اور نہ جسم پر وجہ حرام سے حاصل کیا ہوا لباس۔ دل میں عاجزی اور شکستگی اور بندہ پوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو کیونکہ حدیث میں ہے کہ غافل قلب کی دعا اللہ تعالیٰ نہیں قبول کرتا۔ اول پاک جگہ پر قبلہ رو ہو کر بیٹھے پھر استغفار کرے۔ اس کے بعد دستِ دعا دراز کرے اللہ تعالیٰ کی حمد پڑھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور انتہائی عاجزی اور لجاجت کے ساتھ اپنی بے بسی و بے کسی کا اظہار کرے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا تصور کرے اپنی معروضات پورے وثوق اور یقین کے ساتھ اس کے حضور میں پیش کرے۔

مسلم شریف کی حدیث میں ہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ بندہ سب سے زیادہ سجدے کی حالت میں اللہ کے قریب ہوتا ہے اس لیے جب تم سجدے میں رہو تو کثرت سے دعا کیا کرو۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ دعا کرنے میں جلد بازی نہ کیا کرو یعنی یہ سوچ کر کہ اتنے دنوں سے دعا کر رہا ہوں میری دعا قبول ہی نہیں ہوتی دعا کرنا نہ چھوڑے کیونکہ دعا بذاتِ خود عبادت ہے۔ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے اگر کوئی آدمی نماز پڑھے اور دعا نہ مانگے تو اللہ تعالےٰ اس کے عمل کو سخت ناپسند فرماتے ہیں اور فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے دعا نہیں مانگی اس لیے اپنی نماز بھی لے جا میں تیری نماز کا محتاج نہیں ہوں۔ ترمذی شریف میں ہے کہ صحابہ کرام نے ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر وقت دعا کی قبولیت کا کونسا وقت ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا رات کا آخری حصہ اور فرض نمازوں کے بعد۔ ایک حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی بندۂ مومن دعا کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتا یا تو اس کی طلب کی ہوئی چیز اسے دے دیتا ہے اور اگر وہ چیز اس کے حق میں بہتر نہ ہو تو اس کے بدلے میں کوئی آنے والی بلا اس سے ٹال دیتا ہے یا پھر اس دعا کو اس کی آخرت کے لیے ذخیرہ کر دیتا ہے اور اس کے نتائج و ثمرات آخرت

ہیں ظاہر ہوں گے۔ مسافر، مظلوم، غائب آدمی کی دعا غائب کے لیے، والدین کی دعا اولاد کے حق میں مقبول ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کبھی اپنے یا اپنی اولاد یا اپنے مال و متاع کے حق میں بد دعا نہ کیا کرو کیونکہ ممکن ہے کہ جس ساعت میں تم دعا کر رہے ہو وہی قبولیت کی ساعت ہو۔ دعا کے اخیر میں درود شریف ضرور پڑھنا چاہیے۔

ذکرِ الٰہی

ماہر طبیبوں نے عروہ ابن زبیرؓ کے پیر کا معائنہ کرنے کے بعد جو فیصلہ دیا اسے سنکر سوائے عروہؓ کے تمام اہلِ خاندان کے دل دہل گئے۔ مگر عروہؓ کے چہرے پر بدستور سکون تھا طبیبوں نے کہا کہ ان کے ایک پیر میں ایسی بیماری ہے کہ اگر اسے نہ کاٹا جائے تو ان کی ہلاکت یقینی ہے۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ زندہ رہیں تو ہمارا مشورہ یہی ہے کہ ان کا ایک پیر کاٹ دیا جائے۔

بال بچے روتے رہے۔ لیکن جناب عروہؓ نے بخوشی اپنا پیر آرے کے نیچے رکھ دیا۔ پیر کاٹنے سے پہلے جراحوں نے ایک دوا پلانا چاہی عروہؓ نے پوچھا کہ یہ دوا کیوں پلا رہے ہو؟ جراح نے کہا کہ یہ ایک قسم کی بے ہوشی کی دوا ہے اس کا فائدہ یہ ہے کہ پیر کٹنے میں جو تکلیف ہوتی ہے وہ آپ کو نہیں ہوگی۔ آپ کا شعور معطل ہو جائے گا اور ہم اپنا کام کر لیں گے۔ جناب عروہؓ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا شخص جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو وہ ایسی دوا پی سکتا ہے کہ اس کا شعور معطل ہو جائے اور وہ ہر چیز کو بھول جائے کیا اس وقت جب کہ میں دوا پینے کے بعد بے ہوش ہو جاؤں گا اللہ کو بھی بھول نہیں جاؤں گا؟ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آئیے اور میرا پاؤں کاٹ دیجیے میں ہوش و حواس میں رہوں گا اور اپنے رب کو یاد کرتا رہوں گا۔

"چنانچہ ٹخنے سے آپ کا پاؤں کاٹ دیا گیا اور آپؓ خاموشی سے دیکھتے رہے۔ نہ

تو لبِ جبیں کا اظہار کیا نہ چیخ پکار کی مگر آزمائش کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا عروہؒ کے سات بیٹے تھے جس دن ان کا پیر کاٹا گیا اسی شب ان کا عزیز ترین بیٹا چھت سے گر کر ہلاک ہو گیا، مگر عروہؒ کے ہاتھوں سے صبر و ضبط کا دامن نہ چھوٹا۔ آنکھیں بہہ رہی تھیں لیکن زبان پر آہ و فغاں نہ تھی۔ لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ فرمایا "یا اللہ تیرا شکر ہے میرے سات بیٹے ہیں تو نے صرف ایک ہی لیا ہے، اور باقی میرے پاس رہنے دیے ہیں۔ یا اللہ! تو نے مجھے دو ہاتھ اور دو پاؤں دیے تھے۔ میرا ایک پاؤں کاٹ دیا گیا لیکن میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے دو ہاتھ اور ایک پاؤں ابھی بھی میرے پاس چھوڑ دیے ہیں میرے مالک میری یہ سات اولاد تو نے ہی دی تھی میرے یہ ہاتھ اور پاؤں تو نے ہی بخشے تھے۔ ان کا مالک تو تھا تو نے جو چیزیں لے لیں تو ان کا حقدار تھا کہ یہ تیری ہی عطا کردہ تھیں۔ آزمائش تیری طرف سے آئی ہے تو عافیت سے بھی تو نے ہی نواز رکھا تھا یہ تو بہت ناشکری کی بات ہے کہ آدمی آزمائش کی گھڑی میں عافیت کے زمانے کو فراموش کر دے اور میں تیرا ناشکرا بندہ نہیں بن سکتا۔ بندہ ہوں بندہ رہوں گا۔ بس تجھ سے صرف ایمان اور استقامت کا سوال کرتا ہوں۔

مصیبت میں صبر و شکر

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو اولیاء اللہ میں جو با عزت مقام حاصل ہے صدیوں سے بزرگانِ دین اس کا اعتراف کرتے آئے ہیں آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے آپ نے نہایت پاکیزہ بچپن اور بے داغ جوانی گزاری ہزار ہا کفار و مشرکین نے آپ کے دستِ حق پر اسلام قبول کیا اور لاکھوں گم کردہ راہ فاسق و فاجر آپ کی تربیت سے ولایت و بزرگی کے اعلیٰ منازل پر فائز ہوئے۔ آپ کی مجلس میں ہزار ہا افراد کا اجتماع ہوتا اور کوئی ایک فرد بھی مجلس سے خالی ہاتھ

نہ اٹھنا اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبانِ مبارک کو ایسی تاثیر بخشی تھی کہ بعض اوقات آپ کے مواعظ سن کر چند لوگوں کا دم نکل جاتا تھا۔ ایک دن آپ نے ارشاد فرمایا: تو مصیبت پر صبر کرنا تو عورتوں اور کم ہمتوں کا کام ہے مرد تو صبر پر شکر ادا کرتے ہیں۔ اس جملے پر بعض حضرات کے دل میں خلجان پیدا ہوا کہ مصیبت میں کس طرح شکر کیا جا سکتا ہے؟ کسی میں ہمت نہ تھی کہ آپ سے یہ سوال کرتا لیکن آپ کے صاحبزادہ گرامی سید عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ چونکہ آپ کے بہت قریب رہا کرتے تھے اور کسی قدر آپ سے آزادانہ گفتگو کر لیتے تھے انہوں نے تنہائی میں والد بزرگوار سے دریافت کیا حضور! اس کا کیا مطلب ہے کہ مرد تو مصیبت پر شکر ادا کرتے ہیں مصیبت پر کس طرح شکر کیا جا سکتا ہے۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا تو نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص کے ایک کانٹا چبھتا ہے اس کا ایک گناہ معاف ہو جاتا ہے اور ایک نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے جس کو ایک روز بخار آتا ہے اس کے ایک سال کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ تو تیرے خیال میں کیا یہ شکر کا مقام نہیں؟ کہ بندہ ایک دن مصیبت اٹھا لے اور بخار کی اذیت سہہ لے اور ایک سال کے گناہ معاف ہو جائیں۔ بندہ جب دکھ میں ہوتا ہے تو اس کے دل میں گداز ہوتا ہے اور گداز مولا کی توجہ کو بندے کی طرف مائل کرتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مریض کی عیادت کو جاؤ تو اس کی صحت یابی کے لیے دعا کرو اور اس سے اپنے لیے دعا کراؤ۔ کیونکہ وہ دکھ کی وجہ سے اللہ کے قریب ہوتا ہے۔ دکھ طلب نہیں کرنا چاہیے لیکن اگر آ جائے تو صبر و شکر کے ساتھ اسے برداشت کر لینا چاہیے کہ شاید اسی میں بندے کی بھلائی ہو۔

اخلاص کی برکت

جامع مسجد دمشق کے متولی کے مال و دولت کو دیکھ کر کمزور ایمان والا شاید ہی کوئی شخص

اپنے آپ کو سنبھال سکتا۔ متولی کی طرف لوگوں کا بڑا رجوع تھا اور وہ عبادت گزار بھی تھا نذر و نیاز کے ڈھیر اس کے سامنے پڑے رہتے۔ ایک شخص نے اس کی جو یہ حالت دیکھی تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تم بھی دکھاوے کی عبادت کرو لوگوں پر اپنے تقویٰ اور طہارت کا رعب ڈالو تو تمہاری طرف بھی لوگوں کا اسی طرح رجوع ہو جائے گا۔ پہلے تو صوفی اللہ کے لیے تھوڑی بہت عبادت کر لیتا لیکن شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے بعد وہ ہر ایسے مقام پر اور ہر ایسے وقت میں عبادت میں مشغول ہوتا کہ آنے جانے والوں کی نظر اس پر پڑے مگر کسی قسم کا رجوع شروع نہ ہوا اور جیسا وہ پہلے قلاش تھا اسی طرح قلاش رہا۔ ایک رات اللہ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہوئی اور اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں بھی کتنا ناپاک اور گندہ ہوں کہ عبادت تو کرتا ہوں خدا کی اور رضامندی طلب کرتا ہوں خلقِ خدا کی۔ میرے تو یہ سارے نوافل اور ساری تلاوت اور شب بیداری ضائع ہو گئی "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" اس خیال کا آنا تھا کہ احساسِ ندامت کے باعث اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور سربسجود ہو کر بارگاہِ خداوندی میں خلوص دل سے توبہ کی اور وعدہ کیا کہ بارالہا! آئندہ صرف تیری رضا کے لیے عبادت کروں گا توبہ قبول ہوئی اور صوفی خلوص دل کے ساتھ عبادتِ خداوندی میں مصروف ہو گیا۔ اس مرتبہ اس نے کوئی ریاکاری نہیں کی نہ اس نے کسی کو اپنی عبادت دکھانا چاہی لیکن پندرہ دن بھی نہ گزرے کہ دمشق کا حاکم انتہائی عقیدت کے ساتھ اس سے ملنے آیا ملاقات کر کے جب رخصت ہونے لگا تو اس نے اشرفیوں کے چند توڑے اور جامع دمشق کی تولیت کی دستاویز صوفی کی خدمت میں پیش کی اور عرض کیا کہ آپ اسے قبول فرمالیں مگر نیت کے خلوص نے صوفی کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں انسان کی نگاہ میں پتھر اور سونا برابر ہو جاتے ہیں اس نے حاکم سے کہا محترم آپ کا بہت بہت شکریہ مگر میں نے تو اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ جو کچھ لوں گا اسی سے لوں گا اور کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کروں گا مہربانی کر کے یہ ساری چیزیں اٹھا لے جاؤ۔

کھوٹ سے پاک سینہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی شخص کے بارے میں یہ فرما دینا کہ یہ جنتی ہے، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اگر آپ ایک مرتبہ بھی کسی کو جنتی کہہ دیں تو یقیناً وہ جنتی ہوتا ہے مگر اس انصاری کو تو آپؐ نے ۳ مرتبہ فرمایا کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک جنتی آئے گا۔ اور ہر مرتبہ وہی انصاری آتا رہا۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ پتہ چلاؤں آخر وہ انصاری ایسا کونسا عمل کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۳ بار اسے جنتی کے نام سے یاد کیا۔ میں انصاری کے پاس گیا اور میں نے ان سے کہا، کہ میں اپنے گھر سے روٹھ کر چلا آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کچھ دن آپ کے ساتھ گزاروں۔ اگر آپ میرے میزبان بننا گوارا فرمائیں تو میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں گا۔ انصاری میری درخواست سن کر کھل اٹھے۔ فرمایا، سر آنکھوں پر جب تک آپ کا جی چاہے آپ میرے گھر میں قیام فرمائیں۔ میں تین دن اور تین رات ان کے ساتھ رہا۔ صبح کو نماز فجر کے بعد وہ کھیتوں میں نکل جاتے اور دن بھر محنت مزدوری کرتے۔ سوائے اس کے میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ کہ جب اذان ہوتی تو کام چھوڑ کر وہ نماز میں شریک ہوتے عشاء کی نماز کے بعد جو بھی روکھا پھیکا میسر آتا میرے ساتھ کھاتے اور سو رہتے۔ میں نے رات میں ان کو نفل پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ البتہ اتنا تھا کہ رات میں جب بھی کروٹ بدلتے تو اللہ اکبر بے ساختہ ان کی زبان سے نکل جاتا یہاں تک کہ مؤذن فجر کی اذان دیتا۔

اذان سنتے ہی وہ بستر چھوڑ دیتے اور مجھ سے کہتے محترم مہمان نماز کے لیے چلئے۔ تین دنوں کے اندر اندر میں ان کے عمل کو بہت کمتر سمجھنے لگا۔ لیکن اس سارے عرصے میں میں نے سوائے بھلی بات کے ان کے منہ سے کوئی بری بات نہیں سنی۔ تیسرے دن میں نے ان سے عرض کیا، بندۂ خدا! میں گھر سے روٹھ کر نہیں آیا تھا بلکہ میں تو یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کا وہ کونسا عمل ہے جس کے سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

تین مرتبہ آپ کو جنتی کہا، انصاری نے جواب دیا کہ میرے بھائی بس وہ یہی عمل ہے جو تم نے دیکھا البتہ ایک بات اور ہے کہ میرے دل میں کسی مسلمان کی طرف سے کوئی کھوٹ ہے نہ حسد میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مسلمان کو جو دیا ہے اس کا فضل ہے اور کسی پہ اگر اللہ کا فضل ہو تو اسے دیکھ کر جلنا اور کڑھنا گویا اللہ کے فضل پر اعتراض کرنا ہے شاید میرے اس عمل کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی ہے۔

عمل کا بدلہ

خیر المجالس میں حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عورت کا خواب درج کیا ہے اس کے والدین وفات پا چکے تھے اس نے عجیب خواب دیکھا اور گھبرائی ہوئی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئی کہا کہ سیّدہ! میرے والدین وفات پا چکے ہیں میں نے گذشتہ شب ایک بھیانک خواب دیکھا کہ حشر کا میدان ہے اور میں چلی جا رہی ہوں چلتے چلتے مجھے دو پگڈنڈیاں نظر آئیں ہیں میں ایک پگڈنڈی پہ چلنے لگی آگے چل کر میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا حوض ہے اور اس حوض پر میرا والد کھڑا ہوا خود بھی پانی پی رہا ہے اور آنے جانے والوں کو بھی پلا رہا ہے میں نے حوض کے مجمعے پر غور کیا تو اس میں کافی تعداد میں میرے اہلِ خاندان تھے مگر یہ دیکھ کر میں سخت مایوس ہوئی کہ اس مجمعے میں میری والدہ نہیں تھی میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ اماں کہاں ہے؟ انہوں نے فرمایا پتہ نہیں کہاں ہے میرے ساتھ تو نہیں ہے شاید وہ کسی دوسری طرف چلی گئی ہو۔ والد کے اس جواب نے مجھے اور زیادہ بے چین کر دیا میں نے تھوڑا سا پانی پیا برف سے زیادہ ٹھنڈا شہد سے زیادہ میٹھا اور میری پیاس بجھ گئی اب میں دیوانہ وار اس جم غفیر میں اپنی والدہ کو ڈھونڈنے لگی کافی دور جانے کے بعد میں نے اپنی والدہ کو دیکھا

کہ وہ ایک حوض کے کنارے کھڑی ہے پیاس سے اس کی زبان باہر آرہی ہے لیکن پانی نہیں پی سکتی پوچھا ماں! جب تو اتنی پیاسی ہے حوض ہے پانی ہے اور آب خورہ ہے تو پانی کیوں نہیں پیتی؟ ماں نے جواب دیا کہ بیٹی میں تو کوشش کر رہی ہوں کہ آب خورہ اٹھا کر پانی پی لوں مگر میرا ہاتھ ہی حوض تک نہیں پہنچتا۔ میں نے کہا ٹھہر جائیں تجھے پلا دیتی ہوں میں نے جو آب خورے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد میری آنکھ کھل گئی آنکھ کھلتے ہی میں سخت پریشان ہو گئی اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ آپ اس کی تعبیر بتائیں اتنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ خواب آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے فرمایا عائشہ! اس عورت سے دریافت کرو کہ اس کے والدین کا کردار کیا تھا؟ عورت نے بتایا کہ میرا باپ بہت سخی تھا اور اللہ کی راہ میں خوب خرچ کیا کرتا تھا اور اس بات پر میری والدہ اس سے لڑتی جھگڑتی تھی تو سرکارؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کو اس کے عمل کا بدلہ مل کر رہتا ہے عورت کے والد کو اس کے عمل کا بدلہ اور اس کی والدہ کو اس کے عمل کا بدلہ۔

آدمی کی پہچان

جب گواہ اپنی گواہی ختم کر چکا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کسی ایسے آدمی کو لے آؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو تاکہ اس سے تمہارے بارے میں دریافت کروں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ایک شخص کو لے کر آیا فاروق اعظمؓ نے اس سے دریافت فرمایا تم ان کو جانتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔ یہ بہت اچھے آدمی ہیں پھر دریافت کیا کیا تم ان کے قریب ترین پڑوسی تھے؟ اس نے کہا نہیں پوچھا کیا تم نے کبھی ان کے ساتھ سفر کیا کہ تمہیں انکی اخلاقی حالت کا علم ہوا اس نے کہا نہیں۔ سیدنا فاروق

اعظمؓ نے پھر دریافت فرمایا کبھی تم نے ان کے ساتھ کوئی لین دین یا کوئی روپے پیسے کا معاملہ کیا؟ کہ تمہیں ان کے حسنِ معاملہ اور کھرے پن کا علم ہوا ہو۔ اس نے کہا نہیں تب فاروق اعظمؓ نے فرمایا میرا خیال ہے کہ تم نے اس گواہ کو مسجد میں دیکھا ہوگا کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے کبھی سجدہ کرتے ہوئے کبھی رکوع کرتے ہوئے اس کی عبادت و ریاضت و ذکر و اذکار کو دیکھ کر تم نے سمجھا ہوگا کہ یہ بہت متقی اور پرہیز گار آدمی ہے اور تم اس کے بارے میں میرے سامنے شہادت دینے چلے آئے اس نے کہا جی ہاں میں نے جب بھی اسے دیکھا تو ذکرِ الٰہی میں غرق پایا میرا خیال ہے کہ یہ دیندار اور متقی آدمی ہے۔ فاروق اعظمؓ نے فرمایا تم جاؤ میرا خیال ہے کہ تم اسکو نہیں پہچانتے کسی انسان کو پہچاننے کا معیار صرف یہی نہیں ہے کہ وہ کس قدر صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے اور کتنا وقت مسجد میں لگاتا ہے آدمی تو دراصل اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ اس کا برتاؤ اپنے اہل و عیال اور پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہے کس طرح لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے سفر میں اپنے رفیقِ سفر کے ساتھ اس کا اخلاق کیسا ہوتا ہے آیا وہ صرف اپنے ہی آرام و آسائش کی فکر کرتا ہے یا اس میں ایثار کا جذبہ بھی ہے۔ معاملات میں وہ کیسا ہے اگر آدمی بظاہر بہت ہی متقی اور پرہیز گار ہو لیکن معاملات میں کھوٹا ہو برتاؤ میں تلخ ہو معمولی سی بات پر بھڑک اٹھے اور بے ساختہ اس کے منہ سے نازیبا کلمات نکلنے لگیں حقوق العباد کا خیال نہ کرے کسی کی رقم مار لے اور کسی کو دھوکا دینے میں اسے عار نہ ہو تو اس کا سارا صوم و صلوٰۃ اور ظاہری تقویٰ و طہارت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اور بارگاہِ خداوندی میں اسے کبھی بھی پذیرائی حاصل نہ ہوگی۔ فاروق اعظمؓ گواہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا جا کسی ایسے آدمی کو لے کر آؤ جو تجھے صحیح معنوں میں پہچانتا ہو۔

مسلمان عورت کی شرم وحیاء

غزوہ ختم ہوچکا تھا اور شہداء کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ شہداء کے ورثاء اپنے اعزہ کی لاشوں کی تجہیز وتکفین کے لیے جمع تھے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت ہی غمزدہ تھے کیونکہ مشرکین نے بہت سی لاشوں کا مثلہ کر دیا تھا یعنی آنکھیں نکال لی تھیں، کان کاٹ دیے تھے، ناک کاٹ دی تھی اس طرح جو وہ کر سکتے تھے انہوں نے جی بھر کر کیا تھا۔ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ اس سارے مجمعے میں کسی نے اپنے باپ کو کھو دیا تھا کسی نے اپنے بھائی کو کسی نے اپنے بیٹے کو اور کسی نے اپنے شوہر کو۔ مگر نہ آہ و فغاں کی صدا بلند ہو رہی تھی نہ بین کیے جا رہے تھے البتہ آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ یہ فطری تقاضا ہے اور اسلام میں اس کی ممانعت نہیں البتہ بین کر کے رونے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا۔ آپ نے تو یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی ہوتا جوان بین کر کے رونے والیوں کے منہ میں مٹی بھر دیتا۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ بین کر کے رونے سے میت کی روح کو تکلیف پہنچتی ہے اس لیے اگر کہیں یہ واقعہ ہو جائے تو بین کر کے رونا نہیں چاہیے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی حکم کے تحت میدانِ جنگ میں کافی لوگ موجود تھے اور سب غمزدہ تھے لیکن آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجمع جمع تھا کہ لوگوں نے دیکھا کہ سیاہ برقعہ اوڑھے ہوئے مامتا کی ماری ایک عورت قتل گاہ کا چکر لگا رہی ہے اور شہیدوں کے چہروں کو غور سے دیکھ رہی ہے ایک لاش کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئی جھک کر چہرہ دیکھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی کہ اس کے بیٹے کی لاش تھی۔ کڑیل جوان گورا چٹا تندرست، توانا زخموں سے چور شاید بدن کا کوئی ایسا حصہ نہ تھا جس پر زخم نہ لگے ہوں اور خون نہ رِس رہا ہو۔ یہ لاش حضرت خلاد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تھی ماں سرہانے بیٹھی خاموش آنسو بہا رہی تھی تھوڑی دیر تک دیکھنے کے بعد مجمع کی طرف چلی گئی مجمع کے قریب پہنچ

پوش بھی کھڑی ہو گئی غم سے رنجور مگر راضی برضائے الٰہی دل میں اس بات پر خوش اور مطمئن کہ میرا بیٹا دین اسلام کی نصرت میں کام آیا اور اس کا خون بھی شہدائے اسلام کے خون کے دھارے میں شامل ہو گیا۔ کسی نے بتایا کہ یہ اُمّ خلّادؓ ہے ایک شخص نے اس سر سے لے کر پیر تک برقع میں لپٹی ہوئی اس عورت کو دیکھ کر کہا کہ تعجب ہے اس عورت پر کہ اس کا بیٹا شہید ہو چکا ہے مگر اس حالت میں بھی یہ پردے کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حضرت اُمّ خلّاد رضی اللہ عنہا نے تڑخ کر جواب دیا اے شخص! میں نے بیٹا کھویا ہے مسلمان عورت کی شرم حیا تو نہیں کھوئی ہے۔

اسلامی شادی

حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ اگر پریشان تھے تو بے وجہ پریشان نہیں تھے کیونکہ ان کے درس میں شریک ہونے والا وہ طالب علم کبھی بھی غیر حاضر نہیں ہوتا تھا اور ادھر وہ ایک ہفتے سے غائب تھا ان کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے نہ معلوم بیچارے کو کوئی حادثہ پیش آگیا یا بیمار ہے اس کا کچھ اتہ پتہ بھی نہیں تھا کہ کسی دوسرے شاگرد کو بھیج کر اس کی خیریت معلوم کرواتے اس زمانے میں استاد اپنے طالب علموں کو صرف درس دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے روز و شب کے معمولات ان کے گھریلو حالات اور ان کی صحبتوں سے بھی باخبر رہتے تھے کیونکہ اسلام میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی رکھی گئی ہے۔ انسان چاہے کتنی ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کیوں نہ کر لے اگر تربیت صحیح نہ ہو تو زندگی بھر اجڈ اور گنوار رہتا ہے اور علم کا نور صحیح معنوں میں اس کے قلب و نظر کو منور نہیں کر پاتا وہ عالم تو بن جاتا ہے انسان نہیں بن پاتا اور ہر شخص جانتا ہو گا کہ انسان بننا بہت مشکل ہے۔

سعید بن مسیبؒ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے اس لیے جب پورا ایک ہفتہ گزر گیا اور ان کا وہ شاگرد نہیں آیا تو کچھ بے چین سے ہو گئے مگر اتفاقاً دوسرے دن جب درس میں آئے تو دیکھا کہ وہ طالب علم بیٹھا ہوا ہے بڑا غم زدہ اور بہت ہی پریشان حال دریافت کیا "بھائی! تو ایک ہفتہ کہاں تھا"؟ اس نے کہا "حضرت! میری بیوی کی وفات ہو گئی تھی میں اس کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہا تعزیت کے لیے لوگ آئے ہوئے تھے اس لیے حاضر نہ ہو سکا" دریافت فرمایا "اب کیا ارادے ہیں؟ دوسری شادی نہیں کرو گے"؟ طالب علم نے جواب دیا "حضرت! مجھ فقیر قلاش اور مفلوک الحال آدمی کو بھلا کون رشتہ دے گا؟ دن بھر پڑھائی کرتا ہوں رات میں مزدوری کرتا ہوں" طالب علم جب یہ کہہ رہا تھا تو سعید بن مسیبؒ کے ذہن میں اپنی اکلوتی عالمہ فاضلہ حسین و جمیل اور نہایت صالح بیٹی کا تصور گردش کر رہا تھا جس کا پیغام شاہزادے نے دیا تھا مگر سعید بن مسیبؒ نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا تھا کہ شہزادہ تقویٰ کے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو میں چاہتا ہوں۔ حضرت سعید بن مسیب نے جو اس طالب علم کو اچھی طرح جانتے تھے اسے مخاطب کر کے فرمایا "میری بیٹی سے شادی کرو گے"؟ طالب علم تو بھونچکا ہو گیا کہا "حضرت! کیا یہ ممکن ہے"؟ فرمایا کہ "ہاں"۔ طلبہ کو جمع کیا ایجاب و قبول ہوا اور نکاح ہو گیا سعید بن مسیبؒ سوائے مسجد کے کسی کے گھر نہیں جاتے تھے مگر رات کو بیٹی کو ساتھ لیا اور طالب علم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرمایا یہ تمہاری زوجہ کو ساتھ لایا ہوں اب یہ اس گھر میں موت تک زندگی گزارے گی۔ نہ رسم مہندی نہ جہیز نہ کوئی ہنگامہ مومنوں کی بیٹیاں اسی طرح بیاہی جاتی ہیں کیونکہ معیار تقویٰ ہے۔

سچائی کی برکت

ابوعمر زجاجی کے مکان سے جب ایک جنازہ اٹھا اور لوگوں نے حضرت ابوعمر زجاجی کی بے قراری دیکھی تو سب کو یہی گمان ہوا کہ شاید مرنے والا زجاجی کا حقیقی بھائی ہے۔ چونکہ زجاجی اپنے علاقے کے مشہور علما میں سے تھے اس لیے تعزیت کے واسطے آنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ ایک آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ کسی نے دریافت کر لیا کہ مرحوم آپ کے حقیقی بھائی تھے؟ زجاجی مسکرائے، فرمایا "کہ سمجھ لو حقیقی ہی بھائی تھے"۔ اس نے کہا کیا مطلب"؟ اس کے بعد زجاجی نے جو واقعہ سنایا اس نے حاضرین کو حیرت زدہ کر دیا۔ زجاجیؒ نے بتایا کہ مرحوم میرا حقیقی بھائی نہیں تھا بلکہ ابتدائے جوانی میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ترکے میں مجھے ایک گھر ملا میں نے اس گھر کو پچاس اشرفی میں فروخت کر دیا اور رقم کو ایک تھیلی میں ڈال کر کمر میں باندھ لیا۔ حج کا مجھے بہت شوق تھا چنانچہ میں حج پر روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک ڈاکو ملا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرا سامان چھین لیا پھر کہا کہ تیرے پاس نقدی کتنی ہے اس وقت میرے دل میں آیا کہ جھوٹ بول دوں اور اگر میں نقدی کو بچانے کے لیے اس وقت جھوٹ بول دیتا تو اتنا گناہ بھی نہ ہوتا۔

مگر میرے ضمیر نے کہا، کہ جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں ہے۔ سچ بولنے کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی تو ہوگا کہ رقم چلی جائے گی ایمان تو سلامت رہے گا اس لیے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس ۵۰ اشرفیاں ہیں اور ایک تھیلی میں رکھ کر میں نے انہیں کمر میں باندھ رکھا ہے۔ ڈاکو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے کہا تم دکھاؤ۔ میں نے جھٹ تھیلی کمر سے کھولی اور اس کے حوالے کر دی۔ اس نے گنا تو پوری ۵۰ اشرفیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر ڈاکو کی حالت تبدیل ہو گئی اور تھیلی مجھے واپس کر دی اور کہا تیرے سچ بولنے کی وجہ سے میں یہ تھیلی تجھے لوٹا رہا ہوں"۔ لوٹا ہوا سامان بھی اس نے دے دیا سواری سے اتر پڑا اور کہا کہ آپ اس پر سوار ہو جائیے میں نے

کہا،" میں پیدل سفر کر رہا ہوں پیدل ہی سفر کروں گا۔"

ڈاکو نے کہا،"میری غیرتِ ایمانی یہ گوارہ نہیں کرتی کہ آپ جیسا سچا آدمی پیدل سفر کرے اور میں سواری پر بیٹھوں۔ جو بھی ہو آپ کو سواری پر بیٹھنا ہوگا۔ آخر میں اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ میں نے کہا،" آپ بھی بیٹھ جائیں۔" اس نے کہا آپ جیسے ایماندار اور سچے آدمی کے برابر سواری پر مجھ جیسا گناہ گار بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔ آج سے میں آپ کا غلام ہوں اور آپ میرے آقا۔ ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گا۔ شاید آپ کی خدمت کے طفیل میں اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف کر دے۔" میرے دوست آج مرنے والا میرا بھائی نہیں تھا وہی ڈاکو تھا جس نے ساری زندگی میری خدمت کی۔ مجھے یقین ہے کہ مرتے وقت وہ اللہ کا ولی تھا سچائی نے مجھے بچایا اور خدمت نے اسے اللہ کا ولی بنا دیا۔

مشقت سے سخاوت

یوں تو انسان کے جسم کا ہر عضو ایک نعمتِ خداوندی ہے جس پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ انسان کے دماغ ہی کی ساخت پر غور کیجئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ دن رات میں ہزاروں کام کرتا ہے مگر تھکتا نہیں اس کی ایک رگ ادھر سے ادھر ہو جائے تو اچھا خاصا انسان دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہے نہ کچھ سوچ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ نہ بھلے برے میں تمیز کر سکتا ہے اگر عالم ہے تو اس کا علم بیکار اور صناع ہے تو ساری کاریگری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ دل کو لیجئے تو جسم کا بادشاہ ہے ساتھ ہی خدا کا عرش بھی۔ جلوۂ خداوندی کی ایک جھلک اس کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ دل ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔ دل فاسد ہو گیا تو سب فاسد۔ کبھی آرام نہیں کرتا۔ معدے کو آرام ملتا ہے۔ آنکھوں کو آرام ملتا ہے نیند میں دماغ کو بھی آرام کا موقع مل جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کا تکان مٹ جاتا ہے مگر

دل کو کبھی آرام نہیں۔ اگر چند لمحے بھی آرام کرنے لگے تو زندگی کا چراغ بجھ جائے۔ آنکھیں دیکھئے تو اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہیں کہ اس کا شکر ادا کرنا انسان کے بس سے باہر ہے ہر آدمی کو آنکھوں کی قدر نہیں معلوم ہوتی ان سے ان کی قدر پوچھئے جن کی آنکھیں بے نور ہیں۔ حدیث شریف میں آنکھوں کو کریمتین کہا گیا ہے یعنی خاص نعمت خداوندی۔ آنکھوں کا نور چھن جانے کے بعد بہت سے لوگ دل ہار بیٹھتے ہیں۔ عبادت میں دل نہیں لگتا۔ بعض اوقات اللہ تعالےٰ کا شکوہ کرنے لگتے ہیں مگر حضرت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ بڑھاپے میں نابینا ہو جانے کے باوجود کبھی دل برداشتہ نہیں ہوتے تھے۔ مکان ہی میں ایک جگہ نماز کے لیے مخصوص کر لی اور ہر وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے اسی مصلیٰ سے دروازے تک ایک دھاگا باندھ رکھا تھا جب دروازے پر کوئی سائل آکر سوال کرتا تو اسی دھاگے کے سہارے دروازے تک جاتے اور سائل کو جو کچھ دینا ہوتا جاکر اپنے ہاتھ سے دیتے۔ ایک دن وہ اسی طرح چل کر دروازے تک گئے اور سائل کا سوال پورا کیا۔ ان کے ایک جاننے والے نے جب یہ دیکھا تو کہا کہ "جناب! آپ ماشاء اللہ پوتوں اور نواسوں والے ہیں آپ کا گھر بھرا پڑا گھر ہے کسی کو حکم دے دیا کریں وہ آپ کا صدقہ یا خیرات آپ سے لے کر سائل کو دے دے گا آپ خود کیوں اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں؟" فرمایا "میرے بھائی! میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ مسکین کو اپنے ہاتھ سے دینا انسان کو بری جگہ پر گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں اسی لیے اتنی مشقت اٹھاتا ہوں۔"

مریض کی بجائے مرض سے نفرت

وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور ایک بھیڑ اس کے گرد جمع تھی۔ لوگ اسے گالی دے رہے تھے جس کے منہ میں جو آرہا تھا بکے چلا جا رہا تھا۔ وہ شرمسار بھی تھا اس لیے کہ اس سے ایسا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اسے یہ ذلت ملنی ہی تھی۔ اتنے میں اس راستے

سے حضرت ابوالدرداؓ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ بھیڑ دیکھ کر حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ ٹھہر گئے اور ماجرا دریافت کیا لوگوں نے بتایا کہ یہ گنہ گار آدمی ہے اور اس نے فلاں گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس لیے ہم لوگ اس کی ملامت کر رہے ہیں حضرت ابوالدرداؓ نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے ان کی باتیں سنیں اور پھر ان سے دریافت فرمایا "اچھا! تم لوگ مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر تم لوگ اسے کنویں میں گرا ہوا پاتے تو کیا کرتے؟ کیا اسے کنویں میں ہی چھوڑ دیتے یا باہر نکالتے؟" لوگوں نے کہا "حضرت ہم لوگ اسے ضرور کنویں سے باہر نکالتے" حضرت ابوالدرداؓ نے فرمایا "تو پھر اللہ کی حمد و ثنا کرو اور اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں اس گناہ سے بچا رکھا ہے جس میں تمہارا یہ بھائی مبتلا ہو گیا۔ اس آدمی کو برا بھلا نہ کہو۔ تمہارا بھائی ہے اس سے غلطی ہو گئی بس اپنی اپنی خیر مناؤ" لوگوں کو بڑا تعجب ہوا آخر ایک شخص نے پوچھ ہی لیا "حضرت! کیا آپ اس سے بغض نہیں رکھتے؟"

جناب ابوالدرداؓ نے فرمایا "میں اس سے بغض نہیں رکھتا اس کے عمل سے بغض رکھتا ہوں جب اس نے یہ عمل چھوڑ دیا تو یہ میرا بھائی ہے میں اس کو سینے سے لگانے کیلئے تیار ہوں۔ دراصل گناہ گار مریض ہوتا ہے۔ مریض سے نفرت نہیں کرنی چاہیے بلکہ مرض سے نفرت ہونا چاہیے۔ اگر طبیب مرض کے بجائے مریض سے ہی نفرت کرنے لگے تو وہ اس کا علاج کیسے کر سکتا ہے۔ مریض ہمدردی چاہتا ہے۔ شفقت چاہتا ہے ہمدردی سے ہی وہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ نفرت سے نہیں"۔

امام بخاریؒ اور خدمتِ خلق

علم حدیث میں ایسی قابلیت اور مہارت کہ چار دانگ عالم میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا محدثین کا خیال ہے کہ تقریباً نوے ہزار علماء نے ان سے صحیح بخاری شریف سنی تھی اور سب کو ان کے شاگرد ہونے پر فخر تھا۔ تقریباً بارہ سو برس سے علم حدیث

میں ان کا نام ایک معتبر نام کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اور اس پر مشرق و مغرب کے تمام علماء متفق ہیں کہ ان کی کتاب صحیح بخاری شریف کلام اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب ہے۔ نہایت نرم و نازک جسم، گورا چٹا رنگ، پیری کے باعث کسی قدر جھکے ہوئے تقویٰ میں بے مثال، صداقت ایسی کہ اس کی قسم کھائی جا سکتی ہے علم حدیث سے لگاؤ اتنا کہ ایک ایک راوی سے ملاقات کرنے اور اس کی سچائی کو جانچنے کے لیے سینکڑوں میل کا سفر کرتے تھے جس شہر میں اترتے خلقِ خدا امڈ پڑتی اگر کسی کو مصافحہ کرنے کا موقع مل جاتا تو اسے اپنی زندگی کی عظیم ترین سعادت سمجھتا۔ لیکن جب لوگوں نے دیکھا کہ امت کا اتنا بڑا محدث سر پر اینٹیں رکھے ہوئے عام مزدوروں کے ساتھ انہیں ڈھونے میں مصروف ہے تو لوگ حیران رہ گئے۔

ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے ایک مرتبہ فیصلہ کیا عام مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے بخارا میں ایک مہمان سرائے بنائیں چنانچہ انہوں نے اپنی جیب خاص سے اس کی تعمیر کا انتظام کیا۔ راج مزدور بلائے گئے اور مہمان سرائے تعمیر ہونے لگی۔ امام صاحب بھی عام مزدوروں کے ساتھ گارا بنانے اینٹیں ڈھونے اور دیگر تعمیری کاموں میں مصروف ہو گئے جب ان کے ایک شاگرد نے امام صاحب کو اینٹیں ڈھوتے دیکھا تو اسے بہت شرم محسوس ہوئی اور جا کر امام صاحب سے عرض کیا "امام! آپ کے ہزارہا شاگرد موجود ہیں جو آپ کے معمولی سے اشارے پر بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کو تیار ہیں خدا کے لیے آپ یہ کام نہ کریں۔ ہم اینٹیں ڈھوئیں گے آپ صرف ہمارے لیے دعا فرمائیے۔ انشاء اللہ یہ مہمان سرائے بہت جلد مکمل ہو جائے گی۔" شاگرد کی یہ بات سن کر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا چہرہ "متغیر" ہو گیا۔ فرمایا "میرے عزیز! میں یہ جو کام کر رہا ہوں اس لیے کر رہا ہوں کہ اصل میں یہی کام مجھے نفع پہنچائے گا۔ رفاہ عام کا کام کرنا بہت بڑی عبادت ہے۔ جو لوگ اپنے لیے جیتے ہیں اور اپنے عیش و آرام کے لیے ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں وہ موت کے بعد صحیح معنوں میں مر جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے اور جو دوسروں کے

لیے جیتے ہیں اور دوسروں کو آرام پہنچانے کے لیے مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ انہیں موت کے بعد بھی بقائے دوام حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ صدقہ جاریہ ہے جس کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔" اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ خلقِ خدا کی خدمت کی جائے دکھی دلوں کو سکھ اور بے چین روحوں کو سکون پہنچانے کا سامان کیا جائے۔

آقا کا حکم

سلطان محمود غزنوی اپنے غلام ایاز کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ درباری حسد کرتے تھے اور اکثر آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے۔ اتفاق سے ایک دن درباریوں کی ایک جماعت نے بھرے دربار میں سلطان محمود غزنوی سے سوال کر دیا "عالی جاہ! ایاز کے اندر ایسی کونسی خوبی ہے کہ آپ اسے اتنا عزیز رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو ہے تو ایک زر خرید غلام ہی۔" بادشاہ نے کہا اچھا کسی دن دکھلا دیں گے کہ میں کیوں اسے عزیز رکھتا ہوں۔ اتفاقاً چند دنوں بعد سلطان نے ایک نہایت چمکدار اور قیمتی موتی خزانے سے منگایا اور وزیرِ اعظم سے کہا کہ اسے توڑ ڈالو۔ وزیرِ اعظم سمجھا کہ شاید بادشاہ کو خللِ دماغ ہو گیا ہے کہ لاکھوں کے اس موتی کو توڑنے کا حکم دے رہا ہے۔ باادب ہو کر عرض کیا۔ جہاں پناہ! اپنے حکم پر نظرِ ثانی فرمائیں کہ ایسا بے بہا موتی پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ سلطان نے دوسرے وزیر سے کہا کہ تم اسے توڑ ڈالو۔ اس غریب نے سوچا کہ جب وزیرِ اعظم نے اس قیمتی موتی کو نہ توڑا تو پھر میری کیا شامت آئی ہے کہ میں اسے توڑوں؟ وزیرِ اعظم تو مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔ یہ سوچ کر اس نے بھی معذرت کر لی بادشاہ نے باری باری ہر وزیر اور امیر کو حکم دیا مگر سب نے وزیرِ اعظم کی پیروی کی اور غالباً سب نے یہی خیال کیا کہ بادشاہ یا تو پاگل ہو گیا ہے یا پاگل ہونے والا ہے کہ اتنے دُرِ نایاب کو توڑنے کا حکم دے رہا ہے۔

آخر میں سلطان نے ایاز کو حکم دیا کہ اس موتی کو توڑ ڈالو۔ ایاز نے کہا بہت اچھا دو پتھر لائے ایک کو نیچے رکھ کر اس پر موتی رکھا اور دوسرے پتھر سے ایسا مارا کہ موتی چکنا چور ہو گیا۔ سلطان نے ایاز پر غصہ کی نظر ڈالی اور کہا کہ ایاز تو نے یہ کیا حرکت کی وزراء نے بھی ایاز سے کہا کہ "تجھے کیا سوجھی کہ اتنے قیمتی موتی کو تو نے ریزہ ریزہ کر دیا" ایاز نے کہا "ظالمو! میں نے تو موتی ہی توڑا ہے تم نے تو شاہی حکم کو توڑا" اس کا جواب سن کر سلطان خوشی سے اچھل پڑا اور کہا کہ "درباریو! دیکھ لو۔ اسی خوبی کی وجہ سے میں ایاز کو عزیز رکھتا ہوں کہ آقا کے حکم کے مقابلے میں اسے کسی کی پروا نہیں" اللہ تعالیٰ کے احکام تو لاکھوں کروڑوں سلطانوں اور بادشاہوں کے احکام سے بلند و برتر ہیں۔

انسانی زندگی کی حقیقت

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں دربارِ رسالت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیک مجھے کچھ نصیحت فرمائیے مگر ایسی نصیحت جو جامع اور مختصر ہو آپ نے ارشاد فرمایا ایک تو یہ کہ جب تم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوا کرو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھا کرو جو جلد ہی دنیا کو چھوڑ کر جانے والا ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ہمیشہ کے لیے دنیا کو چھوڑ رہا ہو یا اسے یقین ہو چکا ہو کہ اس کی یہ نماز اس کی زندگی کی آخری نماز ہے اور اب اسے نماز پڑھنے کا موقع نہیں ملے گا تو ایسے شخص کی نماز میں خشوع و خضوع ہو گا اور نماز کے دوران ہی اس کے خیالات دنیا وی وادیوں بھٹکتے نہیں پھریں گے بلکہ وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنے رب کے حضور میں کھڑا ہو گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور دوسری بات یہ ہے کہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالو کہ اگر قیامت کے دن اس کا حساب و کتاب ہو تو اس کے سلسلے میں کچھ کہنے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہ ہو یعنی زبان کے

معاملے میں احتیاط سے کام لو۔ بلے جانے پوچھے کوئی بات منہ سے نہ نکالو کیونکہ انسان جو بات اپنے منہ سے نکالتا ہے اگر وہ حق کے خلاف ہے یعنی اس نے کسی پر تہمت لگادی۔ بہتان باندھ دیا۔ یا غیبت کی یا اپنی زبان سے کسی کا دل دکھایا تو یاد رکھو کہ یہ باتیں ریکارڈ کر لی جاتی ہیں اور قیامت کے دن ان کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جو اس وقت تک توبہ سے بھی معاف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ بندہ معاف نہ کر دے جس کی تم نے غیبت کی ہے یا جس پر تم نے بہتان باندھا ہے۔

سرکار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ لوگوں کے پاس جو مال و اسباب ہے اس سے تم بالکل بے نیاز ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے مال و اسباب اور دولت پر رشک نہ کرو کیونکہ ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ فانی جہان کی فانی نعمتیں ہیں۔ دنیا سے بے نیاز ہو جاؤ دنیا خود تمہارے قدموں پر گر پڑے گی۔ آخرت کی طرف راغب رہو کیونکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔

نصیحت طلب کرنے والے کو ایسا محسوس ہوا کہ چند جملوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی کی حقیقت کھول کر رکھ دی۔ سچ ہے بادشاہ کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔

امتحان

اس دن بت پرستوں کے میلہ کا دن تھا۔ صبح ہی سے بچے بوڑھے عورت مرد نہا دھو کر زرق برق لباس میں ملبوس میلہ میں شریک ہونے کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ باپ نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی میلے میں شریک ہونے کیلئے کہا مگر ابراہیم علیہ السلام کا [illegible] بھی کچھ اور تھا اسلئے معذرت کر دی جب شہر خالی ہو گیا تو توحید کے نقیب اعظم ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم [illegible]

سیدنا علیہ الصلوٰۃ والسلام بت کدے میں داخل ہوئے کلہاڑی اٹھائی اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا بڑے بت کا سر توڑ کر کلہاڑی اس کے کاندھے پر رکھ دی جب میلے سے بت پرست واپس آئے اور انہوں نے اپنے دیوتاؤں کا یہ حشر دیکھا تو وہ یہ سمجھ گئے کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ جوان سب سے زیادہ بڑا اور طاقت ور ہوگا اس نے یہ کام کیا ہوگا۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ جو بت خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے بھلا وہ تمہاری حفاظت کیا کریں گے۔ اس لیے ایسے معبود برحق کی عبادت کرو جو حیّ وقیوم اور نفع وضرر کا مالک ہے۔ بادشاہ وقت نمرود سے شکایت کی گئی اور ایک میل کے ایریا میں آگ جلائی جانے لگی۔ کہ اس میں ابراہیمؑ کو جلایا جائے گا اب مہر و وفا اور صدق و صفا کے امتحان کا وقت آچکا تھا۔ ایک طرف اقتدار تھا۔ عوام کی قوت تھی۔ جاہ وجلال دنیوی تھا اور دوسری طرف ایمان و ایقان۔ عزم راسخ اور ذات باری تعالےٰ پر مکمل اعتماد۔

آگ کی شعلہ سامانی کا یہ عالم تھا کہ چڑیوں نے ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا تھا ابراہیمؑ کو منجنیق میں ڈال کر آگ میں پھینک دیا گیا علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا جانے لگا تو ملک وملکوت میں نالہ وشیون بلند ہونے لگا۔ فرشتوں نے اللہ تعالےٰ سے ابراہیمؑ کی مدد کرنے کی درخواست کی جواب ملا جاؤ اگر آپؑ مدد چاہیں تو مدد کر دینا۔ نیچے ایک میل میں پھیلی ہوئی بھیانک آگ تھی۔ ابراہیمؑ کا جسم اب آگ کے قریب پہنچ رہا تھا کہ جبریل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کے جسم کو سنبھال لیا۔ پوچھا ابراہیم تمہیں مدد کی ضرورت ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے جبریل کو دیکھا۔ فرمایا مدد کی ضرورت تو ہے لیکن تمہاری نہیں اللہ کی۔ جبریل نے کہا تو اللہ سے مدد مانگو۔ فرمایا "وہ میرا حال بہتر جانتا ہے مدد کرنا چاہے گا تو کر دے گا ورنہ اس کے نام پر جل مروں گا"۔ غیرت خداوندی کو جوش آیا جبریل کو حکم ہوا "تم میرے اور میرے دوست کے درمیان سے ہٹ جاؤ"۔ آگ کو وحی کی گئی کہ اے آگ ابراہیمؑ پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالےٰ اپنے

چاہنے والوں کی کس طرح مدد کرتا ہے۔

تجارت کے اسلامی اصول

مہاجر صحابہ کی اکثریت تجارت پیشہ تھی جبکہ انصارِ مدینہ کا پیشہ زراعت تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے فیض سے تجارت پیشہ صحابہ کرام تین باتوں کے بہت سختی سے پابند تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ ملاوٹ کو حرام سمجھتے تھے یعنی اچھے مال کو ردی مال کے ساتھ ملاکر کبھی فروخت نہ کرتے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جو شخص ملاوٹ کر کے گاہک کو دھوکا دیتا ہے وہ میری جماعت سے خارج ہے۔ دوسری یہ کہ وہ زیادہ نفع حاصل کرنے کی خاطر ضروری اشیاء کو روک نہیں رکھتے کیونکہ شریعت میں اسے احتکار کہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ احتکار کرنے والا ملعون ہے۔ تیسری چیز یہ کہ وہ نفع کم سے کم لیتے تھے اسطرح وہ کاروبار زیادہ سے زیادہ کرتے اور ان کی دکانوں پر گاہکوں کا ہجوم ہوتا۔ مہاجر صحابہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بہت بڑے کاروباری تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کی کامیابی اور تونگری کا اصل سبب کیا ہے تو فرمایا کہ "میں نے تھوڑے نفع کو زیادہ منافع کے انتظار میں کبھی رد نہیں کیا۔ اگرچہ میرا تھوک کا بیوپار ہے تاہم اگر مجھ سے کسی نے کبھی ایک جانور بھی خریدنا چاہا تو میں نے انکار نہیں کیا ایک ہی فروخت کر دیا یہ نہیں کہا کر دس بیس خرید و گے تبھی مال خرید و گا۔ ایک دن میں نے ایک ہزار اونٹ فروخت کیے لیکن اصل قیمت خرید سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لیا البتہ اونٹ کے پاؤں باندھنے کی ایک ہزار رسیاں ضرور مجھے مل گئیں جنہیں ایک درہم فی رسی کے حساب سے میں نے فروخت کر دیا اسی طرح مجھے ایک ہزار درہم کا نفع ہوا۔ اگر مزید ایک دن کے لیے میں ان ایک ہزار اونٹوں کو روکے رکھتا تو ان کے چارے پر ایک ہزار درہم خرچ ہو جاتے اس طرح ایک نہ

ایک ہزار درہم کی مجھے بچت ہوئی حساب کرو تو ایک ہزار اونٹ فروخت کر کے مجھے دو ہزار درہم مل گئے۔ یہ ہے کاروبار میں میری کامیابی کا راز۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے دور خلافت میں بازار کوفہ میں پھر کر اعلان کرتے رہتے "تاجرو! تھوڑے نفع کو رد نہ کیا کرو ورنہ زیادہ منافع سے محروم رہ جاؤ گے"۔

کسی زمانے میں مسلمان تاجر امانت و دیانت کا مجسمہ اور علامت ہوا کرتا تھا مگر اب کیا ہے ایک دن بازار میں جاکر تجربہ کرلیں۔

ہمیں کیا ہوا جو بدل گئے بڑی حیرتوں کا مقام ہے
کہ وہی زمیں ہے وہی فلک وہی صبح اور وہی شام ہے

صدقہ

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے"، تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ پریشان سے ہو گئے۔ عرض کیا "حضور! اگر کسی کے پاس مال نہ ہو تو وہ کیسے صدقہ کرے گا؟" ارشاد ہوا "کوئی بات نہیں وہ کمائے خود کھائے اور دوسروں کو دے" حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا "حضور! اگر وہ یہ نہ کر سکے تو؟" آپ نے ارشاد فرمایا "کسی ضرورت مند اور مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرے"۔

میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک، اگر اس آدمی میں اس کی بھی طاقت و صلاحیت نہ ہو تو کیا کرے؟ آپ نے ارشاد فرمایا "تو پھر نیکی کا حکم دے اور خیر کی طرف لوگوں کو بلائے" میں نے کہا سرکار! اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا پھر وہ کسی کو تکلیف نہ دے یہ بھی صدقہ ہے" صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ابوہریرہ! دو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو یہ بھی صدقہ ہے۔ اگر تم کسی سواری پر جا رہے ہو اور کسی کو اپنی سواری پر بٹھا لو تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اگر تم دیکھو کہ کوئی آدمی بوجھ لادے جا رہا ہے اور تمہارے پاس سواری ہے اس کا بوجھ اگر تم اپنی سواری پر لاد لو تو یہ بھی صدقہ ہے۔ ابوہریرہ! کسی سے میٹھا بول بول دینا بھی صدقہ ہے۔ کسی کو نیکی کی بات بتانا بھی صدقہ ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے جب تم مسجد جاتے ہو تو تمہارا ہر وہ قدم جو نماز کے لیے اٹھتا ہے صدقہ میں شمار ہو گا۔ اور سنو! راستے سے کانٹا پتھر یا کوئی تکلیف دینے والی چیز کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے"۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھا کرو کیونکہ خندہ پیشانی سے اپنے کسی مسلمان بھائی سے ملنا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ اپنے ڈول کا پانی اپنے کسی مسلمان بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی نیکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کوئی جاہ و مرتبہ عطا فرمایا ہے تو اس سے کسی کو فائدہ پہنچاؤ یہ بھی نیکی ہے۔ اگر اللہ نے تمہیں قوت دی ہے تو کسی کمزور کی مدد کرو کہ یہ بھی نیکی ہے۔ اللہ نے تمہیں علم دیا ہے تو دوسروں کو صحیح بات بتاؤ کہ یہ بھی نیکی ہے۔ الغرض مقصود یہ ہے کہ دکھی انسانیت کی مدد کرتے رہو۔ لوگوں کو فائدہ پہنچاتے رہو کہ اسلام کی اولین تعلیم نفع بخشی و فیض رسانی ہے۔

ایثار

خیر المجالس میں خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے قزل نامی ایک بادشاہ تھا اس کا ایک داروغہ مطبخ بڑا دیندار اور سخی تھا دل کا ایسا پاک اور ذاتی طور پر اتنا غمگسار تھا کہ اس سے کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جا سکتی تھی اور

چونکہ اس کی شہرت ہو گئی تھی اس لیے اکثر و بیشتر مقروض اور ستم زدہ لوگ اس سے آ کر سوال کرتے اور وہ ہر سائل کا سوال پورا کرتا جب تک اس کے پاس پیسے تھے وہ لوگوں کو دے دیتا جب پیسے ختم ہو گئے اور سوالی آکر اس کے سامنے اپنی پریشانیاں بیان کرتے تو اس سے برداشت نہ ہوتا اور بادشاہ کی طرف سے شاہی باورچی خانے کے اخراجات کے لیے جو رقم اسے ملی ہوتی اس میں سے لوگوں کو دے دیتا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا یہاں تک کہ کئی سال کے بعد جب شاہی محاسب باورچی خانے کا حساب کرنے آیا تو اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ داروغہ مطبخ نے خیانت کی ہے اور اس کے ذمے شاہی خزانے کی سوا لاکھ اشرفیاں عائد ہوتی ہیں بادشاہ کو سخت تعجب ہوا کیونکہ وہ داروغہ مطبخ کو بہت ایماندار سمجھتا تھا مگر اس زمانے کے قانون کے مطابق وہ مقدمے کا فیصلہ خود نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے مقدمہ قاضی کی عدالت میں بھیج دیا قاضی نے بھی حساب کیا تو سوا لاکھ اشرفیاں کم پڑیں۔ لہٰذا قانون کے مطابق باورچی خانے کے داروغہ کو جیل میں بھیج دیا گیا جب داروغہ جیل میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس میں ساٹھ آدمی پہلے ہی سے بند ہیں اس نے ہر ایک سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سب مقروض لوگ ہیں جو قرض نہ ادا کرنے کی وجہ سے جیل میں بند کیے گئے داروغہ مطبخ کو بہت رنج ہوا اس نے جیل ہی سے ایک رقعہ اپنے بیٹے کے نام لکھا کہ گھر کا سارا اثاثہ قیمتی کپڑے اور زیورات فروخت کر دو اور رقم لے کر میرے پاس آؤ لڑکے کو سخت تعجب ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سارا اثاثہ فروخت کر دینے کے بعد بھی تیس چالیس ہزار سے زیادہ حاصل نہیں ہو سکتا جب کہ باپ پر محاسب نے سوا لاکھ اشرفیاں عائد کی ہیں لیکن کرتا بھی تو کیا کرتا باپ کی حکم عدولی بھی نہیں کر سکتا تھا گھر کا اثاثہ اور زیورات فروخت کرنے کے بعد تینتیس ہزار روپے حاصل ہوئے وہ لے کر جیل میں باپ کے پاس حاضر ہو گیا۔ داروغہ مطبخ نے تینتیس ہزار روپے لیے اور کپڑے کو پھاڑ کر اس کے ساٹھ ٹکڑے بنائے اور ہر قیدی سے اس کے قرض کی رقم دریافت کی جو جتنا بتاتا اتنے ہی روپے پوٹلی میں

باندھ دیتا عجیب اتفاق کہ لڑکا جو رقم لایا تھا وہ کل بتیس ہزار تھے اور جب ساٹھ قیدیوں کے قرضوں کا حساب کیا گیا تو بتیس ہی ہزار نکلے۔ ایک ایک پوٹلی ایک ایک قیدی کو دے دی اور کہا کہ تم اپنا اپنا قرض ادا کرو اور رہائی حاصل کرو خوشی خوشی سارے قیدی چلنے لگے تو دریافت کیا آپ ؟ داروغہ مطبخ نے جواب دیا میں نے تمہیں رہائی دلا دی اللہ تعالیٰ کو اگر یہ میرا عمل پسند آئے گا تو وہ مجھے رہائی دلائے گا بادشاہ کو جب یہ خبر ملی تو اس نے کہا کہ اس طرح کا ایثار کرنے والا شخص خائن نہیں ہو سکتا داروغہ مطبخ کے ذمہ جتنی رقم باقی ہے وہ میں ادا کروں گا اسے رہا کر دیا جائے۔

خیر خواہی

جب دو آدمیوں میں تکرار ہونے لگی اور تکرار کے دوران تقریباً دونوں آدمیوں کی آواز بلند ہو گئی تو ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی عصر کے بعد ویسے بھی بازار میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر گاہکوں کی بڑی تعداد ضروریاتِ زندگی خریدنے کے لیے آتی ہے اور دوکاندار کو بھی جلدی رہتی ہے کہ اپنا مال فروخت کر کے شام ہونے سے پہلے پہلے گھر چلا جائے اس لیے تقریباً خریدار اور دوکاندار دونوں ہی بہت زیادہ مصروف ہو جاتے ہیں اسی لیے قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نمازوں کی حفاظت کیا کرو یعنی کوشش کرو کہ ان کو وقت پر ادا کرو اور خاص کر عصر کی نماز کی احتیاط کرو کہ ایسا نہ ہو کہ کاروبار کی مصروفیت اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے نماز ضائع ہو جائے یا بر وقت ادا نہ کر سکے ایسے وقت میں جبکہ بازار میں بہت رش تھا اگر دو آدمیوں میں تکرار ہونے لگے اور لوگ بلند آواز سے ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں تو ہر آدمی کی توجہ اس طرف مبذول ہو جاتی ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ لین دین میں شاید کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ مگر یہاں

عجیب جھگڑا تھا جھگڑا جناب جنید بغدادیؒ کے ماموں جناب سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی دکان پر ہو رہا تھا لوہے کا ایک گرز تھا جسے جناب سری سقطیؒ نے ساٹھ درہم میں خریدا تھا جس دن خریدا تھا اسی دن انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر میں اس پر پانچ روپے منافع کے لگا لوں تو تھوڑا بہت فائدہ مجھے بھی ہو جائے گا اور زیادہ قیمت دینے کی وجہ سے خریدار بھی زحمت میں گرفتار نہیں ہو گا۔ اسلام نے تجارت کے جو اصول مسلمانوں کو دیے ہیں ان میں نفع اندوزی سے منع نہیں کیا گیا البتہ احتکار سے منع کیا گیا ہے یعنی ضروریاتِ زندگی کی چیز کو روک رکھنا تاکہ جب وہ چیزیں خوب مہنگی ہو جائیں اور لوگ اس کے محتاج ہو جائیں تو مہنگے داموں فروخت کر کے بیش از بیش نفع کمائیں گے یا زندگی بچانے والی دواؤں کو بہت زیادہ قیمت اور نفع لے کر فروخت کرنا۔ اس عمل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون قرار دیا ہے بلکہ ایک حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ احتکار کرنے والا کوڑھی ہو کر مرتا ہے۔ یوں بھی تجارت میں بہت زیادہ نفع لینے کو اسلام پسند نہیں کرتا کیونکہ اس طرح لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور لوگ مشکلات میں گرفتار ہو جاتے ہیں البتہ جائز منافع اندوزی کو اسلام منع نہیں کرتا۔

اسی خیال سے جناب سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے گرز کی قیمت پینسٹھ درہم مقرر کی۔ جب گاہک نے یہ سنا تو کہا کہ بازار میں تو اس کی قیمت ستر درہم ہے آپ جان بوجھ کر نقصان اٹھا رہے ہیں لہٰذا میں تو ستر درہم ہی دوں گا۔ حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا میں پینسٹھ سے زیادہ نہیں لوں گا اور دوکاندار و خریدار کے درمیان اس بات پر تکرار شروع ہو گئی۔ تکرار زیادہ نفع کمانے کے لیے نہیں تھی بلکہ اپنے مسلمان بھائی کو زیادہ نفع پہنچانے کے لیے ہو رہی تھی۔ شاید اس وقت فرشتوں کو یہ اندازہ ہو رہا ہو گا کہ انسان کو ملائک پر فضیلت کیوں دی گئی تھی۔

مہمان نوازی

اسلامی تعلیمات کے زیر اثر ماوراء النہر کے علاقے میں پردیسیوں اور مسافروں کے لیے مہمان نوازی کے ایسے ایسے سامان تھے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آج کے زمانے میں امارت کی علامت اونچی اونچی عمارتیں، قیمتی قالین، آرام دہ سواریاں، نوکروں چاکروں کی فوج ظفر موج اور عیش و عشرت کے سامان ہیں۔ لیکن چوتھی صدی ہجری میں ماوراء النہر کے اکثر علاقوں میں امیر اس کو سمجھا جاتا تھا جو اپنی بخشش اور داد و دہش سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا۔

چنانچہ اس دور کے صاحب جائیداد لوگوں کو اس بات کا عام شوق تھا کہ مہمانوں کے لیے کشادہ مکان تعمیر کریں اور ان مکانوں کو اچھے ساز و سامان سے آراستہ کریں۔ اگر کوئی مہمان آتا تو ہر امیر اسے اپنے ہاں ٹھہرانے کی کوشش کرتا اور جب کوئی مسافر پہنچتا خواہ واقف ہو یا ناواقف اس کے کھانے پینے اوڑھنے بچھانے کا اس طرح انتظام کر دیا جاتا کہ اسے اپنا سامان کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی اس طرح جس گھر میں کوئی مسافر یا مہمان پہنچتا اسے ایسے لگتا گویا کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے۔

لبا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ بغیر کسی اطلاع کے سو سو دو دو سو آدمی اپنی سواریوں نوکروں چاکروں کے ساتھ پہنچ جاتے مگر ان کی پیشانی پر بل بھی نہ پڑتے اور میزبان منٹوں میں ان کو ٹھہرانے اور ہر قسم کی آسائش مہیا کرنے میں فخر محسوس کرتے وہ امارت جس سے خلق خدا، مسافروں، معذوروں اور مستحقین کو فائدہ پہنچے اس ابر رحمت کی طرح ہے۔ جو زمین کو سیراب کر کے گل و گلزار لگاتا ہے اور وہ دولت جو ذاتی عیش و عشرت اور فخر و نمود کا ذریعہ بنے صاحب دولت کے لیے سامان لعنت ہے اور قوم و ملک کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ۔ چوتھی صدی ہجری میں اسلام نے اہل ماوراء النہر کو اپنے اسی نظریے سے آشنا بنا دیا تھا۔ تو ان کے معاشرے

نے اس کے فوائد و ثمرات بھی دیکھ لیے۔

سچی توبہ

سپہ سالار رات کے وقت لشکر کا گشت لگا رہے تھے جب انہوں نے ابو محجن ثقفی کو شراب پیتے دیکھا تو غصے سے آگ بگولا ہو گئے۔ فرمایا، "اپنی جان کے دشمن تو نے تو اپنے جہاد اور عبادت کا ثواب بھی کھو دیا۔ خدا کی قسم میں تم پر ضرور شرعی حد جاری کروں گا اور ابو محجن ثقفی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا دوسرے دن صبح ثقفی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا دوسرے دن صبح کو جب میدان کارزار گرم ہوا تو سپہ سالار سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سخت بیمار ہو گئے اور میدان میں جانے کے قابل نہ رہے قادسیہ کی لڑائی تاریخ اسلام میں عظیم لڑائی مانی جاتی ہے۔ اس لیے کہ لاکھوں کا لشکر لے کر رستم اس لڑائی میں مسلمانوں کے مقابلے میں آیا تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے سورماؤں نے اس لڑائی میں جام شہادت نوش کیا۔ اس دن صبح سے ہی ایرانیوں کا پلہ بھاری نظر آ رہا تھا ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ کر حضرت ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالےٰ عنہ لشکر کی کمان کر رہے تھے ابو محجن قید خانے سے دریچے سے لڑائی دیکھ رہے تھے لڑائی کی حالت دیکھ کر ابو محجن سے رہا نہ گیا حضرت سعدؓ کی بیوی سلمٰی کو جوان پر نگران مقرر تھیں بلا کر کہا کہ" خدا کے لیے اس وقت مجھے چھوڑ دو لڑائی سے اگر زندہ بچا تو خود آ کر بیڑیاں پہن لوں گا"۔ سلمٰی سے ابو محجن کی یہ بے چینی دیکھی نہ گئی اور انہوں نے ان کی بیڑیاں کاٹ دیں۔ ابو محجن نے سعد کے گھوڑے پر زین کسا نیزہ سنبھالا اور بجلی کی طرح میدان میں پہنچ گئے سب سے پہلے رستم کے قریب پہنچے اور تاک کر ایسا نیزہ مارا کہ رستم کے سینے کے آر پار ہو گیا۔ دور ٹیلے پر سے اس شہ سوار کی بہادری دیکھ کر حضرت سعد رضی اللہ عنہ حیران ہو کر کہنے لگے کہ حملے

کا انداز تو ابو محجن جیسا ہے مگر وہ تو قید میں ہے شام ہوئی تو ابو محجن نے قید خانے میں آکر خود بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد کی بیوی سلمیٰ نے دن کا واقعہ اپنے شوہر کو سنایا سعدؓ اسی وقت قید خانے میں آئے اور یہ کہہ کر ابو محجن کو رہا کر دیا کہ جو شخص مسلمانوں پر نثار ہو میں اسے سزا نہیں دے سکتا۔ ابو محجن نے کہا "سپہ سالار جب تم نے مجھے رہا کر دیا تو سن لو کہ اب میں سچے دل سے شراب سے توبہ کرتا ہوں جب تک زندہ رہوں گا اس نابکار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا" ابو محجن نے موت تک اپنے اس عہد کو نبھایا۔

صدقہ جاریہ

تمام بھلائیوں کی جڑ آخرت کا یقین ہے یہ یقین جتنا بڑھتا جاتا ہے ایمان کو اتنی ہی جلا ملتی جاتی ہے آخرت کا یقین انسان میں دنیاوی مال و متاع سے بے رغبتی اور خوفِ الٰہی پیدا کرتا ہے اور انسان یہ سوچنے لگتا ہے کہ ان فانی چیزوں سے دل کیوں لگاؤں کہ آخر انہیں ایک نہ ایک دن چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ کیوں نہ اس دولت سے ایسا کام کروں کہ میرے کے بعد بھی اس کا ثواب مجھے ملتا رہے۔ کیونکہ ؎

تربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

ثواب جاریہ کے اس تصور کے تحت ابتدائے اسلام ہی سے اپنی جائیدادوں اور ملکیتی اشیاء کو اللہ کے راستے میں وقف کر دینے کا خیال مسلمانوں میں جاگزیں ہوا اور انہوں نے بڑے بڑے اوقاف قائم کئے ان کا مقصود صرف خلقِ خدا کو بھلائی پہنچانے اور ان کی مشکلات میں کمی کرنا تھا۔ بڑے بڑے دولت مند اور کروڑپتی آج مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے ہیں نہ انہیں کوئی جانتا ہے نہ ان کا نام

لیتا ہے

؎ عز دو ر تھا نمود تھا ہٹو بچو کی تھی صدا
اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

لاہور کی شاہی مسجد بنانے والا اورنگ آباد کے ایک مقبرے میں محو خواب ہے اور جامع مسجد دہلی کا تعمیر کرنیوالا تاج محل میں سو رہا ہے لیکن ان دونوں مسجدوں میں جتنی بھی نمازیں پڑھی جا رہی ہیں سب کا ثواب نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ مسجد بنانے والوں کو بھی مل رہا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے صدقہ جاریہ کہتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری کے سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ اسلامی عہد میں عجیب و غریب قسم کے اوقاف ہوتے تھے۔ مثلاً دمشق میں ایک وقف صرف اس لیے قائم تھا کہ اگر کسی غلام سے کوئی چینی کا برتن ٹوٹ جاتا تو فوراً غلام کی طرف سے برتن ہی کی شکل میں اس کے مالک کو معاوضہ پیش کر دیا جاتا بعض علاقوں میں وقف کا صرف ایک مصرف تھا کہ غریب لڑکیوں کی شادی کے موقع پر وقف کی آمدنی سے لڑکیوں کے جہیز اور دوسرے ضروری سامان کا انتظام کیا جاتا۔ مراکش میں ایک وقف اس بات کے لیے قائم کیا گیا تھا کہ اگر شوہر اور بیوی کے درمیان ناچاقی ہو جاتی اور بیوی شوہر سے روٹھ کر گھر سے نکل جاتی تو اسی وقف کی عمارت میں رکھا جاتا اور اس کی تمام ضروریات پوری کی جاتیں۔ یہاں تک کہ باہمی صلح کے بعد بیوی اپنے شوہر کے پاس چلی جاتی۔ مراکش ہی میں دیوانوں کو رکھنے اور ان کے علاج معالجہ کے لیے ایک وقف قائم تھا غرض کہ ایسے بیشمار اوقاف تھے جن کے ذریعے دکھی انسانیت کی خدمت کی جاتی تھی۔

مومن کی خیر خواہی

زمانہ جاہلیت میں تمام طبقات میں سب سے مظلوم طبقہ غلاموں کا تھا۔ نہ ان کی داد تھی نہ فریاد، انہیں جانوروں سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

اگر ایک سردار کسی معزز شخص کو قتل کر دیتا اور اس سے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ اپنے مخالف سے یہ کہتا کہ میری جان بخش دو اس کے بدلے میرے ایک سو غلاموں کو قتل کر دو اور اس کے بدلے سو غلام بغیر کسی قصور کے ذبح کر دیئے جاتے اسلام نے جہاں اور کچلی ہوئی انسانیت کو سہارا دیا وہاں غلاموں کو بھی پناہ دی اور مالکوں پر یہ لازم قرار دیا کہ جو کھائیں وہی غلاموں کو کھلائیں اور جو پہنیں وہی غلاموں کو پہنائیں اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ کروائیں۔

اور جب ان سے کام لیں تو کام میں خود بھی ان کے ساتھ شریک ہوں۔ ان حالات میں مجبور ہو کر لوگوں نے کثرت سے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اور ان کے لیے اچھی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ یہاں تک کہ بعض غلام آگے چل کر بادشاہ بنے۔ اور انہوں نے اخلاق و کردار کے ایسے نمونے پیش کئے کہ تاریخ آج بھی ان کے سامنے گنگ ہے۔ یونس ابن عبید انہیں میں سے ایک ہیں۔ یہ حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ اور آزاد کردہ غلام تھے۔ علمی اعتبار سے ان کے زمانے میں ان کا ثانی نظر نہیں آتا تھا۔

اور عملی حیثیت سے دیکھیئے تو وہ ولیٔ کامل نظر آتے ہیں۔ ریشمی کپڑوں کی تجارت کیا کرتے تھے ایک مرتبہ ایک خاص مقام پر ریشم کا بھاؤ چڑھ گیا انہوں نے بھاؤ تیز ہونے کی وجہ سے اپنے لئے ایک دکان وار سے ۳۰ ہزار کا ریشم خریدا جو سابقہ بھاؤ پر ملا یونس ابن عبید نے ریشم فروش سے پوچھا تمہیں بھاؤ چڑھنے کی کچھ خبر ہے اس نے کہا نہیں یونس نے یہ سن کر خرید کردہ ریشم واپس کر دیا اور اپنی رقم یہ کہہ کر واپس لے لی کہ میں اپنے ایک مسلمان بھائی کی بے خبری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا تجارت کی اصل دیانت ہے اور تجارت کی ساری برکت دیانت میں ہے۔ جو نفع بد دیانتی سے کمایا جائے وہ ملعون ہے۔

تین نصیحتیں

جس وقت ایک اجنبی آیا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ
میں اُس وقت بارگاہِ نبوت میں حاضر تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک
مجھے نہایت مختصر اور جامع نصیحت فرما دیجیے آپ نے تین باتوں کی خاص طور پر تاکید
فرمائی ارشاد ہوا کہ جب تم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوا کرو تو اس شخص کی طرح نماز پڑھا
کرو جو اپنی زندگی کی آخری نماز پڑھ رہا ہو یعنی اگر کوئی آدمی یہ یقین کر لے کہ شاید اسے
اب دوسری نماز پڑھنے کا موقعہ نہ ملیگا اور اس کی یہی نماز اس کی آخری نماز ہے تو ایسا
شخص مکمل خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز ادا کرے گا اور اس کا دل پوری طرح سے
خدا کی طرف متوجہ ہوگا اور دنیوی خیالات کی تاریک وادیوں میں بھٹکتا نہیں پھرے
گا۔ ساری زندگی کے گناہ اس کے پیش نظر ہوں گے اور اس وقت غفار و ستار
رب العالمین اس کے سامنے ہوگا۔ نماز کی یہ منزل اعلیٰ ترین منازل میں سے ہے آپ
نے دوسری بات ارشاد فرمائی کہ اپنی زبان سے ایسی بات نہ نکالو کہ اگر قیامت کے
دن اس کا حساب ہو تو تمہارے پاس کچھ کہنے کے لیے نہ رہے۔ دیکھنے میں زبان
تو ایک گوشت کا لوتھڑا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کا مفہوم یہ ہے
زبان سے نکلی ہوئی بات کو معمولی نہ سمجھا کرو تمہارا ہر قول ریکارڈ کیا جا رہا ہے اور ایک
ایک لفظ کا حشر کے میدان میں تمہیں حساب دینا پڑے گا۔ غیبت بہتان تراشی جھوٹ
اور چغل خوری یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے جو اس وقت تک
معاف نہیں ہو سکتے جب تک وہ شخص معاف نہ کر دے جس کی غیبت کی جاتی ہے
یا جس پر بہتان تراشا جاتا ہے۔ حشر کے دن جب ان کے بارے میں سوال ہوگا تو
انسان کے پاس اگر اس نے صاحب حق سے حق معاف نہ کرالیا ہو، کوئی عذر باقی
نہ ہوگا۔ تیسری بات آپ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو کچھ مال و اسباب دوسروں کے
پاس ہے تم اس سے بالکل بے نیاز ہو جاؤ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال و اسباب

کی فراوانی پر رشک نہ کیا کرو کیونکہ یہ چیزیں فانی ہیں۔ جب تک انسان زندہ ہے ان چیزوں کی قیمت وحیثیت ہے دنیا سے جاتے وقت سوائے کفن کی ایک چادر کے اپنے ساتھ نہ کوئی کچھ لے جاسکا ہے نہ لے جاسکے گا۔ سکندر ہو کہ دارا، فغفور ہو کہ تیمور شاہ ہو کہ گداسب خالی ہاتھ آتے ہیں اور خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ پھر رشک وحسد کے کیا معنی؟ اور سامان دنیا کے پیچھے سرگرداں رہنے سے کیا حاصل؟ قبر کے کوٹھڑی سے کسی نہیں ایسی تاریکی جس میں روشنی کی کوئی کرن سوائے ایمان وعمل کے نور کے نہیں پہنچ سکتی۔ ان باتوں کو سن کر سائل اس طرح چلا گیا گویا اسے زندگی کی حقیقت کا علم ہوگیا۔

حقوق العباد

علامہ ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں حضرت انس بن مالکؓ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سناٹے راستے سے گزر رہے تھے، کہ آواز آئی "اے موسیٰؑ!" جناب موسیٰ نے ٹھہر کر دائیں بائیں دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا تو آگے بڑھ گئے تھوڑی دور چلنے کے بعد دوبارہ وہی آواز آئی مگر اس مرتبہ بھی کوئی نظر نہ آیا، تیسری مرتبہ آواز آئی "موسیٰؑ! میں تمہارا معبود تمہارا رب تمہیں پکار رہا ہوں" اتنا سننا تھا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اور وہ فوراً لبیک لبیک کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑے۔ آواز آئی "موسیٰؑ! سر اٹھاؤ" حضرت موسیٰ بیٹھ گئے۔

اب وحی نازل ہونا شروع ہوگئی آواز آئی "موسیٰؑ! اگر تم چاہتے ہو کہ اس دن جس دن اللہ کے عرش کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔ تمہیں عرش کے سایہ میں جگہ ملے تو یتیم کے ساتھ اس طرح پیش آنا جس طرح اس کا حقیقی باپ اگر زندہ ہوتا

تو پیش آتا۔ اور بیوہ کی اس طرح خبر گیری کرنا جس طرح اگر زندہ ہوتا تو اس کا فرض شناس اور ذمہ دار شوہر کرتا؛" آواز آئی: "اے موسیٰ ابن عمران! بندگان خدا پر رحم کیا کرو اگر تم اللہ کے بندوں پر رحم کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر بھی رحم فرمائے گا۔"

"یاد رکھو! جو آدمی جیسا کرتا ہے ویسا ہی اسے بدلہ ملتا ہے۔ مکافاتِ عمل فطرت کا اٹل قانون ہے۔ موسیٰ! اپنی امت قوم بنی اسرائیل سے کہہ دو کہ بنی اسرائیل کا جو فرد اس حالت میں مر کر میرے دربار میں حاضر ہوا کہ وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر تھا۔ تو میں اسے جہنم میں داخل کر دوں گا۔" موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا "اے رب! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں"؟ جواب ملا "موسیٰ میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان سے بڑھ کر عزت والی ذات میں نے پیدا نہیں کی ہے۔ وہ مخلوقات میں مکرم ہیں اور خالق کے نزدیک بھی عزت و اکرام والے ہیں۔

صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وبارک وسلم

صدقہ جاریہ

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں یعنی اب نہ وہ نماز پڑھ سکتا ہے، نہ روزہ رکھنا چاہے تو روزہ رکھ سکتا ہے، نہ اللہ کے راستے میں خرچ کر سکتا ہے، نہ توبہ کر سکتا ہے نہ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لے سکتا ہے۔ مر جانے کے بعد اس کے سارے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ البتہ تین اعمال ایسے ہیں کہ موت کے بعد بھی انسان کو ان کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے ایک صدقہ جاریہ ہے۔ یعنی ایسا عمل

جس کا فیض عرصۂ دراز تک باقی رہے۔ مثلاً اس نے کوئی مسجد بنوادی۔ یا کوئی مدرسہ تعمیر کر دیا یا قائم کر دیا۔ سڑک بنوادی، راستے پر درخت لگوا دیے تاکہ راہگیروں کو سایہ میسر آئے۔

یہ تمام اعمال صدقہ جاریہ کے ضمن میں آتے ہیں کہ جب تک مسجد میں لوگ نماز پڑھتے رہیں گے۔ مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے رہیں گے۔ نہر سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ کنویں سے پانی پیتے رہیں گے مسافر خانے میں قیام کرتے رہیں گے ان کے بنانے والے کو اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ دوسری چیز نفع بخش علم ہے یعنی کسی شخص نے کوئی ایسی کتاب لکھ دی جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں یا لوگوں کو تعلیم دی اور اسی طرح تعلیم و تعلم کے سلسلے میں آغاز کیا تو جب تک لوگ اس کتاب سے دینی فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اس شخص شاگردوں سے علم سیکھتے رہیں گے۔ اس شخص کو اس کا ثواب ملتا رہے گا آپؐ نے فرمایا کہ تیسرا عمل جس کا ثواب مرنے کے بعد بھی انسان کو ملتا رہتا ہے وہ اولاد صالح ہے کہ انسان اپنے لڑکے کی اس طرح تعلیم و تربیت کرے کہ بچہ متقی اور پرہیزگار یا عالم باعمل بن جائے تو جب تک یہ بچہ زندہ رہے گا اور نیکی و پرہیزگاری کے راستے پر قائم رہے گا اللہ تعالیٰ اس کا اجر اس کے والدین کو بھی دیتا رہے گا۔ مزید یہ کہ اگر اولاد صالح ہے تو مرنے کے بعد وہ اپنے والدین کے لیے مغفرت کی دعا کرتا رہے گا اور اس کی دعائے مغفرت اس کے والدین کو پہنچے گی۔

غرضکہ یہ تین اعمال ہیں جو موت کے بعد بھی اپنے اثرات کے اعتبار سے باقی رہتے ہیں۔ صدقہ جاریہ۔ علم نافع۔ اور اولاد صالح۔

ایثار

اہل مدینہ میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی صفوان بن سلیم رحمۃ اللہ علیہ سے کہتا کہ کل قیامت آئے گی اور کسی ذریعہ سے انہیں اس بات کا یقین بھی دلا دیتا کہ واقعۃً کل قیامت آئے گی تو بھی ان کے معمولات عبادت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا کیونکہ وہ پہلے ہی اتنی عبادت و ریاضت کرتے تھے جیسے کہ ان کی زندگی کا آنے والا لمحہ ہی بس آخری لمحہ ہے نیند آنے کے ڈر سے سردیوں کے زمانے میں رات کے وقت کھلی چھت پر عبادت کرتے اور گرمیوں میں کمرے میں۔ پھر بھی دل نہ بھرتا اور اطمینان نہ ہوتا۔ ہر وقت اپنی آخرت کے بارے میں متفکر رہتے تھے ایمان والوں کی شان ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ فکر آخرت سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتے۔ ہر وقت ان کے دل کو ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم ایمان پر خاتمہ بھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ قبر کی پہلی رات کیسے بسر ہوگی؟ نہ جانے مالک کے سامنے حاضری کس حال میں ہوگی۔

جناب صفوان بن سلیمؒ اتنے بڑے عالم، عابد، مجتہد اور تابعی تھے۔ مگر ان تفکرات سے خالی نہیں تھے۔

ان کی صاحبزادی کا بیان ہے کہ جس وقت میرے والد پر نزع کا عالم طاری ہوا وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ بدن کی کپکپاہٹ اور سانس کی بے ربطی سے لوگوں نے اندازہ لگایا کہ آپ کا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا اور بستر پر لٹایا تو روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ جس وقت میرے والد پر نزع کا عالم طاری ہوا وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ کر انہیں سنبھالا اور بستر پر لٹایا تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ جس وقت حضرت صفوان رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے شام سے ایک شخص مدینہ منورہ آیا اور لوگوں سے کہنے لگا۔ لوگو! مجھے صفوان بن سلیمؒ کا پتہ بتاؤ۔ میں ان سے ملاقات کرنے کے لیے اتنی طویل مسافت طے کر کے

آرہا ہوں۔ ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ کسی نے دریافت کیا۔ آخر تو ان سے ملاقات کرنے کا اتنا خواہش مند کیوں ہے؟ اس نے بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ وہ ایک شخص کو قمیص پہنانے کی وجہ سے جنت میں داخل ہو رہے ہیں میں در حقیقت ان سے اپنے خواب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آخر اس نے حضرت صفوان سے دریافت کر لیا۔ صفوان بن سلیمؒ تھوڑی دیر تو خاموش رہے لیکن جب شام کے اجنبی نے بہت زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ بھائی! بات کچھ نہیں ہے۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ میں ایک رات جبکہ سخت سردی پڑ رہی تھی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو کیا دیکھا کہ ایک شخص ننگے بدن مسجد کے باہر کھڑا کانپ رہا ہے۔ مجھ سے اسکی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ میرے بدن پر ایک کرتا تھا اتارا اور اسے پہنا دیا اور خود ٹھٹھرتے ہوئے گھر چلا آیا۔

اپنے مسلمان بھائی کی حالت کو اپنی حاجت پر ترجیح دینے کا یہ عمل شاید اللہ تعالیٰ کو پسند آگیا ہو اور تو نے یہ خواب دیکھا ہو۔

نیّت کی اہمیّت

اعمال کی صحت کے لیے نیت کی درستی اہم ترین شرط ہے بڑے سے بڑا عمل بارگاہ خداوندی میں مردود ہے اگر نیت درست نہ ہو اور چھوٹے سے چھوٹا عمل مقبول ہوتا ہے اگر نیت صالح ہو اور اس عمل سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تمام اعمال کی بنیاد نیت پر ہے۔ اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ نیت کرے۔ اعمال پر نیت اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ عمل کا حکم تک تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر ایک شخص دن بھر بھوکا پیاسا رہے اور روزے کی نیت نہ کرے تو اس کے بھوکے پیاسے رہنے کا اس کو کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا اور اگر یہی عمل روزے کی نیت سے کرے تو یہ بھوک اور

پیاس تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لاکھوں روپیے بغیر زکوٰۃ کی نیت کئے ہوئے خرچ کر ڈالے تو انفاق فی سبیل اللہ کا ثواب اسے ضرور ملے گا لیکن زکوٰۃ بہر صورت اس کے ذمہ باقی رہے گی۔ صحت نیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے پیش نظر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہو۔ اور اس عمل کے انجام دینے میں نفس کی خواہش یا دکھاوا شامل نہ ہو۔ اگر کسی نیکی کے کام میں نفسانی خواہش یا دکھاوا شامل ہو جائے تو اس کام سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ دل، آدمی کا دل راہ راست سے منحرف ہو جاتا ہے معلوم ہوا کہ یہ منزل نہایت اہتمام کی منزل ہے۔ ہر کام کو شروع کرنے سے پہلے نیت کو درست کرنے کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول لے کہ کہیں اس میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی کھوٹا سکہ کیسے چل سکتا ہے۔ وہ دلوں کا بھید جاننے والا اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کرنے والا ہے۔ ہر کام سے پہلے یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ اس کا محرک اللہ تعالیٰ کی یہ رضا ہے یا کوئی نفسانی خواہش؟ یہاں تو عالم یہ ہے کہ خالص دنیا داری کا کام بھی اگر مالک کی رضا کی خاطر کیا جائے تو وہ عبادت بنجاتا ہے اور نماز بھی دنیا کو دکھانے کے لیے پڑھی جائے تو قیامت کے دن وہ نماز نمازی کے منہ پر ماردی جائے گی۔ داورِ محشر کا دربار دربارِ عالی ہے اس کے حساب وکتاب کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے سچی نیت کے ساتھ تھوڑا بہت عمل کئے جاؤ اور اس کی رحمت سے آس لگائے رہو کہ وہ اپنی رحمت سے آس لگانے والوں کو کبھی محروم نہیں کرتا۔

غرور کا انجام

کسی طاقت ور کو پچھاڑ دینا یا کسی ملک کو فتح کر لینا حقیقی معنوں میں مردانگی نہیں ہے اصل مردانگی تو یہ ہے کہ دولت، عزت اور مرتبۂ واقتدار ملنے کے بعد انسان اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھے اور خلق خدا کو آرام وسکون پہنچائے۔ کیونکہ دولت

اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ آج ہے کل نہیں ہو گی۔ البتہ نیک نام اور اچھا عمل زندہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آخر زمانے میں قوم کے سردار ایسے لوگ ہوں گے جنہیں نہ خدا کا ڈر ہو گا اور نہ مجھے یاد کریں گے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھ اور زبان سے تکلیف دیں گے اور ان کی ایذا کے درپے رہیں گے۔ خواجہ عمر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک دن میں صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے قریب کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ پر سوار ہے۔ صورت شکل سے وہ کوئی معزز و مالدار سردار لگتا تھا۔ اس کی سواری کے آگے پیچھے نوکروں اور غلاموں کی ایک فوج ظفر موج تھی۔ مالک انتہائی فخر و غرور سے سواری پر بیٹھا تھا اور اس کے نوکر غلام لوگوں کو تنگ کر رہے تھے۔ اپنے غلاموں کو منع کرنے کی بجائے وہ سردار سواری پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ خواجہ عمر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ منظر دیکھا اور کچھ دنوں کے بعد اسے بھول گیا۔

ایک مدت کے بعد ایک دن میں بغداد کے پل پر سے گزر رہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا چیتھڑوں میں لپٹا۔ پراگندہ حال۔ ننگے پیر ننگے سر۔ پل کے کنارے کھڑا ہے۔ صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس آدمی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے غور سے اسے دیکھنے لگا اور اپنے دماغ پر زور دینا شروع کیا مجھے یاد آیا کہ شاید یہ وہی آدمی ہے جسے میں نے صفا مروہ کے قریب غلاموں کے جھرمٹ میں اونٹ پر سوار دیکھا تھا۔ اس شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ غور سے مجھے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں نے اپنا شبہ ظاہر کر دیا۔ اس پراگندہ حال آدمی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کہا۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں وہی آدمی ہوں جسے تم نے مکہ میں دیکھا تھا۔ میں نے غرور کا سر بلند کیا تھا۔ اپنے مال و مرتبہ اور خدم و حشم پر ناز کرتا تھا۔ اپنی قوت و اقتدار کے ذریعہ میں لوگوں کو ایذا پہنچاتا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے ذلیل و خوار اور بے عزت و بے حرمت کر دیا اے شخص! اب میں دوسروں کے لیے

سامان عبرت ہوں۔

مرض کی تکلیف پر رضا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے مجمع میں تشریف فرما تھے کہ یک بیک آپ مسکرانے لگے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرام کو اشتیاق ہوا کہ آپ کے تبسم فرمانے کی وجہ معلوم کریں مگر کسی میں ہمت نہ ہوتی تھی کہ آپ سے دریافت کرے اور آپ تھے کہ مسکرائے چلے جارہے تھے۔ آخر ایک شخص نے جرأت کر کے آپ سے دریافت کر ہی لیا کہ "سرکار! کیا بات ہے کہ آپ اتنی دیر سے تبسم فرمارہے ہیں"؟ آپ نے فرمایا "مجھے آج اس مومن بندے پر تعجب ہو رہا ہے جو بیمار ہونے کو ناپسند کرتا ہے کیونکہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ بیماری میں کیا ملتا ہے تو وہ صحت کے مقابلے میں بیمار رہنے کو زیادہ پسند کرنے لگے"۔ یہ سن کر صحابہ کرام مزید حیران ہو گئے آپ نے یہ کیسی بات ارشاد فرمادی۔ آپ نے فرمایا "مجھے ان دو فرشتوں پر تعجب ہو رہا ہے جو اللہ کے ایک بندہ مومن کو ڈھونڈتے ایک مسجد میں گئے جہاں وہ بندہ پنج وقتہ نماز ادا کرتا تھا مگر اسے وہاں نہ پایا اس لئے کہ وہ بیماری کی وجہ سے اس دن مسجد میں نہ آیا تھا۔ دونوں فرشتے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا بارالٰہی! تیرا فلاں بندہ فلاں مسجد میں پانچوں وقت نماز ادا کرتا تھا لیکن آج وہ مسجد میں حاضر نہ تھا۔ ہم نے پتہ لگایا تو معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہے اب حکم دیے کہ ہم کیا لکھیں؟ کیونکہ وہ نماز میں حاضر تو نہیں تھا جواب ملا۔ فرشتو! اس کے نامۂ اعمال میں آج کی نماز کی حاضری درج کرو بلکہ جب تک وہ تندرست ہو کر مسجد میں حاضری کے قابل نہ ہو جائے اس کے سابقہ معمول کے مطابق اس کی حاضری درج کرتے چلے جاؤ کیونکہ اگر وہ تندرست ہوتا تو ضرور آتا۔ مرض میں نے دیا ہے اور مرض ہی کی وجہ سے وہ معذور ہو گیا۔ لہٰذا میں اسے عمل کے اجر سے محروم کیوں کروں"۔

اللہ اللہ رب العالمین کی بندہ پروری و کرم گستری کہ بغیر عمل کے محض بندے کی عادت اور جذبہ شوق کی بنا پر اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج کراتا ہے۔ مرض اگرچہ تکلیف دہ چیز ہے اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرتے رہنا چاہیے کہ ہم ناتواں بندے اس کی آزمائش کے قابل نہیں اس بارگاہ میں تو بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے تاہم اگر کوئی بندۂ مؤمن مرض کی آزمائش میں مبتلا ہو جائے اور اپنے مالک کی رضا پہ راضی رہے تو انشاء اللہ اعمال کے اجر سے محروم نہ ہو گا۔

موت کا خوف اور مسلمان

معمول کے خلاف اس دن مجمع بہت زیادہ تھا۔ اور اس مجمع میں بڑی خوبی یہ تھی کہ ایسے جلیل القدر صحابۂ اکرم موجود تھے جنہوں نے عرصے تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض حاصل کیا تھا۔ آپؐ کے ساتھ مشکلات و مصائب کا مقابلہ کیا مگر راہِ حق سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے۔ دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹے اور مسکراتے رہے۔ مگر ایک مرتبہ جب کلمۂ اسلام پڑھ لیا تو پھر سب کچھ بھول گئے۔ بس اللہ کے ہو رہے۔ اسی کے در کے سوالی اور اسی کا نام جپنے والے۔ یہ عظیم مجمع دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "لوگو! میری امت پر ایک وقت ایسا بھی آنے والا ہے جب دوسری قومیں اس پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں"۔

ایک صحابی نے سوال کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیک کیا اس وقت مسلمان تعداد میں اتنے کم ہوں گے کہ انہیں دوسری قومیں نگل لینے اور فنا کر دینے کے لئے متحد ہو کر ٹوٹ پڑیں گی"؟

ارشاد ہوا "نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے تو اس وقت مسلمان بہت زیادہ ہوں گے البتہ تم اس وقت سیلاب کے جھاگ کی طرح ہو جاؤ گے اور

تمہارے دشمنوں کے سینے سے تمہارا رعب و دبدبہ نکل جائے گا اور تم پست ہمت اور شکستہ دل ہو جاؤ گے یہی نہیں بلکہ یہ پست ہمتی تمہارے دل میں گھر کر لے گی"۔

ایک صحابی سے نہیں رہا گیا - دریافت کیا۔ "سرکار! صلی اللہ علیک آخر یہ تو بتائیں کہ یہ پست ہمتی پیدا کیوں ہو جائے گی"۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "یہ اس لئے کہ اس وقت مسلمان آخرت سے محبت کرنے کی بجائے دنیا سے محبت کرنے لگیں گے اور خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو کے بجائے مسلمان موت سے بھاگنے اور نفرت کرنے لگیں گے"۔

ایک وقت وہ تھا کہ اقوام عالم کی برادری میں مسلمان تعداد کے اعتبار سے آٹے میں نمک کے برابر تھے - مگر ان کے قدم اٹھتے تو زمین دہل جاتی اور کفر کے محل میں زلزلہ آجاتا - وہ طوفانوں کا رخ موڑ دیا کرتے سمندروں کی لہر تبدیل کر دیتے - ان کا وجود مسعود کمزور اقوام و طبقات کے لئے ابر رحمت تھا اس لئے کہ وہ متحد تھے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر قدم بڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے مگر آج تو گھر گھر میں جھگڑا ہے اسی لئے قبائے ملت تار تار ہے۔ اور دشمن اقوام دسترخوان کی طرح ان پر ٹوٹی پڑ رہی ہیں - صدق رسولہ النبی الکریم -

قسم کی اہمیّت

آٹھ سو درہم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا غلام بیچ دیا - خریدار جب غلام کو لینے لگا تو اس نے شرط لگائی کہ اگر غلام میں کوئی عیب ہو گا تو میں واپس

کر دونگا جناب عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس عیب کی بنا پر سودے کی واپسی ہو گی جو اس دوران اس میں تھا جب وہ میرے پاس تھا اگر تیرے قبضے میں رہتے ہوئے کوئی عیب پیدا ہو گیا مثلاً کسی حادثے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی یا چوٹ لگنے کے سبب اندھا ہو گیا تو میں اُس کا ذمے دار نہیں ہوں گا اور اس وقت واپسی ممکن نہ ہو گی۔ خریدار نے اچھی طرح غلام کو دیکھا بھالا۔ قیمت ادا کی اور غلام کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ کافی دنوں بعد ایک دن وہ غلام کے ہمراہ آیا اور کہا کہ اسے واپس لے لیں کیونکہ اس میں فلاں عیب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو فوراً پتہ چل گیا کہ یہ عیب تو غلام میں اس وقت پیدا ہوا جب وہ خریدار کے قبضے میں تھا۔ واپس لینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس بات کی شرط تو انہوں نے خرید و فروخت کا معاملہ طے کرتے وقت ہی عائد کر دی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ خریدار سیدھا ان کے دربار میں حاضر ہوا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔

امیر المومنین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جناب ابن عمرؓ کو طلب فرمایا اور اُن سے دریافت فرمایا کہ خریدار جو عیب غلام میں بتا رہا ہے یہ عیب اُس وقت اِس میں موجود تھا جب یہ تمہارے پاس تھا؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔ خلیفہؓ نے فرمایا قانون ہے کہ انکار کرنے والے کو قسم اٹھانی پڑتی ہے آپ قسم کھائیں کہ غلام میں یہ عیب اس وقت موجود نہیں تھا جب یہ آپ کے قبضے میں تھا۔ حضرت عبداللہؓ نے قسم کھانے سے انکار کر دیا اور خریدار کو آٹھ سو درہم واپس کر دیئے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے قسم کھانے سے انکار کیوں کر دیا فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بات بات پر قسم کھانے والے ذلیل شخص کی بات نہ مانا کرو" اس لئے میں نے قسم نہیں کھائی۔ غلام کو گھر لے گئے علاج کروایا۔ وہ تندرست ہو گیا تو اسے پندرہ سو درہم میں فروخت کیا موطا امام مالکؒ کی شرح زرقانی میں لکھا ہے کہ یہ سات سو درہم ابن عمرؓ کو زیادہ اس لئے ملے کہ باوجود سچے ہونے کے انہوں نے

قسم کھانے سے پرہیز کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی تھی اس کا تو اجر ملنا ہی تھا۔

امر بالمعروف ونہی المنکر

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا!

ایک آبادی کے سارے لوگ گناہوں میں ملوث ہو گئے۔ کوئی کسی طرح کا گناہ کرتا اور کوئی کسی طرح کا۔ لگتا جیسے کہ ساری بستی پر تاریکی چھا گئی ہے نہ والدین کو اولاد کی فکر تھی نہ اولاد کو والدین کے حقوق و آداب کا خیال تاجر بے ایمان۔ مزدور کام چور۔ حکام رشوت خور۔ عامل ظالم۔ عالم بندۂ زر غرضکہ آوے کا آوا ہی بگڑ چکا تھا البتہ ساری بستی میں صرف چار نیک لوگ تھے وہ ان لوگوں سے بالکل ہی مختلف نیک سیرت متقی دیانت دار اور ایماندار تھے جب انہوں نے بستی کی یہ حالت دیکھی تو ان میں سے ایک شخص نے بستی والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور ان کی غلط کاریوں پر تنبیہ کی مگر ان لوگوں نے اس کا حکم مانا نہ اپنی اصلاح کی بلکہ اس کو الٹے گالیاں دینا شروع کر دیں اس مردِ خدا سے برداشت نہ ہوا اس نے بھی جواباً انہیں گالیاں سنائیں انہوں نے حملہ کیا اور اس نیک سیرت شخص کو مار پیٹ کر بستی سے نکال دیا یہ حال دیکھ کر دوسرا نیک مرد کھڑا ہوا اور اس نے انہیں نصیحت کی مگر انہوں نے اس کا حکم بھی نہ مانا اور اسے برا بھلا کہا۔ اس سے برداشت نہ ہوا اور جواباً اس نے بھی انہیں برا بھلا کہا اور بستی سے رخصت ہو گیا۔ پھر تیسرا مرد صالح اٹھا اس نے بھی نصیحت کی اور جب لوگوں نے اس کی نصیحت پر بھی کان نہ دھرے تو اس نے بھی بستی کو خیر باد کہہ دیا اپنے تین ساتھیوں کا حشر دیکھ کر چوتھے نے کچھ نہیں کہا اور چپ چپاتے بستی سے چلا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چوتھا آدمی سب سے کم درجے کا انسان تھا کہ اس نے کلمہ حق بلند کیا نہ راہ حق میں مصائب جھیلے صرف کنارہ کشی اختیار

کر لی حق کی راہ تو کانٹوں بھری راہ ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا تو انبیاء علیہم السلام کی سنتِ راشدہ ہے یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضور! کیا ایسی بستی پر بھی عذاب نازل ہو سکتا ہے جس میں اللہ کے نیک بندے ابھی موجود ہوں آپ نے ارشاد فرمایا ہاں! پوچھا گیا کیوں؟ آپ نے ارشاد فرمایا اس لئے کہ وہ نیک بندے گناہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ روکتے ٹوکتے نہیں ہے

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز۔ نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود۔ ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

کمال دیانت

جب بازار میں خریدار اور دکاندار کے درمیان تکرار ہونے لگی تو کافی لوگ جمع ہوگئے مگر یہ دیکھ کر سب حیران تھے کہ یہ تکرار زیادہ نفع اٹھانے پر نہیں بلکہ زیادہ نقصان اٹھانے پر ہو رہی ہے۔

حضرت محمد بن منکدرؒ مشہور تابعی کپڑے کے ٹکڑوں یعنی کٹ پیس کی تجارت کرتے تھے انہوں نے چند ٹکڑوں کی قیمت دس درہم اور چند کی پانچ درہم مقرر کر رکھی تھی۔ دس درہم اور پانچ درہم کے ٹکڑے الگ الگ رکھے ہوئے تھے حضرت محمد بن منکدرؒ رحمۃ اللہ علیہ کسی ضرورت سے دکان سے اٹھ کر گئے۔ ان کا غلام دکان پر موجود تھا گاہک آیا اور غلام نے بھولے سے پانچ درہم کے ٹکڑے دس درہم میں فروخت کر دیئے جب جناب ابن منکدرؒ تشریف لائے اور انہیں یہ بات معلوم ہوئی تو ایسا لگا جیسے کہ وہ حواس باختہ ہو گئے ہوں غلام سے خریدار کا حلیہ دریافت کیا اور دن بھر

بازار میں اسے ڈھونڈتے پھرے آخر بڑی تلاش وجستجو کے بعد وہ خریدار ملا تو اسے اپنے ساتھ دکان پر لے آئے اور فرمایا کہ بھائی غلطی سے میرے غلام نے پانچ درہم کے کپڑے کو دس درہم میں تیرے ہاتھ فروخت کر دیا ہے اس لئے تو یا تو پانچ درہم مجھ سے واپس لے لے یا اپنے دس درہم لے کر کپڑا مجھے واپس کر دے۔ خریدار ہنسنے لگا اس نے کہا حضرت! میں اس خرید و فروخت پر راضی ہوں کوئی حرج نہیں اگر میں نے پانچ کی بجائے دس درہم دے دیئے مجھے یہ ٹکڑا پسند ہے۔

حضرت محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر میں تو اس پر راضی نہیں کہ تجھ سے زیادہ رقم مل جائے۔ اب خریدار و دکاندار میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ لوگوں نے کہا حضرت! جب خریدار دس درہم پر راضی ہے تو آپ کو اعتراض کیوں ہے؟ محمد بن منکدرؒ نے فرمایا۔ لوگو! مجھے اس وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یاد آ رہی ہے کہ "اس شخص کا ایمان کامل نہیں جو اپنے بھائی کے لئے وہ بات پسند نہیں کرتا جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" میں اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا پانچ درہم کی چیز کے دس درہم دینا مجھے اپنی ذات کے لئے پسند نہیں تو میں اس شخص کے لئے کیسے گوارا کر لوں۔ آخر ان کے اصرار پر خریدار نے پانچ درہم واپس لے لئے تب اس کی جان چھوٹی۔ اہلِ بازار نے بیک زبان کہا "یہ ہیں محمد بن منکدرؒ امین، مومن کامل۔ تاجر صادق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح تابع دار۔

ایک انوکھا دکاندار اور خریدار

والدہ کی وفات کے بعد جناب محمد بن سوقہ رحمۃ اللہ علیہ کو ترکے میں جب ایک لاکھ درہم ملے تو ایسا لگا جیسے کہ ان پر بہت بڑی مصیبت آن پڑی۔ خوشی کے بجائے وہ سخت پریشانی میں گرفتار ہو گئے۔ آخر میں اتنے روپوں کا کروں گا کیا؟ شاید مجھ سے

کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ذمہ داری میں گرفتار کر دیا ہے۔ میں ایک درویش، پڑھنے پڑھانے والا آدمی دن رات حدیث کا درس دیتا ہوں اور طالبانِ دین کو فیض یاب کرنا میرا کام۔ ایک دو روٹی کھالی دن بسر ہوگیا۔ درس کی مشغولیت۔ آخر میں اتنے پیسے کروں گا کیا؟ جلد ہی محمد بن سوقہؒ نے فیصلہ کر لیا مجھے مال کے اس انبار سے چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیئے۔ مال جتنا زیادہ ہوگا حساب اتنا زیادہ دینا ہوگا۔ میں اپنی گردن کیوں پھنساؤں۔ علاقے کے فقراء اور مساکین کو خبر دے دی گئی اور جو آیا اسکی جھولیاں بھر دی گئیں یہانتک کہ جمعہ کا دن آتے آتے محمدؒ بن سوقہؒ کے پاس صرف سو درہم رہ گئے محمد بن سوقہؒ نے سوچا کہ اس رقم کو کسی کاروبار میں لگا دینا چاہیئے تاکہ اس کی آمدنی سے بسر اوقات کا سامان ہو سکے۔ غزوان سے انہوں نے ریشمی کپڑا خریدا۔ اس زمانے میں عراق میں ریشمی کپڑا وزن کر کے خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ جب محمد بن سوقہؒ نے وہ کپڑا خریدا تھا۔ تو اس کی قیمت ایک سو درہم تھی گھر لا کے اس کو وزن کیا تو وزن بڑھ گیا خیال ہوا کہ غزوان نے تول کر بیچنے میں غلطی کی۔ اسی وقت محمد بن سوقہؒ وہ کپڑا لے کر غزوان کے پاس گئے اور کہا کہ آپ سے بھول ہوگئی۔ اس کا تو وزن بہت زیادہ ہے۔ میں نے تو ایک سو درہم کا کپڑا خریدا تھا اور اب اس کا وزن تو اتنا زیادہ ہے کہ اس کی قیمت تین سو اشرفی بنے گی۔ غزوان نے کپڑا لے کر دوبارہ تولا تو وزن ٹھیک تھا۔ محمد بن سوقہؒ نے زیادہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وزن میں جو زیادتی ہو رہی ہے وہ تم لے لو غزوان نے کہا کہ میں زیادہ کیوں لوں کیا مجھے اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہی کرنی نہیں پڑے گی؟ خریدار کا اصرار تھا کہ زیادتی واپس لے لو دوکاندار کہہ رہا تھا کہ میں زیادتی واپس کیوں لوں؟ خوفِ خدا دونوں پر طاری تھا۔ دونوں قیامت کے دن مالک کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈر رہے تھے دونوں کم تولنے کے آداب سے واقف تھے دونوں یہ جان رہے تھے کہ اگر میں نے ایک پیسہ بھی کسی کا ناحق لیا تو ایک پیسے کے عوض سینکڑوں قبول شدہ نمازیں قیامت کے دن چھین لی جائیں گی۔ آخر غزوان نے کہا کہ محمدؒ تم لے لو اگر تمہارے مال میں کچھ زیادہ چلا بھی جائے تو میں اپنا

حق معاف کرتا ہوں ۔ ناچار محمد بن سوقہ رحمۃ اللہ علیہ نے وہ کپڑا قبول کر لیا۔ کہاں گئے وہ خریدار اور وہ دکاندار؟ ان مثالوں کو سامنے رکھ کر آج ذرا بازاروں کا حال دیکھیں۔ ایک لوٹ مچی ہوئی ہے ۔ برکت و رحمت آئے تو کہاں سے آئے؟

قرض کی ادائیگی

حضرت محمد ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ تجارت کیا کرتے تھے اور چونکہ وہ رزق حلال کا بہت اہتمام کرتے اس لئے لوگوں کے دلوں میں ان کا وقار و احترام تھا ایک مرتبہ انہوں نے ۴۰ ہزار روپے کا خوردنی تیل ایک شخص سے ادھار لیا لیکن اس وقت جب کہ ان کے آدمی تیل کو بازار میں لانے کے لئے لاد رہے تھے ایک بہت بڑے پیپے سے ایک مرا ہوا چوہا نکلا۔ محمد ابن سیرین سے سوچا کہ ممکن ہے یہ مرا ہوا چوہا اس پیپے میں تاجر کے اسٹاک سے آگیا ہو؟ اس اعتبار سے تو سارا تیل ناپاک اور انسانی صحت کے لئے مضر ہو گیا ہو گا۔ یہ خیال کر کے انہوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سارے کے سارے تیل کو ضائع کر دیا جائے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے ان کے منشی نے ان کو مشورہ دیا کہ حضرت اس طرح تو بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ آپ ایسا کریں کہ جس پیپے سے مرا ہوا چوہا برآمد ہوا ہے اس کے تیل کو ضائع کروا دیں اور باقی تیل کو فروخت کریں۔

محمد ابن سیرین نے فرمایا کہ مرا ہوا چوہا نکل جانے کی وجہ سے سارے کا سارا تیل مشکوک ہو گیا۔ اور میں تھوڑے سے مالی فائدے کی خاطر اپنے مسلمان بھائیوں کو مشکوک چیز نہیں کھلا سکتا۔ تیل ادھار کا تھا اور چونکہ محمد ابن سیرین کی ایسی مالی حیثیت نہیں تھی کہ جس مہاجن سے تیل خریدا تھا اسے رقم ادا کر دیتے اس لیے مہاجن نے ان پر دعویٰ کر دیا اور چونکہ محمد ابن سیرینؒ رقم نہیں ادا کر سکتے تھے اس لیے

اس کی پاداش بھی انہیں جیل بھیج دیا گیا محمد ابن سیرین جیسا اللہ کا نیک بندہ جب جیل میں گیا تو ایسا لگا جیسے کہ جیل کے در و دیوار رنجیدہ ہو گئے ہوں جیل کا پہریدار محمد ابن سیرینؒ کو پہچانتا تھا اس لیے وہ ان کا بہت ادب کرتا۔ اور عام قیدیوں کی طرح ان کے ساتھ سختی نہیں کرتا تھا ایک دن اس نے موقع پاکر حضرت محمد ابن سیرینؒ سے عرض کیا۔

حضرت! مجھ سے آپ کی یہ پریشانی دیکھی نہیں جاتی آپ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد اپنے گھر چلے جایا کریں اور صبح کو چلے آیا کریں اس طرح آپ کو ہر رات آرام کرنے کا موقع مل جایا کرے گا۔ اپنے خیال کے مطابق اس پہریدار نے حضرت ابن سیرین کو اچھا مشورہ دیا تھا مگر ابن سیرین نے اس کے مشورہ کو پسند نہیں فرمایا اور ارشاد فرمایا میرے بھائی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جیل میں کیوں بند ہوں میں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ مسلمانوں کے حق میں خیانت کروں بھلا میں سلطانی حق میں خیانت کس طرح کر سکتا ہوں کہ قاضی کے فیصلے کے مطابق تو مجھے دن رات جیل میں رہنا چاہیئے۔ اب اگر میں رات کو اپنے گھر چلا جاؤں تو میرا یہ عمل قانون کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے سلطانی خیانت بن جائے گا۔ جس کی جواب دہی مجھے حشر کے دن کرنی پڑے گی۔

خوفِ خدا اور کمالِ دیانت

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ گرامی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، صبح صبح چند دوستوں کے ہمراہ مدینہ منورہ کے مضافاتی علاقے میں سیر کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اتفاقاً کھانے کا وقت ہوا اور دسترخوان بچھایا گیا تو ان کی نگاہ ایک چرواہے پر پڑی جو بکریاں چرا رہا تھا اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور چرواہے کے پاس جاکر اسے کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چرواہا ایک غلام تھا۔ اس

نے معذرت کر دی اور کہا کہ میں نفلی روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کے اس رویہ سے بے حد مسرور ہوئے کہ اتنی شدت کی گرمی کی بھی یہ نفل روزہ رکھ رہا ہے لیکن یہ حضرات انسان کی صرف عبادات سے متأثر ہونے والے نہیں تھے کیونکہ عبادات کے ساتھ ساتھ وہ معاملات میں دیانت داری کو اہمیت دیا کرتے تھے اس کے تقویٰ کو آزمانے کے لیے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا کہ ان بکریوں میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دو میں تمہیں اس کی قیمت بھی دوں گا اور گوشت بھی۔ غلام نے کہا۔ ان بکریوں کا مالک میں نہیں ہوں۔ میرا آقا ان کا مالک ہے سیدنا ابن عمرؓ نے فرمایا۔ بکری فروخت کر دو۔ تمہارا آقا یہاں کہاں ہے تمہارا کیا کرے گا؟ غلام ابن عمرؓ کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ نہ اسے علم تھا کہ اس کے تقویٰ کا امتحان لیا جا رہا ہے حضرت ابن عمرؓ کی بات سن کر اس نے پیٹھ پھیر لی اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آقا نہیں تو کیا ہوا خدا تو ہے وہ کہاں چلا جائے گا۔ غلام کا جواب سن کر حضرت ابن عمرؓ کو اس کے جوہر ایمانی کا اندازہ ہوا۔ غلام سے اس کے آقا کا پتہ پوچھا اور اس سے ملاقات کر کے اس غلام کو بکریوں سمیت خرید لیا۔ غلام کو آزاد کر دیا اور ساری بکریاں اس کے حوالے کر دیں۔ فرمایا " ایسا دیانت دار شخص غلام بن کر رہنے کے قابل نہیں کہ معاملات میں دیانتداری ہی اصل ایمان ہے "

اولاد کی تربیت

سفر میں جانے کا پروگرام تھا اس لئے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ میں فلاں دن سفر میں جاؤں گا اور باہر آ کر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے فلاں دن سفر کرنا ہے اس لئے سامان تیار کر دیں۔ حضرت انسؓ نے تیاری شروع کر دی۔ آج کل سفر کی جو سہولتیں

میسر ہیں اس زمانے میں نہیں تھیں۔ سواری کا انتظام، سواری کے چارے پانی کا انتظام زادِ راہ اور رفیق سفر کا اہتمام۔ یہ سارے مرحلے تھے گو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سامان سفر کی تیاری میں بہت عجلت سے کام لیا۔ مگر وسائل کی کمی کے سبب مکمل سامان تیار نہ ہو سکا یہاں تک کہ وہ دن آن پہنچا جس دن حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو سفر کرنا تھا۔ انہوں نے جناب انسؓ کو بلا کر دریافت کیا کہ کیا تیاری مکمل ہو گئی؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ امیر! تیاری تو ہو گئی ہے مگر کسی قدر نامکمل ہے اس لیے اگر آپ دو ایک دن اور ٹھہر جاتے تو میں سامان مکمل کر دیتا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا" میں گھر والوں سے کہہ چکا ہوں کہ فلاں دن سفر میں جاؤں گا اب اگر میں نہیں جاتا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ان سے جھوٹ بولتا ہوں انسؓ! اگر میں اپنے بال بچوں سے جھوٹ بولوں تو وہ بھی مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔ میں اگر خیانت کروں تو وہ بھی خیانت کریں گے اگر میں ان سے وعدہ خلافی کروں تو وہ بھی مجھ سے وعدہ خلافی کریں گے۔ میرے اہل خانہ تو میرے ہی کردار کے سانچے میں اپنے کردار کو ڈھالیں گے۔ لہٰذا اگر میری خواہش ہے۔ اور بے شک میری یہ خواہش ہے کہ میرے متعلقین راست باز۔ دیانت دار۔ وعدے کی پابندی کرنے والے۔ عہد کے پورے پکے ہوں تو مجھے ان کے سامنے مثالی کردار کا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ سامان کی کمی کی وجہ سے راستے میں تھوڑی بہت تکلیف ہو گی لیکن میں وعدہ خلافی نہ کروں گا۔ یہ فرمایا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ تھے وہ باپ جنہوں نے آنے والی نسل کے لیے بہترین نمونہ عمل چھوڑا۔ عہد کو نباہنے والے۔ بات کے دھنی۔ صادق الوعد۔

انفاق فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کی حقیقت منعم کے انعام پر شکر گزاری ہے۔ زکوٰۃ اتمام نعمت پر واجب ہوتی ہے یعنی جب کسی کے پاس دو سو درہم ہوں اور ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہیں تو اس پر از روئے شریعت پانچ درہم واجب ہوتے ہیں اسی طرح سونے چاندی، مال و اسباب، تجارت، کھیت کی پیداوار اور مویشیوں کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن زکوٰۃ کا اطلاق محدود نہیں ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مال کی زکوٰۃ کی طرح جاہ مرتبے پر بھی زکوٰۃ واجب ہے یعنی اللہ تعالےٰ نے اگر تمہیں کوئی مرتبہ بخشا ہے اور عہدہ دیا ہے تو اس کی زکوٰۃ یہ ہے کہ تم اپنے مرتبے اور عہدے سے خلق خدا کو فائدہ پہنچاؤ۔ مظلوموں کی دادرسی کرو، بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرو مفلوک الحال لوگوں کی مالی امداد کرو۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مکان کی زکوٰۃ مہمانداری ہے صحت و تندرستی کی زکوٰۃ یہ ہے کہ اپنے اعضا کو انسان خدا کی بندگی میں مشغول رکھے اور کسی فضول کام ایذا رسانی، ظلم و تعدی اور کمزوروں کو ستانے میں صرف نہ کرے۔ ایک مرتبہ ایک ظاہری عالم نے حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ زکوٰۃ کتنے مال پر واجب ہوتی ہے۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہارا مسئلہ بیان کروں یا اپنا، عالم نے پوچھا اس کا مطلب کیا ہے، فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو سو درہم پر ایک سال گزر جائے تو پانچ درہم زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی لیکن میرے مسلک کے مطابق تو بھی کوئی چیز اپنی ملکیت میں رکھنی ہی نہیں چاہیے کہ زکوٰۃ کا سوال پیدا ہو۔

عالم نے دریافت کیا کہ اس مسلک میں آپ کا امام کون ہے؟ جناب ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس مسلک میں میرے امام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ غزوہ تبوک کے موقع پر اپنے گھر کا سارا اثاثہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے قدموں پر لا کر ڈھیر کر دیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ابو بکرؓ تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے گھر میں کیا چھوڑا ہے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ ان کے لیے اللہ اور اس کے رسولؐ کافی ہیں۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

حق ہمسائیگی

دس سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ نہیں ہے مگر اس دس سال کے عرصے میں سخت تکلیف کے باوجود امام ابو حنیفہؒ نے کبھی اپنے یہودی پڑوسی سے شکایت نہیں کی اور خاموشی سے تکلیف برداشت کرتے رہے۔ ان کے یہودی پڑوسی کے مکان کی نالی امام صاحبؒ کے صحن سے گزرتی تھی اور اس کی نالی میں گندگی بہتی رہتی تھی جب کبھی نالی گندگی کی وجہ سے اٹ جاتی تو کبھی امام صاحبؒ خود اسے صاف کر دیتے یا کسی مزدور سے صاف کروا دیتے۔ مگر حرفِ شکایت زبان پہ نہ آتا۔ یہودی بے چارہ بھی کیا کرتا وہ قصوروار نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس سارے دس سال کے عرصے میں اسے نالی کے اٹ جانے یا کوڑے کرکٹ کے جمع ہو جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اتفاقاً ایک دن کسی ضرورت سے اس کی باندی امام صاحبؒ کے صحن میں آئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مزدوروں کے ساتھ نالی کے صاف کرنے میں امام صاحبؒ بھی لگے ہوئے ہیں۔ لونڈی امام صاحبؒ کی علمی وجاہت، شہرت اور مرتبہ سے واقف تھی۔ اس نے تو سر پیٹ لیا اور بھاگم بھاگ اپنے آقا کے پاس آئی اور ساری روداد سنائی۔

یہودی پڑوسی اگرچہ یہودی تھا لیکن امام صاحبؒ کے حسن اخلاق اور شرافت سے

بہت متاثر تھا اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ معلوم کر کے نہایت شرمندہ ہوا اور فوراً امام صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کا طلب گار ہوا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے تم شرمندہ کیوں ہوتے ہو ہمارے مذہب میں تو پڑوسی کے اس سے بھی زیادہ حقوق ہیں۔ میرے عزیز میں نے صرف ان ارشادات اور احکام پر عمل کیا ہے جو پڑوسی کے بارے میں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دیے ہیں۔ ان احکام میں بڑے چھوٹے، کالے گورے یہانتک کہ مسلم و غیر مسلم کے درمیان بھی کوئی تفریق نہیں ہے۔ شریعت نے ہمسائیگی کے حقوق میں سب کو برابر کیا ہے۔ امام صاحبؒ یہ جملے ادا فرما رہے تھے اور امام صاحبؒ کے لب ہائے مبارک سے پھوٹنے والے نور کی شعاعیں یہودی پڑوسی کے تاریک قلب کو منور کر رہی تھیں۔ امام اعظم سیدنا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بات ختم کی تو جھک کر یہودی نے آپ کا دست مبارک چوما اور اس کی زبان پر کلمہ جاری تھا۔ امام صاحبؒ مجھے بھی اس چادر رحمت میں چھپا لو جس کی تعلیمات امن و دوستی اور محبت و ہمدردی کے جذبات پر مبنی ہیں میں نے کتابوں میں اسلام کی تعلیمات پڑھی تو تھیں لیکن آج اس کا عملی نمونہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

عیب جوئی کی مذمت

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور نہایت بلند آواز سے فرمایا اے وہ لوگو! جو اپنی زبان سے ایمان لائے اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں پوری طرح اترا نہیں ہے مسلمانوں کو تکلیف نہ دیا کرو نہ ان کو کسی بات پر عار دلاؤ نہ ان کے عیوب کو تلاش کرتے پھرو یاد رکھو کہ جو لوگ اپنے مسلمان

بھائی کے عیب کے پیچھے پڑیں گے اللہ تعالیٰ ان کے عیوب کے پیچھے پڑجائے گا اور جس شخص کے عیب کے پیچھے اللہ پڑجائے گا اسے رسوا کرڈالے گا چاہے وہ اپنے گھر کے اندر بیٹھا ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منافقین کو یہ ایک سرزنش تھی جن کا شیوہ یہی تھا کہ دن رات مسلمانوں کے عیوب کو تلاش کرتے پھرتے تھے اور زمانہ جاہلیت میں اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی تھی تو اس غلطی کو بڑھا چڑھا کر لوگوں میں بیان کرتے تھے تاکہ مسلمان ایک دوسرے سے بدظن ہوں اور یہ بدظنی آگے بڑھ کر انتشار و تفرقے کا باعث بن جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ دوسروں کے عیوب کی جستجو کرنے والوں کے پیچھے اللہ تعالیٰ پڑجاتا ہے اور پھر اسے دنیا میں رسوا کرکے رہتا ہے۔ عیب اور کمزوری کس میں نہیں ہے۔ بے عیب ذات تو خدا کی ہے۔ دوسروں کی آنکھوں میں تنکا تلاش کرنے سے پہلے انسان کو چاہیے کہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنے کردار و ایمان کا جائزہ لے۔ شب معراج میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی جماعت کے پاس سے گزرے جن کے ناخن پیتل کے تھے اور وہ اپنے ناخنوں سے اپنے چہرے اور سینے کو نوچ رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ان کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں دوسروں کی غیبت کرتے تھے اور ان کی عزت و ناموس کو برباد کرنے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔

عزت و ذلت کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ جسے عزت دے دے اسے کوئی ذلیل نہیں کرسکتا اور جسے ذلیل کردے دنیا کی کوئی طاقت اسے عزت نہیں بخش سکتی۔ اسی عقیدے کو دل میں جمالینے کا نام توحید پرستی ہے۔

اتحاد اسلامی

ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرامؓ کا مجمع تھا میدان عرفات میں اس امت کے والی و وارث سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم آخری بار اپنی امت کو مخاطب فرما رہے تھے آپؐ نے سوال فرمایا لوگو! آج کون دن ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں صحابہ کرام کی عادت تھی کہ ایسے مواقع پر جاننے کے باوجود بوجہ ادب کے فوراً جواب نہیں دیتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا آج عرفہ کا دن نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں پھر آپؐ نے دریافت کیا۔ یہ کونسا مہینہ ہے؟ اور جب حسب عادت صحابہ نے کہا کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا یہ عزت والا مہینہ ذی الحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور حسب سابق جب لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ حرمت والا شہر مکہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا۔ جی ہاں۔ تب آپؐ نے ارشاد فرمایا لوگو!

اچھی طرح سن لو کہ اللہ نے مسلمان کی جان مال اور آبرو ایک دوسرے مسلمان کے لیے اسی طرح قابلِ احترام قرار دیا ہے جس طرح آج کا دن۔ یہ مہینہ اور یہ جگہ۔ لوگو! کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں۔ تب تین مرتبہ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ اے اللہ! تو گواہ ہو جا۔ اے اللہ تو گواہ ہو جا۔ اے اللہ تو گواہ ہو جا۔ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا۔ سنو! میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ مسلمان ہو کر تم آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

یہ ہے نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری پیغام جو آپ نے میدان عرفات میں آخری حج کے موقع پر اپنی امت کو دیا تھا۔

توبہ کی فضیلت

توبہ کے لغوی معنی لوٹنے کے ہیں۔ اگر ضمیر زندہ ہو اور ایمان کی چنگاری دل میں موجود ہو تو ایک نہ ایک دن انسان کے دل میں توبہ کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ غلام اپنے آقا سے اور بندہ اپنے مولا سے کتنے دن بھاگتا پھرے گا۔ گناہ سراسر تاریکی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی تاریکی۔ ایک دلدل ہے جس میں آدمی دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ اس دلدل سے نکلنے کا ایک اور صرف ایک راستہ ہے کہ بندہ توبہ کرے، لوٹے اپنے خالق و مالک کی طرف جو غفار و ستار ہے جو ارحم الراحمین ہے جو نہیں چاہتا کہ اس کا وہ بندہ جسے اس نے اپنے دست قدرت سے بنایا ہے دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنے۔ اسی لیے قرآن کریم میں بار بار ارشاد ہوا ایمان والو نافرمانی اور گناہ کی راہ چھوڑ کر سچے دل اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنے رب کی طرف رجوع کرو امید ہے کہ تمہارا رب تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے گا اور تمہیں جنت میں داخل کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جوانی میں توبہ کرنے والے شخص سے بڑھ کر اللہ کو کوئی شے محبوب نہیں۔ توبہ کی مثال چراغ راہ کی ہے۔ اللہ کی راہ میں توبہ سب سے پہلا قدم ہے۔ اس لیے توبہ میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کون جانتا ہے کہ اس کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ گناہ کی نجاست اپنی روح پر لپیٹے دنیا سے چلا جائے۔ اس لیے توبہ کی طرف سبقت کرنا ہی سب سے بڑی دانشمندی ہے۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ توبہ کی تین شرطیں ہیں: پہلی یہ کہ اپنے گناہوں پر ندامت، پشیمانی اور شرمندگی کا اظہار کرے دوسری یہ کہ گناہ کو فوراً ترک کر دے اور تیسری شرط یہ ہے کہ دوبارہ گناہ کی طرف نہ لوٹنے کا پکا ارادہ کر کے خود کو اپنے رب کے حوالے کر دے۔ اسی سے توفیق بھی مانگے۔ نفس کی غلط خواہشات طمع اور لالچ سے وہی بچا سکتا ہے۔ توفیق مانگو کہ وہ مانگنے والوں کو محروم نہیں کرتا۔ ہم کیا

اور ہمارا ارادہ کیا سب کچھ اسی کی توفیق اور ارادت سے ہوتا ہے۔ البتہ اس کا یہ وعدہ ہے کہ اگر تم میرے راستے میں چلنے کا ارادہ کرو گے تو ہم تمہیں اپنی راہ ضرور دکھائیں گے اور تم جانتے ہو کہ اللہ تعالےٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

گویائی کی نعمت کا استعمال

اس دن عبداللہ بن عامرؓ کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ آخر رونق کیوں نہ ہوتی؟ ان کے مکان کے صحن میں آج مجسم چاند اتر آیا تھا ایسا چاند جو کبھی گہنا سکتا تھا نہ کجلا سکتا تھا۔ یعنی سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس عبداللہ بن عامرؓ کے آنگن میں تشریف فرما تھے۔ گھر کے بڑے بوڑھے مرد و زن بالکل اس طرح آپ کو گھیرے بیٹھے تھے جیسے چاند کے گرد ہالہ ہو۔ عبداللہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ میں اس وقت چار پانچ سال کا بچہ تھا۔ صحن میں دوڑتا پھرتا تھا۔ کہ میری ماں نے مجھے یہ کہہ کر بلایا۔ عبداللہ یہاں میرے پاس آئیں تجھے ایک چیز دوں گی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً میری والدہ سے دریافت فرمایا "تم اسے کیا دینا چاہتی ہو"؟ والدہ نے عرض کیا "حضور! میں اسے کھجور دینا چاہتی ہوں" آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "ٹھیک ہے۔ البتہ اگر تو اسے کچھ دینے کے لیے بلاتی اور اسے کچھ نہ دیتی تو تیرے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا"۔ غرضیکہ یہ جائز نہیں کہ جھوٹ موٹ بھی بچے کو کچھ دینے کے بہانے سے بلایا جائے اور اسے نہ دیا جائے اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جھوٹ بولنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ نہ تو سنجیدگی کے ساتھ نہ ہی مذاق کے طور پر اور یہ بھی جائز نہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بچے سے کسی چیز کے دینے کا وعدہ کرے اور پھر وہ وعدہ پورا نہ کرے۔ ابوداؤد شریف میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے

بھی مناظرہ بازی سے پرہیز کرتے ہیں اس کے لیے جنت کے گوشوں میں ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں اور جو جھوٹ نہ بولے اگرچہ ہنسی مذاق ہی کے طور پر کیوں نہ ہو میں اس کے لیے جنت میں ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں اور جو اپنے اخلاق کو بہتر بنالے تو میں اس کے لیے جنت کے سب سے اونچے درجے میں ایک گھر کا ذمہ لیتا ہوں۔

قوت گویائی اور زبان بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک عظیم نعمت ہے اور اس انعام پر شکریہ ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ اس زبان کو حق بات کہنے اور نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے منع کرنے ہی میں استعمال کیا جائے۔

ہماری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مسلسل ریکارڈ ہو رہا ہے۔ حشر کے میدان میں جس دن کوئی کسی کا والی و وارث نہ ہوگا اسی زبان کی وجہ سے انسان کی گرفت ہوگی۔

سلام - قیمتی ہدیہ

اشعث ابن قیس اور جریر ابن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہما جب قلعے میں جو مدائن کے علاقے میں واقع تھا حضرت سلمان فارسیؓ سے ملنے آئے تو جناب سلمانؓ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ دونوں نے پوچھا کہ آپ ہی سلمان فارسیؓ ہیں انہوں نے فرمایا۔ "جی ہاں" انہوں نے دریافت کیا "کیا آپ حضورؐ کے ساتھی ہیں"؟ حضرت سلمانؓ نے کہا "میں نہیں جانتا بے شک میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپؐ کی صحبت اختیار کی ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آپؐ کا ساتھی ہوں۔ کیونکہ آپؐ کا ساتھی تو وہ ہے جو آپؐ کے ساتھ جنت میں داخل ہوا اور میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد میرا حشر کیا ہوگا"۔ اشعث ابن قیسؓ اور جریر ابن عبداللہؓ نے کہا کہ ہم دونوں آپ کی خدمت میں آپ کے اس بھائی کے

پاس سے آئے ہیں جو ملک شام میں ہیں اور ان کا نام حضرت ابوالدرداؓ ہے فوراً ہی سلمان فارسیؓ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ انہوں نے فرمایا۔ "مگر میرے دوست کا وہ ہدیہ کہاں ہے جو تم دونوں کو دے کر انہوں نے میرے پاس بھیجا ہے؟" ان دونوں حضرات نے کہا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کوئی ہدیہ نہیں بھیجا ہے حضرت سلمان فارسیؓ نے فرمایا، "دوستو! خدا سے ڈرو اور امانت میں خیانت نہ کرو بارہا بہت سے آدمی ابوالدرداؓ کے بھیجے ہوئے میرے پاس آئے ہیں مگر آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کوئی آدمی بغیر ہدیے کے میرے پاس آیا ہو۔

دونوں حضرات نے عرض کیا" حضور ہم آپ سے سچ کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی ہدیہ آپ کی طرف نہیں بھیجا البتہ اگر آپ کوئی مال و اسباب چاہتے ہیں تو ہمارا مال حاضر ہے آپ حکم دیں ہم آپ کی خدمت میں پیش کر دیں گے۔" سلمان فارسیؓ نے فرمایا "مجھے تمہارے مال کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہ تمہارے اسباب کی مجھے تو وہ ہدیہ چاہیے جو میرے دوست ابوالدرداؓ نے تمہاری معرفت ہمیں بھیجا" دونوں حضرات نے عرض کیا خدا کی قسم انہوں نے ہمارے ساتھ کچھ نہیں بھیجا ہے۔ البتہ چلتے، وقت انہوں نے ہم سے یہ کہا تھا کہ مدائن جانا تو سلمانؓ سے ضرور ملنا اور میرا ان سے سلام کہنا" جناب سلمانؓ نے فرمایا کہ "میرے دوستو! بس اتنی دیر سے تم سے اسی ہدیہ کا تو مطالبہ کر رہا تھا۔ سلام سے بڑھ کر اور کیا ہدیہ ہو گا۔"

جذبۂ ایثار

ابوالحسن انطاکیؒ کی خانقاہ میں رات کے وقت پینتیس کے قریب درویش آ گئے۔ خانقاہ میں صرف دو تین روٹیاں تھیں اور مہمان تھے پینتیس۔ مگر یہ مہمان

عام مہمانوں کی طرح نہیں تھے انہوں نے فقر و درویشی کی منزلیں طے کی ہوئی تھیں قرآن کریم نے انہیں بتایا تھا کہ مومن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے خود آرام اٹھانے کے بجائے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کا مسلمان بھائی آرام اٹھائے۔ یہی ایثار اور بے نفسی تھی جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سیرت کی تعمیر کی تھی میدان جنگ میں بھی وہ آخری وقت میں پیاسے مرجانا گوارا کر لیتے تھے مگر یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ کسی طرف سے العطش العطش کی آواز آرہی ہو اور وہ ہونٹوں سے لگے ہوئے مشکیزے سے پانی پی لے۔ طریقت کی حقیقت ہی یہی ہے کہ وہ انسان کے کردار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ڈھانچے میں ڈھال دے۔ ہوا میں اڑنا اور پانی پر چلنا تو مکھی اور مچھلی کو بھی آتا ہے اصل کمال تو یہ ہے کہ آدمی انسان بن جائے اس کے دل میں دوسروں کے لیے قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو وہ مونس و غم خوار اور دلِ درد مند رکھتا ہو۔ آنے والے پینتیس درویش رسمی درویش نہیں تھے بلکہ انہوں نے کاملوں کی صحبت اختیار کی تھی اور ابوالحسن انطاکی رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ رات کا وقت تھا خانقاہ کے خادموں کو حکم دیا دسترخوان بچھا دیا جائے اور اس کے گرد پینتیس درویش بیٹھ گئے خادموں نے موجود تین روٹیاں توڑ دیں تازہ روٹیاں پکائی نہیں جا سکتی تھیں اس لیے کہ خانقاہ میں آٹا بھی موجود نہیں تھا۔

خادموں نے چراغ بجھا دیا اور درویشوں سے کہہ دیا گیا کہ بسم اللہ کریں۔ یہ آواز تو ملتی رہی کہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب چراغ جلائے گئے تو حضرت ابوالحسن انطاکی رحمۃ اللہ علیہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ روٹیاں اسی طرح دسترخوان پر موجود ہیں اور کسی نے کچھ نہیں کھایا شاید اس لیے کہ میں بھوکا رہ جاؤں اور میرا ساتھی سیر ہو کر کھا لے۔ جذبہ مشترک تھا ہر آدمی خود کو بھوکا رکھ کر اپنے اپنے بھائی کو کھلانا چاہ رہا تھا اور سب بھوکے رہ گئے۔ قربان جائیے اس بھوک

کے جس کے پس منظر میں ایسا ایثار اور ایسی حسین آرزو ہو۔ جانے والے چلے گئے آج وہ درویش ہیں نہ وہ ابوالحسن انطاکیؒ کی خانقاہ۔ البتہ ان درویشوں کی سیرت کے نقوش آج بھی تصوف کی تاریخ پر مرتسم ہیں۔

حقوقِ والدین

اسماءؓ اپنے گھر میں مصروف تھیں۔ مدینہ آنے کے بعد چند دنوں تک تو کافی تنگی رہی لیکن اب اللہ کا فضل تھا گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ روپیہ پیسہ، نوکر چاکر، بال بچے کیا نہیں تھا لیکن اسماءؓ کا دل کبھی کبھی سناٹی راتوں میں ہلکی سی کسک ضرور محسوس کرتا۔ کاش اس کی والدہ قتیلہ بنت العزیٰ بھی سوتیلی والدہ اُمِ رومانؓ والد جناب ابوبکرؓ اور شوہر زبیر بن العوامؓ کی طرح مسلمان ہو جاتی تو یہ گھر نور والوں کا گھر ہوتا۔ اب تو معاشی تنگی بھی نہیں۔ سب مل جل کر رہتے ہنسی خوشی کے دن گزارتے مگر افسوس کہ اسماءؓ کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور قتیلہ نے اسلام قبول نہیں کیا۔ دوپہر کے وقت لونڈی نے اطلاع دی کہ ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہے۔ سیدہ اسماءؓ نے فرمایا، اندر بلا لو اور جب وہ مہمان خاتون گھر میں داخل ہوئیں تو ایسا لگا جیسے گھر میں زلزلہ آگیا ہو کیونکہ آنے والی قتیلہ بنت عزیٰ تھی۔ اسماءؓ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ جی میں آیا کہ دوڑ کر ماں سے لپٹ جائے لیکن اسماءؓ نے جب ماں کے چہرے پر غور کیا تو ان کی باطنی بصیرت نے بتا دیا کہ ماں کے چہرے پر ایمان کا نور نہیں ہے اور وہ ابھی تک کفر و شرک کی آلائش میں ملوث ہے۔ خدا اور رسولؐ کی محبت نے دل تھام لیا ماں کی محبت اپنی طرف کھینچتی اور دین کی محبت اپنی طرف۔ اسماءؓ اس کشاکش میں گرفتار مبہوت ہو گئی لیکن آخرکار دین کی محبت غالب آگئی ماں سے گلے نہیں ملی مگر انہیں بیٹھنے کے لیے ضرور کہا۔ قتیلہ بنت عزیٰ نے کہا میری بیٹی! میں تم سے کچھ مانگنے آئی ہوں کیا تم مجھے کچھ رقم

دے سکتی ہو؟ اسماءؓ نے جواب دیا ضرور دے سکتی ہوں مگر آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ یہ کہا اور ماں کو بٹھا کر چلی گئیں۔ کدھر؟ اسی ذات کی طرف جو اسماءؓ ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام کا مرکز نگاہ تھا جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر لوگ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ دربار نبوت میں حاضر ہوئیں۔ سرکار سے حالات بتائے اور اجازت طلب کی ذرا آپ اجازت دیں تو میں اپنی مشفق ماں کی مالی امداد کر دوں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں تم ان کی مدد کر سکتی ہو۔ کیونکہ وہ کچھ بھی ہیں تمہاری ماں تو ہیں۔ واپس آکر اسماءؓ نے مطلوبہ رقم والدہ کو دے دی۔ والدہ رقم لے کر چلی گئی۔ چوکھٹ تھامے دیر تک اسماءؓ والدہ کو جاتے ہوئے دیکھتی رہیں پھر فرمایا اماں جان! کاش تم حق کو پہچان لیتیں اور پھوٹ پھوٹ کر لگیں۔ مگر واہ رے اسماءؓ رقم دے دی لیکن مشرک میں آلودہ ماں کو گلے نہ لگایا۔

اتحادات

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم المرسلینؐ بنا کر پورے عالم انسانیت کی طرف مبعوث فرمایا اور قرآن کریم میں واضح الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ اب نہ کوئی نیا دین آئے گا نہ نیا رسول یا نبی کیونکہ نبوت نے جناب آدمؑ سے جس سفر کا آغاز کیا تھا وہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو گیا۔ انسانیت کی مادی اور روحانی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود کا قیامت تک کے لئے ایک ہی نسخہ کیمیا ہے اللہ کی کتاب اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت یہی وہ دین ہے جو انسانیت کے مختلف بکھرے ہوئے طبقات کو توحید کی لڑی میں پرو کر ایک ایسا شعور بخشتا ہے جس کی بنیاد اخوت، مساوات اور ہمدردی پر ہے۔ اس دین نے کالے گورے، عجمی عربی، امیر غریب، اونچ نیچ، ذات پات، علاقائیت، نسل پرستی، زبان و بیان کے تمام اختلافات کو مٹا کر ایک ایسا کنبہ تشکیل دیا جس کے سارے افراد تمام تر اختلافات

کے باوجود ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے شانہ سے شانہ ملا کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ایک ہی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ایک ہی کتاب ایک ہی رسولؐ اور ایک ہی خدا کے بندے ہیں۔ اسی وحدت میں اس امت کی طاقت کا راز مضمر ہے جب تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے اس امت کی وحدت اور باہمی اتحاد و اخوت کی حفاظت فرمائی لیکن آپ کے خلفائے راشدین کے بعد تفرقہ بازی اور دھڑے بندی کے ایسے ایسے جھگڑے چلے کہ امت فرقوں اور طبقوں میں بٹ گئی امت بٹ گئی تو سمجھ لیجئے کہ اس کی قوت بٹ گئی اور پھر اس کی تقدیر کا آبگینہ چور چور ہو گیا۔ چنانچہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو اس دنیا کے ہر گوشے میں مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا ہے اور اکثر علاقوں میں مسلمان کا خون مسلمان کے ہاتھوں۔ کہاں ہے وحدت امت کا وہ نبوی تصور؟ اور کہاں گئی وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار جسے احد کی جنگ میں اپنے دندان مبارک شہید کرا کر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر کیا تھا؟

پردہ پوشی

حضرت سعید ابن مسیبؓ کے شاگرد ابن حرملہ اپنے دروازے پر کھڑے تھے کہ دیکھا کہ گلی میں ایک شخص جھومتا جھومتا لڑکھڑاتا ہوا گزر رہا ہے۔ اس کے قریب گئے تو پتہ چلا کہ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہے ابن حرملہ نے اس کا بازو تھاما اپنے کمرے میں لائے اور دروازہ بند کر دیا تھوڑی دیر کے بعد ابن حرملہ حضرت سعید ابن مسیبؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اس واقعہ کا تذکرہ کر کے ان سے پوچھا کہ اس آدمی کا کیا کرنا چاہیئے؟ سعید ابن مسیبؓ گو کہ احکام خداوندی کو جاری کرنے کے

معاملے میں بہت سخت تھے لیکن انہیں یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ کسی مسلمان کی پردہ دری کی جائے اس لئے انہوں نے ابن حرملہ کو مشورہ دیا کہ اگر تم اس شرابی کو اپنے گھر میں چھپا سکتے ہو تو چھپائے رکھو ابن حرملہ واپس آئے تو شرابی ہوش میں آچکا تھا جونہی اس کی نظر ابن حرملہ پر پڑی شرم سے پانی پانی ہوگیا زبان کو تالے لگ گئے اور ندامت سے سر جھکا کر ابن حرملہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ابن حرملہ نے کہا کہ میرے بھائی تجھے شرم نہیں آتی اگر تو صبح نشہ کی حالت میں گرفتار ہو جاتا تو تجھ پر حد جاری ہو جاتی اور انتہائی رسوائی ہوتی۔ تو ہمیشہ کے لئے مردود الشہادت ہو جاتا یعنی ساری زندگی تیری شہادت قبول نہیں ہوتی بلکہ اگر یہ کہوں کہ تو زندہ رہتے ہوئے مر جاتا تو غلط نہ ہوگا۔ تو غور تو کر کہ وقتی سکون کے لئے جس جرم کا تو نے ارتکاب کیا تھا وہ تیری ساری زندگی کو برباد کر دیتا۔ میں نے تجھے اسی لئے چھپا لیا تھا کہ تیری پردہ دری نہ ہو۔ اور تیری بنی بنائی عزت خاک میں نہ مل جائے۔ ابن حرملہ کے یہ الفاظ نشتر بن کر شرابی کے دل و دماغ پر گر رہے تھے وہ کانپ اٹھا اور روتے ہوئے اس نے کہا کہ آج میں تمہیں گواہ بنا کر خدا سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

اور ایک پاکباز انسان کی طرح زندگی گزاروں گا۔ تم نے میری پردہ پوشی کی ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہاری پردہ پوشی کرے گا۔ مسلمان مسلمان کے لئے آئینہ ہوتا ہے جو اس کے چہرے کا داغ تو اس کو دکھا دیتا ہے لیکن کسی کے چہرے کا داغ دوسرے کو نہیں دکھاتا۔ جو آدمی کسی کی پردہ دری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کا بھی پردہ فاش کر دیتا ہے۔

حرام خوری کا نتیجہ

چند مروانی امیر خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے مہمان بنے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑی پرتکلف دعوت ہوگی اور ان کی ضیافت کے لئے خاص اہتمام کیا جائے

گا۔ اور خلیفہ نے اہتمام بھی کیا۔ باورچی کو قسم قسم کے کھانے پکانے کا حکم دینے کے بعد خلیفہ نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا کہ کھانے ذرا تاخیر سے تیار کرنا۔ مہمان دسترخوان پر آکر بیٹھ گئے مگر دسترخوان خالی تھا مہمان کافی دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن کھانا نہیں آیا۔ یہاں تک کہ مہمانوں کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھنے لگی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جب بھی باورچی سے کھانا لانے کو کہتے تو وہ جواب دیتا کہ حضور تھوڑی سی تاخیر ہے۔ یہاں تک کہ مہمان بھوک سے نڈھال اور بے حال ہو گئے۔ تب خلیفہ نے کہا کہ اے بھائی اگر کھانا تیار ہونے میں دیر ہے تو جو کچھ موجود ہے لے آؤ۔ اس تے لاکر کھجور اور ستو دسترخوان پر رکھ دیئے۔ مہمان بھوک سے نڈھال تھے ہی کھجور اور ستو پر ٹوٹ پڑے اور جلدی جلدی اپنا پیٹ بھر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انواع و اقسام کے کھانے تیار ہو گئے اور دسترخوان پر سجا دیئے گئے خلیفہ نے مہمانوں سے کہا کہ تشریف لائیں اور ماحضر تناول فرمائیں۔ مہمانوں نے معذرت کی اور کہا کہ جناب ہم سیر ہو چکے ہیں۔ اب قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ خلیفہ نے اصرار کیا۔ کہ میں نے اتنے اہتمام سے آپ حضرات کے لئے قسم قسم کے کھانے پکوائے ہیں کچھ تو کھا لیجئے مہمانوں نے دوبارہ معذرت کی اور کہا کہ امیر المومنین اگر ذرا بھی گنجائش ہوتی تو ہم ضرور کھا لیتے مگر آپ یقین کریں کہ اب بالکل خواہش نہیں ہے ہمارا پیٹ بھر چکا ہے۔ خلیفہ نے فرمایا، خدا کے بندو کاش تم یہی رویہ اپنی پوری زندگی میں اختیار کرتے پھر تم یہ بتاؤ کہ بنو ہاشم کی جائیدادیں غصب کر کے ناجائز اور حرام کھانے کے لیے تم اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو۔ اور اپنے پیٹ میں غذا کی بجائے آگ کیوں بھرتے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ لقمہ حرام نسلوں کو تباہ کر دیتا ہے ظلم اور جبر سے حاصل کی ہوئی دولت تمہاری آخرت تو آخرت دنیا کو بھی تباہ کر دے گی۔ تمہاری اولادیں جن کے لیے تم یہ سب کچھ کر رہے ہو نافرمان ہو جائیں گی اور تمہیں ایک لمحے کا بھی سکون میسر نہ آئے گا۔

مزید براں قبر کی تاریکی اور تنہائی۔ تمہاری یہ اولاد تمہارے کام نہ آئے گی عیاشیاں

تمہاری اولاد کرے گی اور حساب تمہیں دینا ہوگا۔ دوسروں کے لیے خود کو جہنم کا کندہ بنانا کہاں کی عقلمندی ہے۔

والدہ کے حقوق

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر بڑھیا زار و قطار رونے لگی اور صحابہ کرام حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ اس قسم کا فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں کیا تھا کہ ایک لب جان آدمی کو لکڑیوں کے جلتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا جائے۔ بڑھیا یہ معاملہ لے کر حاضر ہوئی تھی کہ میرا بیٹا عرصے سے بیمار تھا ادھر تین دنوں سے اس پر نزع کی کیفیت طاری ہے۔ دم نہ نکلتا ہے نہ واپس آتا ہے۔ کلمہ شہادت بھی نہیں پڑھ پا رہا ہے آپ دعا فرماویں کہ آخر وقت میں اسے کلمہ نصیب ہو جائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تیرا شوہر زندہ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ تب آپ نے پوچھا تیرا بیٹا باپ کے مرنے کے بعد تیری کفالت کرتا تھا یا نہیں اس نے کہا "جی ہاں" کرتا تھا آپ نے پھر دریافت فرمایا، اچھا یہ تو بتا! کہ اس کا برتاؤ تیرے ساتھ کیسا تھا؟ اس نے عرض کیا حضور! ہر اعتبار سے اس کا برتاؤ اچھا ہی تھا مگر... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا مگر کیا؟ بڑھیا نے عرض کیا حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم بات صرف اتنی ہے کہ جب میں اس سے کوئی بات کہتی تھی اور میری بات کے برخلاف اس کی بیوی کوئی بات کہتی تھی تو وہ بیوی کی بات مان لیتا تھا۔ اور میری بات کو رد کر دیتا تھا اس کے اس عمل سے میرے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ حضور صلی اللہ وعلیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا، بی بی کان کھول کر سن لے کہ تیرے دل کو دکھانے کی وجہ سے تیرے بیٹے کا ہرگز ہرگز ایمان پر خاتمہ نہیں ہو سکتا میں نے اسی لیے آگ کا الاؤ تیار کرایا ہے کہ جہنم کی آگ سے ہلکی آگ میں تیرے بیٹے کو جھونک دیا جائے صرف اسی صورت میں اس کا ایمان پر

خاتمہ ہو سکتا ہے۔ بڑھیا روتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اور کانپ کانپ کر کہنے لگی۔ حضورؐ میں نے اسے معاف کیا بصدق دل سے معاف کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو بھیجا کہ دیکھ کر آؤ اس کے بیٹے کا کیا حال ہے سیدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھوڑی ہی دیر میں واپس آئے اور عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ تو زور زور سے کلمہ پڑھ رہا ہے اور اس کے کلمہ پڑھنے کی آواز گلی میں سنائی دے رہی ہے۔ جانے والا ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا لیکن ماں کی عظمت کا درس دے گیا۔

مدینہ منوّرہ کا ایک عاشق بچّہ

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب سعودیہ عرب میں آج کی طرح دولت کی ریل پیل نہ تھی اور اس ملک کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر حج کے موقع پر آنے والے حاجیوں سے ہونے والی آمدنی پر تھا آبادی بہت غریب تھی اور بڑی مشکل سے گزارہ ہوتا تھا مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں اس زمانے میں حج کے بعد مدینہ منورہ گیا۔ ہم لوگوں نے کھانا کھانے کے بعد دسترخوان کو لے کر ایک ڈھیر پر جھاڑ دیا تاکہ روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں اور ہڈیوں کو جانور کھا جائیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں اپنے کمرے سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، کہ ایک خوبصورت آٹھ نو سال کا بچہ ان ٹکڑوں کو چن چن کر کھا رہا ہے مجھے سخت افسوس ہوا بچے کو ساتھ لے کر قیام گاہ میں آیا اور اسے پیٹ بھر کے کھانا کھلایا، کیونکہ میں ایسی ہستی کے شہر میں تھا جو غریبوں کا والی اور غلاموں کا مولا تھا۔ میرے اس برتاؤ کو دیکھ کر بچہ بے حد متاثر ہوا میں نے چلتے وقت اس سے کہا کہ بیٹے تمہارے والد کیا کرتے ہیں اس نے کہا میں یتیم ہوں۔

میں نے کہا، بیٹے! تم میرے ساتھ ہندوستان چلو گے؟ وہاں میں تم کو اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا عمدہ عمدہ کپڑے پہناؤں گا۔ اپنے مدرسے میں تمہیں تعلیم دوں گا جب تم عالم فاضل ہو جاؤ گے تو میں خود تم کو یہاں لے کر آؤں گا اور تمہیں تمہاری والدہ کے سپرد کر دوں گا۔ تم جاؤ اپنی والدہ سے اجازت لے کر آؤ" لڑکا بہت خوش ہوا اور اچھلتا کودتا اپنی والدہ کے پاس گیا۔ وہ بیچاری بیوہ دوسرے بچوں کے اخراجات سے پہلے ہی پریشان تھی اس نے فوراً اجازت دے دی۔

بچہ فوراً آیا اور مولانا کو بتایا کہ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا میری ماں نے اجازت دے دی ہے پھر پوچھنے لگا کہ آپ کے شہر میں یہ چھوٹے ملتے ہیں جو یہاں ملتے ہیں مولانا عثمانی نے بتایا بیٹے! یہ ساری چیزیں وافر مقدار میں تمہیں ملیں گی مولانا کا بیان ہے کہ میری انگلی پکڑے پکڑے مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ میرے ساتھ آیا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا سرکارؐ کے روضے کو دیکھا اور مسجد کے دروازے کو اور دریافت کیا بابا! یہ دروازہ اور یہ روضہ بھی وہاں ملے گا؟

میں نے اس سے کہا کہ بیٹا اگر یہ وہاں مل جاتا تو میں یہاں کیوں آتا؟ لڑکے کے چہرے کا رنگ بدل گیا میری انگلی چھوڑ دی بابا! تم جاؤ اگر یہ نہیں ملے گا تو میں ہرگز ہرگز اس دروازے کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا بھوکا رہوں گا پیاسا رہوں گا اس دروازے کو دیکھ کر میں اپنی بھوک اور پیاس اس طرح بجھاتا رہوں گا جس طرح آج تک بجھاتا رہا ہوں یہ کہہ کر بچہ رونے لگا اور اس کے عشق کو دیکھ کر میں بھی رونے لگا۔

دینی موضوعات پر نشری تقاریر

جلد دوم

مولانا محمد متین ہاشمی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور